قال اللہ تعالیٰ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن

مصداق آیت بالا

سائنس جدید کے زہریلے تاثرات سے بچانیوالا، علمی شبہات کا

جواب بتانے والا، نہایت مفید رسالہ مسمّی بہ

اشرف الجواب لشفاء المرتاب

از افادات حضرت حکیم الامۃ سراج الملت جناب مولانا مولوی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدت فیوضہم

جسکو جناب منشی علی محمد صاحب لاہوری نے حضرت دام ظلہ کے مواعظ و ملفوظات سے منتخب فرمایا

اور باہتمام احقر ظہور الحسن غفرلہ

ناظم کتبخانہ امداد الغرباء سہارنپور رحیمیہ خواجہ برقی پریس جامع مسجد دہلی میں طبع ہوا

چند نہایت مفید اور نئی کتابیں بقیمت رعایتی

ارواح ثلثہ

جس میں رسالہ امیر الروایات۔ وروایات الطیب۔ واشرف التنبیہ سے ہر ہر بزرگ کی تمام حکایات کو لیکر جدا جدا جمع کر دیا ہے نیز تذکرۃ الرشید اور تذکرۃ الخلیل سے بھی حکایات کو لے کر اس رسالہ کا بطور اضافہ جزو بنا دیا ہے۔ آب یہ مجموعہ جسمیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی قدس اللہ سرہ سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے ۶۰ بزرگوں کی حکایات ہیں شیدایان بزرگان خاندان "ولی اللّٰہی" کے لئے عجیب چیز ہوگئی ہے آخر میں حضرت خواجہ صاحب "مجذوب" اور دوسرے اہل دل حضرات کا منظوم کلام ہے اصلی قیمت ۱۲؎ رعایتی عہ

تکمیل العرفان فی تسہیل حفظ الایمان

مع تغییر العنوان وبسط البنان۔ اس میں مسئلہ علم غیب اور سجدۂ تعظیمی کے متعلق عجیب تحقیق ہے اسکی عبارات پر معاندین نے جو واہیات اعتراضات کئے ہیں ان کا مدلل جواب ہے۔ اسم تبہ مولانا اسعد اللہ صاحب نے اصل رسالہ کی بہت عمدہ اور سلیس تسہیل کرتے ہوئے علم غیب کے مسئلہ کو قرآن مجید کی آیات کثیرہ سے مدلل کیا ہے۔ اصل قیمت ۴ہر رعایتی ۲؍ر محصولڈاک ؎ر

نفیر غیب ملقب بہ تفریح بہشتیاں

رسالہ ہذا میں دوازدہ تسبیح کے ہر چہار اذکار کے وزن پر حضرت خواجہ صاحب "مجذوب" نے نہایت پُرتاثیر اور شوق انگیز اشعار تصنیف فرمائے ہیں۔ طالبین وذاکرین کے علاوہ عوام الناس کیلئے بھی باعث ترغیب وتحریص ہے۔ رعایتی قیمت چکنا وسرخ کاغذ ۱؍ر سفید چکنا کاغذ ۱؍ر

ملنے کا پتہ

ظہور الحسن مالک کتب خانہ امداد الغرباء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد الحمد و الصلوٰۃ حقیر ناچیز سراپا تقصیر علی محمد مظہر مدعا ہے کہ یہ امر بفضلہ تعالیٰ محتاج دلیل نہیں رہا کہ حضرت اقدس سیدنا و مرشدنا و قطب العارفین ظل اللہ علی العالمین حکیم الامت مجدد الملت شیخ المشائخ اشرف العلما تاج الکبرا جامع الشریعت و الطریقت واقف اسرار الحقیقت الحافظ الحاج القاری مولانا و مقتدانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام فیوضہم منجانب اللہ اس چودھویں صدی میں حضور سرور کائنات فخر موجودات رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے وارث اور مجدد ہونے کی حیثیت سے جو خدمت دین انجام دے رہے ہیں بالکل روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے۔ حضرت والا کی تصانیف اس کا بین ثبوت ہیں۔

تزکیۂ نفس اور تعلیم طریق کیلئے وہ خداداد ملکہ اور دست شفا حاصل ہے کہ عام طور پر سلیم قلوب میں آپ کے لئے حکیم الامت کا لقب القا فرما دیا گیا ہے۔ بحمد اللہ دین کا کوئی جزو ایسا نہیں رہا کہ جس کی کافی و وافی تفصیل اور تشریح حضرت نے نہ فرما دی ہو دین کے راستہ کو بحمد اللہ ایسا بے غبار و واضح فرما دیا ہے کہ طالب حق کو کوئی وجہ خفا باقی نہیں رہی رسوم و بدعات نے جو حقائق پر پردہ ڈال رکھا تھا اس کو اٹھا کر دین کو اسکی اصلی صورت میں جلوہ گر فرما دیا ہے حضرت والا کی شان مجددیت کیلئے آپ کی تصانیف کو اور خصوصاً آپ کی مصنفہ کتاب "اصلاح القلوب" کو ہی دلیل میں پیش کر دینا کافی و وافی ہے۔

مزید براں جو فیض حضرت ممدوح کے مواعظ سے عام امت کو پہنچ رہا ہے محتاج بیان نہیں یہ مواعظ حضرت والا کے فیض کا ایک کرشمہ ہیں اور حضور کی کھلی کرامت ہیں۔ علوم و معارف کی بوچھار جس قدر دوران وعظ میں ہوتی ہے اس کو وہ حضرات جو وعظ میں ایک دفعہ بھی شریک ہوئے ہیں بخوبی جانتے ہیں اور جن کو شرکت کا اتفاق نہیں ہوا مطبوعہ مواعظ کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔

مواعظ کیا ہیں بیش بہا جواہرات کا خزینہ ہیں سالکین کیلئے عمدہ سفینہ ہیں شریعت کی روح اور طریقت کی جان ہیں۔ اہل زبان عش عش کر کے رہ جاتے ہیں مضامین ایسے کہ علما متحیر رہ جاتے ہیں کہ یہ مضامین کہاں سے آتے ہیں۔ عوام الگ محظوظ ہوتے ہیں صوفی منش الگ جھومتے ہیں اور واہ واہ کو ورد زبان بناتے ہیں شکوک و اوہام کو باحسن وجوہ حل فرماتے ہیں۔ نئی روشنی کے دلدادہ اپنے خیالات فاسدہ کی تردید سن کر اوہام باطلہ سے تائب ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات و احادیث شریف میں باہم جہاں تعارض معلوم ہوتا ہے اسکو باحسن وجوہ حل فرماتے ہیں اور عجیب عجیب نکات و لطائف معرض ظہور میں آتے ہیں

علوم ظاہری ومسائل فقہیہ کو بھی عجیب انداز سے ارشاد فرماتے ہیں۔ باطنی مسائل اور جہلاء صوفیہ کے اغلاط طشت ازبام فرماتے ہیں تاکہ عوام راہ پاکر جہلاء صوفیہ کے جال سے نجات پاویں۔ کفار کے اعتراضات کے جوابات ایسے طرز سے ارشاد فرماتے ہیں کہ دوبارہ اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

خوش نصیبی سے اس حقیر ناچیز کو دربار اشرفی سے بواسطہ حضرت سیدی وسندی ومرشدی و وسیلتی یومی وغدی خلیفہ اعلےٰ وارشد حضرت مولانا ظفر احمد صاحب دام فیوضہم وابستگی حاصل ہے۔ حضرت حکیم الامت دام مجدہم کے مواعظ کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا مواعظ کو بیحد نافع پایا چونکہ کل مواعظ کے خریدنے کیلئے زر کثیر اور اُنکے مطالعہ کیلئے مدت مدید درکار ہی اس لئے خیال کیا کہ اگر متذکرہ بالا مضامین کا مواعظ سے انتخاب ہوجائے تو غربا اور قلیل الفرصت بھی مواعظ سے فائدہ اُٹھانے سے محروم نہ رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انتخاب اصل مواعظ سے مستغنی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اصل اصل ہی ہے اور انتخاب انتخاب ہی ہی۔ تاہم غربا مواعظ کے مضامین سے بالکل محروم نہیں رہ سکیں۔

چنانچہ اپنے اس خیال کو حضرت مرشدی دام فیوضہم کی خدمت اقدس میں عرض کیا۔ گو یہ حقیر اپنی بے علمی کی وجہ سے اس اہم کام کا بالکل اہل نہیں تھا۔ لیکن محض توکلاً علی اللہ اور حضرت مرشدی کی توجہ اور دعا کے بھروسہ پر اس کام کو اپنے ذمہ لیلیا۔ اور درخواست دعائے تکمیل بھی کی چنانچہ حضرت کی دعا کی برکت سے مواعظ کے مندرجہ ذیل مضامین کا انتخاب کرچکا ہوں اور ان کی اشاعت اور بقیہ کی تکمیل دعا بارگاہ الٰہی سے کرتا ہوں۔ آمین۔

(۱) **اشرف المعمولات ملقب بہ الطف المعلومات**۔ بفضلہ تعالیٰ یہ رسالہ شائع ہوچکا ہی اسمیں مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب دام فیوضہم کے مذاق خاص کے متعلق مضامین ہیں یہ نام حضرت ممدوح دام فیوضہٗ صاحبِ مواعظ کا تجویز فرمودہ ہی۔

(۲) **اشرف البیان فی علوم الحدیث والقرآن**۔ اس مجموعہ میں آیات واحادیث میں باہم جہاں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے اور حضرت نے مواعظ میں باحسن وجوہ حل فرمایا ہی ان کو یکجا جمع کردیا ہے۔ یہ نام بھی حضرت والا ہی نے تجویز فرمایا ہی اور یہ رسالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہی

(۳) **اشرف المسائل من المواعظ والرسائل**۔ اس مجموعہ میں مواعظ سے مضامین تصوف کو انتخاب کرکے جمع کیا ہے۔ اس کا طرز بھی انفاس عیسیٰ اور الرفیق فی سواء الطریق سے جُداگانہ ہے یہ نام بھی حضرت والا ہی کا تجویز فرمایا ہوا ہی اور یہ مسودہ بھی غیر مطبوعہ ہی۔

(۴) ایک سلسلہ مضامین کے انتخاب کا وہ ہی جو آپ کے ہاتھوں میں ہی اس میں اعتراضات شکوک و

اوہام کا قلع قمع کیا گیا ہے پہلے خیال تھا کہ اسکو ایک ہی جلد میں ختم کیا جائے۔ مگر جب حجم بڑھتا ہوا دیکھا گیا تو مناسب خیال کیا کہ اسکو تین حصوں میں منقسم کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ اس کا حصہ سوم ہے جس میں ان اعتراضوں اور شبہات کو حل کیا ہے جو نو تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں جدید تعلیم کے اثر سے پیدا ہو کر زبان تک بھی آتے ہیں۔ ان شبہات کے عنوانات قائم کر کے اُنکے تحت میں مناسب جواب درج کر دیے ہیں۔ جہاں اس شبہ یا اعتراض کا کوئی دوسرا جواب کسی دوسرے وعظ میں حضرت نے فرمایا ہے تو اس کو بھی ساتھ ہی درج کر دیا ہے ایک جواب کو دوسرے جواب سے ممتاز کرنے کیلئے جواب نمبر ۱ یا جواب نمبر ۲ وغیرہ لکھدیا ہے اور جس وعظ سے وہ مضمون ماخوذ ہے اس کا نام اور صفحہ بھی لکھدیا ہے۔ عنوانات کے شمار کیلئے نمبر شمار لگا دیے ہیں کل ایک سو نو (۱۰۹) عنوانات ہیں اس کا نام حسب ارشاد مرشدی **اشرف الجواب لشفاء المرتاب** حصہ سوم رکھتا ہوں اس حصہ کے مضامین کو جن مواعظ سے انتخاب کیا گیا ہے ممکن ہے بعض ناظرین ان کا مطالعہ مستقل طور پر بھی کرنا چاہیں لہٰذا سہولت کیلئے ان مواعظ کی یکجائی فہرست درج ذیل کی جاتی ہے اور باقی دو حصوں کی فہرستیں ان حصوں کی تمہیدوں میں ملیں گی اس حصہ کی فہرست یہ ہے۔

تقویم الزیغ۔ ملفوظات ملحقہ دعوات عبدیت حصہ دوم۔ فضائل العلم والخشیہ۔ ترغیب الاضحیہ۔ ملفوظات ملحقہ دعوات عبدیت حصہ سوم۔ اصلاح النفس۔ ضرورۃ العلماء۔ نفی الحرج۔ العار الجائزۃ۔ نسیان النفس تعلیم البیان۔ مضار المعصیت۔ ملفوظات ملحقہ دعوات عبدیت حصہ پنجم تعظیم الشعائر۔ اطاعت الاحکام۔ ذکر الموت۔ شرط ایمان الصوم۔ الشکر۔ مظاہر الآمال۔ العفت۔ العزت۔ تفصیل الدین۔ وحدت الحب۔ شعب الایمان۔ الوقت۔ ملفوظات ملحقہ ہفت اختر۔ اتباع المنیب۔ الاسراف۔ الشذور فی حقوق۔ بدر البدور۔ تجارت آخرت۔ المرابطہ۔ العبرۃ بذبح البقرۃ۔ محاسن الاسلام۔ تقلیل الاختلاط مع الانام۔ الحدود والقیود مظاہر الاموال۔ السبر بالصبر۔ انسداد الفساد۔ روح الجوار۔ الشریعت۔ ایواء الیتامی۔ ترجیح الآخرۃ۔ الرفع والوضع۔ حرمات الحدود۔ الہدیٰ والمغفرۃ۔ ذم النسیان۔ الاسعاد والابعاد۔ الباطن۔ الظاہر۔ آثار العبادۃ اسرار العبادۃ۔ خیر الحیات وخیر الممات۔ شکر النعمہ بذکر رحمۃ الرحمہ۔ سبیل النجاح۔ ارضاء الحق حصہ دوم۔ غایۃ النجاح۔ اصلاح ذات البین۔ الاتفاق۔ العلم والخشیہ۔ الاکرمیت بالاعملیت والاعلمیت۔ اخوۃ۔ علاج الحرص کساد النساء۔ آثار المربع۔ الامتحان۔

اس کے حصہ اول میں کفار کے اعتراضات کے جوابات ہیں اور حصہ دوم میں عوام کی رسومات بد کا

ف ان میں سے اکثر مواعظ جناب مولوی شبیر علی صاحب دامت برکاتہم مالک مطبع اشرف المطابع تھانہ بھون ضلع مظفر نگر و مولوی ظہور الحسن ناظم کتبخانہ امداد الغرباء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے طلب فرمانے پر مل سکتے ہیں۔ احقر علی محمد۔

رد اور بدعات کی تردید - اور ان پر شبہات کا حل - عوام کی کثیر الوقوع اغلاط کی تردید اور ان کی طرز اصلاح بیان کی گئی ہے - یہ فہرست اسلئے عرض کیگئی تاکہ کوئی دوسرا برادر طریقت ان کو انتخاب کرنیکی محنت نہ اُٹھائے - اے ارحم الرحمین اس بندۂ عاصی کی اس ناتمام کی محنت کو قبول فرما اور اسکو ذریعۂ نجات بنا اور صاحب مواعظ اور حضرت مرشدی کے مدارج بلند فرما - آمین -

فہرست مضامین رسالہ اشرف الجواب لشفاء المرتاب حصہ سوم

تمت الفہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشرف الجواب لشفاء المرتاب

حصہ سوم

اس حصہ میں ان اعتراضات اور شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ جو نو تعلیم یافتہ جدید تعلیم کے اثر سے متاثر ہو کر کیا کرتے ہیں۔

(۱) آسمان کے عدم وجود پر کوئی دلیل صحیح قائم نہیں

اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں۔ ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں۔ تو دیکھو یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی۔ تو سائنس کی رو سے آسمان کا عدم قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ آجتک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم وجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے۔ یعنی آسمان کا وجود و عدم دونوں عقلاً برابر ہیں۔ اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی مخبر جو قطعاً صادق ہو۔ دیتا ہو۔ تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے۔ اور اُس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی۔ کہ آسمان موجود ہے۔ اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع پس نہ ضروری الوجود ہوا۔ نہ ضروری العدم تو عقل اسکے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جا سکتا ہے تو صرف اسقدر کہ ہمکو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا۔ اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا۔ اُس وقت تک بھی

ہم یوں نہیں کہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہمکو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ اور یہ ہم کو مضر نہیں۔ کیونکہ ہم تقریر سابق سے ان کو وجود آسمان تسلیم کرادیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اہلِ یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ فلاسفۂ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں۔ جیسا کہ اہلِ علم پر مخفی نہیں۔ واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم۔ رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگون رنگ کو جو کہ جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا تھا۔ اور آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ نیلگون رنگ آسمان نہیں ہے۔ اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے۔ وہ خود بھی مخدوش ہیں اور بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے۔ کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا۔ ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے۔ دلائل سائنس سے مصادم ہے سخت غلطی ہے۔ کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق اور تصادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے۔ ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا۔ اور جب تعارض نہیں ہے تو سماء کی تفسیر کواکب یا ما فوقنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ اُنہوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا۔ کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔ (تقویم الزیغ صا۱)

(۲) نو تعلیم یافتہ اسباب عالم کو مؤثر بالحقیقت سمجھتے ہیں۔ اور مسبب الاسباب کے منکر ہی ہو بیٹھے

جواب نمبر۔ فرمایا نئے خیال کے لوگ اسباب عالم پر ایسے جمع ہیں کہ مسبب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا۔ اسباب طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ کر تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور غلطی اُن کی یہ ہوئی۔ کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا۔

مثلاً آگ کا اثر ہے جلانا - اسکے دوام سے یہ سمجھنا کہ یہ اس کا ذاتی اثر ہے - انفکاک متصور نہیں اور یہ سخت غلطی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے قصہ ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے متعلق آیت قلنا ینار کونی بردا و سلاما میں تاویلات بعیدہ کیں - یہ سمجھکر کہ آگ کیونکر ٹھنڈی ہو سکتی ہے - اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل والوں کی اصطلاح میں گاڑی روکنے کیلئے سرخ جھنڈی ہوتی ہے - ایک نادان بار بار اسکو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے - کہ خود اس جھنڈی میں یہ اثر ہے کہ اس سے گاڑی رک جاتی ہے - کیونکہ جب دیکھا تو ایسا ہی نظر آیا - اور جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ کہیں گے کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے باقی یہ جھنڈی محض علامت ہی - اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں - ایسے ہی بغیر حکم حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرسکتا حتی کہ زبان سے جو جو الفاظ نکلتے ہیں - ہر ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے تو زبان حرکت کرتی ہے - تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہی - افسوس منکرین نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کرلیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے - ملفوظ نمبر ۲۵ دعوات عبدیت حصہ دوم -

جواب نمبر ۲ - بعض لوگ ایسے گھڑنے والے ہیں - جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں - بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز کا مدار رکھتے ہیں - حالانکہ حق تعالی نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو جابجا ظاہر فرمایا ہے - اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جاوے - تو عقلاً بھی خدا تعالی کی مشیت کو موثر ماننا ضروری ہی - کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادث کیلئے آپ نے ایک دوسری شے کو سبب مانا ہی - وہ سبب بھی تو اک حادث ہی اس کیلئے کون سبب ہوا - اگر اس کیلئے آپ نے تیسری چیز کو سبب بنایا - ہم اسمیں بھی کلام کرینگے - تو اس سلسلہ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جاوے گا - ورنہ تسلسل لازم آئیگا - اور لاتناہی کے ابطال پر متکلمین دلائل قائم کرچکے ہیں - اور یہ حکما کی حماقت ہی کہ وہ اجزاء عالم کو حادث بالشخص اور قدیم بالنوع کہتے ہیں - کہ ہر ہر فرد تو حادث ہی - مگر نوع قدیم ہے - حالانکہ وہ خود اسکے بھی قایل ہیں - کہ نوع کا وجود بدون تشخص کے نہیں ہوسکتا -

پھر جب ہر ہر شخص حادث ہے۔ تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا۔ غرض دلائل عقلیہ سے
بھی اور نقلیہ سے بھی مشیت حق کا مؤثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ اور جو شخص ہر
بات میں لانسلم ہی کا سبق پڑھے اس کا علاج متکلمین نے احراق بالنار بتلایا ہے
نیز فطرۃً بھی حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے۔ اور ماننے کی چیز کو نہ ماننا تحکم
ہے۔ اور تحکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں۔ جیسے ایک مجنوں پاخانہ کھا رہا تھا۔ کسی نے ملامت
کی۔ تو کہا اسمیں حرج ہی کیا ہے۔ یہ وہی تو ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہمنے داخل کیا تھا۔ اب
وہ ہمارے اندر سے نکل کر بُرا کیوں ہوگیا۔ ذرا عقلاء کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دیں
اگر عرف اور طبیعت سے کام نہ لیں محض عقلی دلیل سے اسکے دعوی کو باطل کریں میں سچ
کہتا ہوں کہ اسکے ابطال پر وہ کوئی دلیل نہ قائم کرسکیں گے۔ مگر کیا اس سے کوئی یہ کہیگا
کہ اس مجنوں کی . . . بات صحیح ہے۔ ہرگز نہیں سب یونہی کہیں گے کہ وہ نالائق پاگل
ہے جو ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا۔ جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔ اسی طرح ہم منکر صانع کو
پاگل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے ماننے پر اجماع عقلاء
واتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید۔ یہ تو کامل درجہ کی دہریت ہے
کہ خدا ہی کو نہ مانے۔ اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے۔ اور اُس کی
قدرت ومشیت کو کامل نہ مانے۔ بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ یہ شخص خدا کا قائل
ہے۔ اور محض برائے نام قائل ہے۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے۔ مگر
پنشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں
جیسے گھڑی کا کوک دینے والا۔ کہ کوک بھر دینے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اسکے اختیار کو کچھ
دخل نہیں۔ بلکہ اب وہ خود بخود چلتی رہے گی چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو۔ جبتک
کوک بھری ہوئی ہے۔ اُس وقت تک گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ
کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کردیا۔ اب اسباب سے مسببات اور علل
سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہیگا۔ نعوذ باللہ اس تاثر وتاثیر میں حق تعالیٰ کا کچھ بھی
اختیار نہیں۔ وہ اسباب سے مسبب کو مختلف نہیں کرسکتے۔ پس ان لوگوں کا خدا کو ماننا ایسا ہے

جیسے بعض لوگ من تشبہ بقوم فہو منہم سے بچنے کیلئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کیساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ کہ ساری ہیئت تو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کیلئے قدرت واختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے۔ کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی نہ ماننے کے مثل ہے۔ مگر الزام دہریت سے بچنے کیلئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور ان کی قدرت و اختیار کو کامل بھی مانتے ہیں۔ جیسے عامہ مسلمین مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں۔ دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے چنانچہ مصائب و حوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے۔ ہمنے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتضا ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی طبیعت کے اقتضار میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو۔ جس کی حرارت ناگوار ہو۔ اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ تو فرق ضرور ہوتا ہے۔ اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی۔ اسی طرح اعتقاد قدرت الٰہیہ کی برودت سے طبعی خلجان میں کچھ تو کمی ہونا چاہیئے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے مگر چونکہ ہمارا اقرار ضعیف ہے۔ اس لئے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا۔ جیسے گرم پانی کے ایک مٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا دیا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہوگی۔ مگر اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں۔ کہ جو شے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب ہو۔ وہ چیز معتد بہ ہے۔ اس لئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ معتد بہ نہیں دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجائے (خیر الحیات وخیر الممات ص۵)

(۳) کثرت رائے کلیۃً دلیل نہیں کہ حق اسی میں ہے

جواب نمبر۳۔ آجکل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے

کیا ان عوام کالانعام کی - اگر انہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف آخر انہوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی - کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا - اسی لئے کہ وہ قوم جاہل تھی - اُس کی رائے جاہلانہ رائے تھی - آجکل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ اُنہوں نے قوم میں پھوٹ ڈالدی - یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے (فضائل العلم والخشیہ صفہ ۳۱)

جواب نمبر ۲ (غزوہ احد میں) اُن پچاس آدمیوں میں و جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کر دیئے گئے تھے) اختلاف ہوا بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اب ہمکو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کیلئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا - وہ غرض حاصل ہو چکی - اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا - اب یہاں سے ہٹنے میں حضور کے مقصود کی مخالفت نہو گی اور ہم نے ابتک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہمکو بھی کرنا چاہئے - ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں - ہمکو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے - بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور نے صاف فرمادیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لئے ہم کو بدون آپکی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے - مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے یہ اُن سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی - جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں) (ذم النسیان صد ۱۲)

جواب نمبر ۳ - حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبائل مرتد ہو گئے تھے - جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے تھے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے - بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے توحید و رسالت کے مقر رہے - کعبہ کو قبلہ مانتے رہے - نماز کی فرضیت کے قائل رہے - مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے - اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے

مخصوص تھی اب فرض نہیں۔ اور علت یہ بتلائی کہ حضور کے زمانہ میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اس لئے اُس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی۔ اس لئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آجکل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔ پہلی جماعت کے بارہ میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی۔ کہ اُن کے ساتھ جہاد کرلیا جاوے۔ مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی۔ کہ اُن کے ساتھ نرمی کی جائے۔ اور جو کھلے کافر ہیں صرف اُن سے لڑائی کی جاوے۔ اُن لوگوں پر جہاد نہ کیا جاوے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کیمتعلق بھی وہی تھی۔ جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے۔ اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریگا میں اُس کیساتھ قتال کرونگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے۔ کہ یہ لوگ تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ ان پر کیونکر جہاد ہوسکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت صدیق رضی نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی۔ مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں۔ کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں۔ اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے۔ حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں۔ اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ من بدل دینہ فاقتلوہ اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کرونگا۔ حضرت عمرؓ نے پھر کہا۔ کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کرینگے حضرت صدیقؓ نے فرمایا۔ اجبار فی الجاھلیۃ خوار فی الاسلام واللہ لو منعونی وفی روایۃ عناقا عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علیہ

ترجمہ۔ اے عمر یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے۔ اور اسلام میں اتنے بودے ہوگئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ تو میں اس پر بھی اُن سے قتال کرونگا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ان اللہ معنا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

اُس وقت میں بھی تنہا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں۔ اگر میں تنہا ہی جہاد کو نکل کھڑا ہونگا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے۔ اس قوت قلب کی۔ چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق کی رائے پر متفق ہو گئے (اس واقعہ سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھے ہوئے ہیں)

(ذم النسیان صفحہ ۳۰)

(۴) مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا خلاف عقل ہے کیونکہ انکا گوشت کوئی بھی نہیں کھاتا

جواب اس کا یہ ہے۔ کہ جناب من ہے تو فحش بات لیکن تفہیم کیلئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپکا پیدا ہونا جس طریقہ سے ہے۔ وہ بھی عقل کے خلاف ہے۔ اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہ خانہ میں پرورش کیا جائے۔ اور اسکے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ کہ آدمی کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے۔ تو ہرگز اسکی عقل میں نہ آئیگا۔ ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقہ سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کو خلاف عقل نہیں معلوم ہوتا۔ تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے تمام حالات ہی خلاف عقل ہیں۔ ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔ کہا چار روٹیاں۔ ایسے ہی ہماری عقل صرف اسقدر ہے کہ کھالو پی لو۔ اور باتیں بنالو۔ جب اتنی عقل ہے۔ تو اسرار شریعت کہاں سے سمجھ میں آئیں ایسے ہی نفس اضحیہ یا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے۔ اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابل انکار کیسے ہوگی۔ اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت و راز کو بیان کریں۔ لیکن تبرّعاً بتلائے دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنت ابراہیمی کا اتباع ہے اور شئے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصل علّت تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح

کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا۔ تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح ولد کے کردیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے۔ جیسے آجکل تو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سرتاسر غلط ہے۔ اور قربانی کا مقصود اظہار محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اسمیں حاصل ہے۔ پھر مال کہاں ضائع ہوا (ترغیب الاضحیہ ص۱۲)

(۵) آجکل جماعت علماء کو کما سمجھا جاتا ہے اس کا جواب

بر سبیل وعظ بیان فرمایا کہ آجکل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت بیکار و نکمی پلٹن اور کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص انجلا ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے اگر دو شخص یکساں دماغ کے انگریزی پڑھیں۔ اور ایک ان میں عربی بھی پڑھا ہوا ہو۔ تو وہ شخص جو عربی بھی پڑھا ہوا ہے۔ صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر و تحریر و فہم میں مقابلۃً ضرور زیادہ ہوگا۔ چنانچہ ایک جج عربی پڑھے ہوئے تھے۔ اُن کے فیصلے نہایت مدلل اور پرزور ہوتے تھے۔ ہم لوگ عربی پڑھے ہوئے اگر دنیا کمانے پر آئیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں تو فہم کے متعلق تو یہ گفتگو تھی۔ رہی کم ہمتی اس کا شبہ اس سے ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ بہت روپے نہیں کماتے۔ قلیل پر قناعت کرتے ہیں۔ تو اسکا جواب ایک مثال سے سمجھ لیجیے اگر کوئی شخص آپکے یہاں نوکر ہو اور صرف پانچ روپے ماہوار پاتا ہو۔ اور کوئی دوسرا شخص اسکو بیس روپے دینے لگے۔ لیکن وہ یہ کہدے کہ مجھکو تو یہ پانچ روپے ہی اچھے ہیں۔ میں اپنے آقا کو نہ چھوڑونگا۔ تو سچ کہیے۔ کیا آپ اسکو کم ہمت اور بیکار کا خطاب دیں گے۔ نہیں بلکہ آپ اس کو کہیں گے کہ بڑا عالی ہمت اور وفادار شخص ہے۔ کہ بیس روپے پر لات ماردی اور اپنے آقا کو نہ چھوڑا اور اس کے پانچ ہی روپیوں پر قناعت کی۔ پھر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو جو علم دین کی خدمت میں رہتے ہیں۔ کیوں کم ہمت اور بیکار و نکمی پلٹن وغیرہ کے خطاب

ملتے ہیں۔ حالانکہ جیسا اوپر کہا گیا۔ اگر یہ مولوی لوگ دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں۔ لیکن پھر باوجود قدرت کے دنیاوی منافع کو چھوڑ کر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور روکھے سوکھے ٹکڑوں میں خوش ہیں۔ تو ان کو کیوں عالی ہمت اور وفادار اپنے آقا یعنی خداوند کریم کا نہیں کہا جاتا۔ آپ لوگ جو خدمت علماء اور اہلِ دین کی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھیئے کہ ہمارا احسان ہے۔ آپ تو محض خزانچی ہیں۔ اور خزانچی جو بڑے بڑے عہدہ داروں اور اہلکاروں کی تنخواہیں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اُن کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ خزانہ سرکاری ہے۔ خزانچی تو ایک چھوٹی سی تنخواہ کا ملازم ہے۔ اس کے سپرد ہی یہ خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجتا ہے۔ اور گردن دبا کر آپ کے ذریعہ سے ان بزرگوں کو اپنا عطیہ پہنچاتا ہے۔ آپ کا کوئی احسان نہیں (ملفوظ نمبر ۱۴۱۔ دعوات عبدیت حصہ سوم)

(۶) حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے پر شبہ کا جواب

فرمایا۔ آئینہ میں صورت جب تک نظر آتی ہے۔ جبتک کہ آنکھ کسی دیکھنے والے کی کھلی ہوئی ہو۔ کیونکہ نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ شعاع آنکھ سے نکلکر آئینہ پر پڑ کر پھر رائی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لئے صورت نظر پڑتی ہے۔ جب نگاہ نہ کی تو شعاع نہ نکلی۔ تو پھر نظر آنے کا کوئی سبب نہیں۔ غرض آئینہ میں جو نظر آتا ہے۔ وہ کوئی مبائن چیز نہیں بلکہ اس چہرہ پر نگاہ لوٹکر پڑتی ہے۔ جب مرئی سے اپنی شعاعوں کا تعلق علت ہے رویت کی۔ پس اگر کسی شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ سیدھی شعاعوں کو مقوس کر سکے۔ تو اس کو پیچھے سے بھی مثل سامنے کے نظر آئے گا۔ چنانچہ صوفیہ کے بعض اشغال میں سر نظر آنے لگتا ہے۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیچھے سے بھی دیکھتے تھے اور اس کی وجہ میں بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں پیچھے کی جانب دو سوراخ تھے۔ ان سے نظر آتا تھا۔ تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شعاعوں کے مقوس بنانے کی قوت مرحمت فرمائی تھی جب آپ قصد فرماتے

آگے دیکھ لیتے۔ اور پیچھے کا قصد کرتے تو پیچھے نظر فرما لیتے۔ ہر شخص میں یہ قوت نہیں اسلئے نظر نہیں آتا۔ اور اس توجیہ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہ نقل فرماتے تھے (ملفوظ نمبر ۷۵۔ ایضاً)

(۷) کافر کو عذاب دائمی ہونے پر شبہ کا جواب

جواب نمبر ۱۔ بر سبیل وعظ فرمایا۔ کہ کافر کو جو ابدی عذاب ہے۔ اس میں کوئی ظلم نہیں کیونکہ کافر اللہ تعالیٰ کی ہر ہر صفت کے حقوق ضائع کرتا ہے۔ اور اس کی صفات لامتناہی ہیں اور خود ہر صفت کے حقوق بھی غیر متناہی ہیں۔ تو چاہیے تو یہ تھا کہ ہر صفت کے انکار پر لامتناہی سزا ہوتی اور پھر ہر صفت کے حقوق پر اسی طرح غیر متناہی سزا ہوتی۔ پھر زیادتی کہاں ہوئی۔ بلکہ ایک معنی کر کے کمی ہے۔ بغاوت کی سزا قید دائمی ہی ہوتی ہے۔ جس کا دوام حکام ظاہری کے اختیار میں ہے۔ یعنی تا حیات وہ اپنے باغیوں کیلئے مقرر کرتے ہیں۔ اور جس قسم کا دوام احکم الحاکمین کے اختیار میں ہے یعنی اصلی وہ اپنے باغیوں کے واسطے تجویز فرمائیں گے۔ اس میں ظلم اور زیادتی کچھ بھی نہیں۔ بلکہ عین عدل ہے (مجادلات معدلت نمبر ۲ حصہ ایضاً)

دوسرا جواب۔ سزا مناسب جنایت ہونی چاہیے۔ اور یہاں جنایت متناہی ہے۔ کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے۔ تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔ اس کا جواب ہے۔ کہ تمہارا یہ مقدمہ تو مسلم ہے کہ سزا جنایت کے مناسب ہونی چاہیے۔ مگر کیا تناسب کے یہی معنی ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو۔ اگر یہی بات ہے تو چاہیے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو۔ اور ڈاکو گرفتار ہو کر آئیں۔ تو حاکم ڈاکوؤں کو صرف دو گھنٹے کی سزا دیدے۔ اگر حاکم ایسا کرے تو۔ کیا آپ اسکو انصاف مانیں گے۔ اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے؟ ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ سزا اور جنایت میں مناسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ

مناسب و مساوی ہو۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو۔ اب تم خود فیصلہ کرلو۔ کہ شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے۔ وہ شدت جرم کے مناسب ہی یا نہیں۔ اور یہ جرم شدید ہے یا نہیں۔ شاید آپ یہ کہیں۔ کہ جرم شدید تو ہے۔ مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابدالآباد جہنم ہو۔ میں کہونگا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تمنے صرف فعل کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے۔ حالانکہ سزا و جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے بلکہ نیت کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل مدار نیت پر ہی ہے۔ چنانچہ ایک شخص دھوکہ سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا۔ گو صورت گناہ موجود ہے۔ کیونکہ نیت نہ تھی۔ اور اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اسکو دیدے۔ جسے یہ شراب سمجھ کر پیئے۔ تو اس کو گناہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی نیت تو شراب پینے ہی کی تھی۔ اسلئے فقہا نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرے۔ مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں۔ بلکہ کوئی اجنبی عورت ہی تو اس کو گناہ ہوگا۔ اسی طرح اگر مجامعت میں کسی اجنبیہ کا تصور کرے۔ یعنی بیوی سے مجامعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا اجنبیہ سے مجامعت کر رہا ہوں۔ اور اسکی صورت ذہن میں حاضر کرکے اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اسکے پاس غلطی سے بجائے اسکی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیجدیا۔ جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہمبستر ہوا۔ کہ یہی میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا۔ اور یہ وطی زنا شمار نہ ہوگی بلکہ وطی بالشبہ ہوگی۔ جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور عدت بھی لازم ہوتی ہے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں گو کفر کا فر متناہی ہے۔ مگر اسکی نیت یہ تھی کہ اگر زندہ رہا تو میں ابدالاباد اسی حالت پر ہونگا اس لیئے اپنی نیت کے موافق اسکو ابدالآباد جہنم کا عذاب ہوگا۔ اسی طرح مسلمان کا اسلام گو بظاہر متناہی ہے۔ مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں

تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا۔ اس لئے اس کیلئے ابدالآباد ثواب جنت ہے۔ (محاسن الاسلام ص۳۱)

(۹) احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت حق نہیں

صاحبو! دین کو لوگوں نے تختۂ مشق بنا لیا ہے۔ کہ لوگ اپنی رایوں کا احکام میں دخل دیتے ہیں اور ان کی علتیں گھڑتے ہیں۔ اور علماء سے بھی اس طرح سوال کرتے ہیں کہ یہ امر اس طرح کیوں ہے۔ سود لینا کیوں حرام ہے۔ فلاں بات کس لئے منع ہے پھر فرمایا۔ کہ میں نے ایک موقعہ پر اس کے متعلق یہ بیان کیا تھا۔ کہ یہ بات تو مسلم ہے کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجنیر صاحب آنکر یوں کہیں کہ فوراً اٹھو۔ یہ مکان گرا چاہتا ہے۔ تو کچھ بھی تامل اٹھنے میں نہ کریں گے۔ اور علت نہ پوچھی جائے گی۔ اس وجہ سے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسے فن سے واقف ہیں جسکو ہم نہیں جانتے۔ اس لئے اُس کے حکم کی قدر کیجاتی ہے۔ اور اس لئے اس کے کہنے کے موافق عمل کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ نہ علت تلاش کرتے ہیں۔ نہ اس سے علت پوچھتے ہیں۔ بلکہ حکم کی تعمیل کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔ یا سول سرجن صاحب آکر کوئی دوا بتائیں۔ تو اس میں کچھ بھی چون وچرا نہیں کرتے۔ جانتے ہیں۔ کہ یہ اس فن کا ماہر ہے سمجھنے کی بات ہے کہ جس فن سے یہ لوگ واقف نہیں اس میں لم اور کیف کس لئے دخل دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کسی کی عظمت مانع ہوتی ہے۔ اس کے احکام کی علت ڈھونڈنے سے۔ اس کی نظیر ایسی سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کے مرتبے کا حکم کرے۔ تو اس کی علت پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ حکم کس لئے دیا۔ اور ایک حاکم کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو تو ہرگز علت نہیں پوچھتے۔ وجہ یہ ہے کہ دوست کی عظمت اتنی قلب میں نہیں۔ ایک معمولی چیز ہے۔ اور حکام کی عظمت ہے۔ اس لئے حجت نہیں کرتے۔ سو جب خدا تعالےٰ

کے احکام کی علل دریافت کی جاتی ہے۔ اس سے تو شبہ پڑتا ہے کہ اُن کے دلمیں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے۔ غرض محکوم ہونے کی حیثیت سے علل دریافت کرنا عقلاً بیہودہ امر ہے۔ ہاں طالب علمی کی حیثیت سے بغرض تحقیق فن مضائقہ نہیں مگر وہ منصب صرف طالبعلموں کا ہے۔ چنانچہ طلبہ اور شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی حجتیں کرتے ہیں۔ سنو اس کیلئے تعلیم فن کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس آکر ترتیب وار پڑھو۔ پھر اپنے وقت پر جو امر سمجھنے کا ہے۔ وہ سمجھ لیں۔ اور خود آجائے گا۔ دریافت کی بھی ضرورت نہوگی۔ خیال تو کیجئے کہ کلکٹر کا منادی آکر جب حکم سے اطلاع کرتا ہے تو کوئی علت نہیں پوچھتا۔ افسوس ہے کیا علماء کو بھنگی سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ علماء درحقیقت منادی کرنے والے اور ناقل احکام ہیں۔ خود موجد احکام نہیں۔ اس لئے اُن سے علتیں پوچھنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ پھر جب آپنے ایک فن کو سیکھا نہیں۔ اور آپ اس سے محض ناواقف ہیں تو آپ کو سمجھانا بھی تو ایسا ہی ہو گا جیسے ایک سائیس کو اقلیدس کی اشکال سمجھانے لگیں۔ تو وہ کیا سمجھے گا۔ اس کی تدبیر تو یہی ہے کہ پہلے اس کو اقلیدس کے مبادی سمجھا دو۔ جو اشکال کی موقوف علیہ ہیں۔ پھر شکل سمجھاؤ۔ تو خوب سمجھیگا علماء آجکل اپنے حلم کی وجہ سے لوگوں کی رائے پر چلنے لگے ہیں۔ جس سے عوام کی جرأت بڑھ گئی ہے۔ ایسا نہیں چاہئے۔ علماء کیا نوکر ہیں۔ کہ بے فائدہ دماغ خالی کریں (مجادلات معدلت نمبر ۲ حصہ سوم دعوات عبدیت)

(۹) احکام شریعت کو مصالح دنیوی کی بنا قرار دینا خطرناک مسلک ہے

اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے۔ جو اسکو جان لیگا وہ سمجھ جائیگا کہ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کیساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ حامی اسلام نہیں بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں ؎ دوستی بےخرد چوں دشمنی ست۔ اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے۔ اس میں مضمون کا

حاصل یہ ہے۔ کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے۔ اور جماعت پنجگانہ و جمعہ و عیدین۔
و حج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کیواسطے ذرائع و وسائل ہیں۔ تو عجب نہیں۔ کہ
بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں۔ اور
اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا۔ تو وہ بہت آسانی سے جماعت اور
نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب
احکام حصول اتفاق کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ اور ان کو کلب میں جانے اور
تھیٹر میں ملکر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔ جہاں راحت سے آرام
کرسی اور گدے تکیوں پر جگہ ملتی ہے۔ تو وہ خواہ مخواہ مسجد میں کیوں آنے لگے
اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے۔ چنانچہ اس وقت ان
تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے۔ اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا۔ کہ
وضو کی ضرورت ابتدائے اسلام میں تھی۔ آجکل نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت بدوی
لوگ پاک صاف نہ رہتے تھے۔ جنگل کے کاروبار سے غبار آلودہ آتے تھے۔ اس
لئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا۔ اور ہم لوگ آجکل صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں۔
ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہاتھ پیر گرد
سے محفوظ رہتے ہیں۔ ہمکو وضو کی ضرورت نہیں۔ یہ نتیجہ ہے ایسے اسرار بیان
کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے
کچھ بھی تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدا اسلام
میں اس لئے تھی۔ کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و سرکش
ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کیلئے یہ افعال تواضع و خشوع کے تعلیم فرمائے
گئے تھے۔ اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہو گئی ہے
ہمکو نماز کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان
ہیں۔ انگلستان سے مجکو لکھا تھا۔ کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل
عقل کے خلاف ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جاوے۔ جن کا

گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے۔ چنانچہ اس لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی
جانوروں کو کھیتوں میں ڈالدیا جاتا ہے۔ غضب یہ ہے کہ آجکل خدا پر بھی عقل کی حکومت
ہونے لگی۔ صد افسوس ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایک جج کسی مجرم کو سزا دے۔ اور
مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کریگا۔ ہرگز
نہیں۔ بلکہ وہ صاف یہ کہے گا۔ کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں۔ بلکہ
قانون عقل پر حاکم ہے۔ اور اسکے اس جواب کو سب عقلاء تسلیم کرتے ہیں۔ مگر حیرت
ہے کہ قانون الٰہی کو آجکل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے۔ بلکہ اس کو اپنی
عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علی سبیل التنزل ہے۔ ورنہ قانون الٰہی تو
بالکل عقل کے مطابق ہے۔ بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی
عقل میں اسکی حکمتیں آجایا کریں۔ آخر پارلیمنٹ کے عقلاء جو قوانین تجویز کرتے
ہیں۔ کیا ہر عامی کی عقل اس کے مصالح تک پہنچ جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ
اس کے مصالح و حِکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر قانون الٰہی کی حکمتوں
اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہاں یہ کیوں
نہیں کہا جاتا۔ کہ قانون الٰہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے
مصالح سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور بالفرض
اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا
کسی کو اختیار نہیں۔ کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں۔ بلکہ اس کی ماتحت اور اسکی تابع
ہے۔ غرض ان حضرت نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود

ف ان حضرت نے منیٰ میں کھیتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو یہ وجہ تبلائی کہ اتنا گوشت آدمیوں
سے کھایا نہیں جاتا۔ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے
اور نہ سب قربانی کرتے ہیں۔ بلکہ حجاج میں زیادہ تر غربا ہوتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر منیٰ کی قربانی کا سارا
گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کر دیا جاوے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا۔ بلکہ بہت لوگ پھر بھی محروم
رہ جائیں گے۔ بلکہ منیٰ میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دبایا جاتا ہے۔ پس اس خلاف عقل
حرکت کے جوابدہ ڈاکٹر ہیں۔ جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے۔

غربا کی امداد ہے۔ اور ابتدا اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا۔ مویشی زیادہ تھے اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ کہ جانور ذبح کرکے غربار کو گوشت دیدو۔ اور اس زمانہ میں نقدی بہت موجود ہے۔ غلہ بھی موجود ہے۔ بس آجکل بجائے قربانی کرنیکے نقد روپے سے غرباء کی امداد کرنا چاہیئے۔ تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غربار سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی باسانی حاصل ہوسکتی ہے۔ قربانی چھوڑنیکا ارادہ کرلیا۔ حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں۔ بلکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غربار کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانہ میں نقد اور غلہ کم تھا اور مویشی زیادہ تھے اس لئے جانوروں کے ذریعے غربار کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا۔ تو اسکے کیا معنے کہ جانور کو ذبح کرکے غربار کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہو۔ اور زندہ جانور کسی غریب کو دیدیں۔ تو واجب ادا نہو۔ پھر کیا پہلے مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی بالکل غلط ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے ہیں تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آجکل تو اس کا عشر عشیر بھی نہوگا۔ پھر اس وقت صحابہ کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھ کر سوجھی اور صحابہ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا۔ دوسرے اگر یہ حکمت قربانی میں مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا۔ حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں۔ بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریبوں کو حبہ برابر بھی نہ دے۔ تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غربار قربانی سے مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ مقصود کچھ اور ہے۔ مگر آپنے دیکھ لیا۔ کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے۔ کہ ہر شخص اپنی مخترع حکمتوں پر احکام کا مدار سمجھنے لگا (سبیل النجاح صہ۱۵)

(۱۰) کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال کیلئے جانیکی تحقیق اور اُسپر شبہات کا جواب

بعض بزرگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ مکہ معظمہ پہنچے۔ تو جا کر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے

سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کئے دیتے ہیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آرہے تھے۔ کعبہ اُنکے استقبال کو گیا ہوا تھا۔ اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی ایک تو اُن کو جنہیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں۔ ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی۔ اور کہنے والوں پر ہنسا اور وہم پرست کہنا شروع کیا۔ دوسرے اُن دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں۔ ایسے لوگوں نے ان کو صوفیہ کے ڈھکوسلے کہہ کر اُڑا دیا تیسرے اُن لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے۔ اُنہوں نے اسکو خلاف عقل بتلایا۔ اور یہ اعتراض اس پر کیا۔ کہ اگر ایسا ہوتا۔ تو تاریخوں میں اسکا تذکرہ ضرور ہوتا۔ سو ہمنے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے۔

ع- چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زوند

تو سمجھو کہ ایک تو کعبہ کی صورت ہے۔ اور ایک کعبہ کی روح ہے۔ روح کعبہ ایک خاص تجلی ہے۔ کہ کعبہ ظاہری اس کا مظہر ہے۔ پس جن بزرگ نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعض بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں۔ کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی۔ لیکن حج کے لئے ان کو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا۔ (اصلاح النفس صہ۱)

(۱۱) جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے

نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے۔ اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں۔ اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایک تابع ہو۔ ایک متبوع ہو سب کے سب آزاد نہ ہوں۔ بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہو۔ تو ہر شخص آزاد ہوگا۔ اور آزادی مطلق انتظام کیلئے [illegible] نافی نہیں۔ اور نہ کسی نے آجتک اس کو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے

ہیں۔ کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آجکل ایک فرقہ نکلا ہے۔ جو سلطنت کا مخالف ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدون سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا۔ وہی سلطنت کے مصداق ہوگئے۔ کیونکہ اُن کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی۔ اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی۔ کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہوجائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی۔ تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں۔ اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطہ سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے۔ تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے۔ ورنہ بہت سہل تھا۔ کہ انبیاء کو نہ بھیجتے۔ بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آگرا کرتے۔ اور ہر شخص اسکو پڑھکر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا نہ علماء و مجتہدین کا۔ شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ جب تمنے پریس ایجاد کر لئے ہیں۔ تو خدا تعالیٰ کو پریس بنا لینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے۔ تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔ دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں۔ کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو بھی نصیب نہیں۔ جو قیامت تک باقی رہے۔ تو پھر کاتبین اعمال آپکے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں۔ وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈالدیا کریں۔ تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا۔ اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہوجائے۔ جو لوگ جمہوری

سلطنت کے حامی ہیں۔ اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں۔ وہ بھی آزادی کا عام ہونا
گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی
پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی۔ تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہوجائیگی
ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں جبکہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جاوے۔ بلکہ
جس کے جو جی میں آوے کرنے دیا جاوے۔ کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جاوے۔ کیونکہ تم
تو آزادی کے حامی ہو۔ تو آزادی تو اسی کا نام ہے۔ کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔ پھر تم
لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو۔ اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو۔ یا
کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے
پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے
کا تابع کیوں بنا رکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں۔ وہ بھی
شخصیت ہی کے حامی ہیں۔ مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے۔ کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ
مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے
فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ مگر مجموعہ مل کر
پھر شخص واحد ہے۔ کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے۔ وہ سب کی رائے سے ملکر پاس
ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں۔ کہ جو شخص جو رائے دیدے وہی پاس
ہو جایا کرے۔ اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں
تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں۔ بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے۔ اور
اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہی۔ کیونکہ مجموعہ ملکر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص
واحد حقیقی کے حامی ہیں۔ اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی
نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا۔
کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ نہ ایک بادشاہ کا نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی
ہے کہ تمنے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا
ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے۔ تمنے دس کا غلام بنا دیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام

ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو۔ وہ اس سے بہتر ہے۔ جس پر دس بیس کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں۔ مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔ شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعوی ہی نہیں کیا۔ جو اس پر نقض وارد ہو۔ اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں۔ کسی وقت ان کو اپنے دعوے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو۔ اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اُس کو مجبور کیوں کرتے ہو۔ اُسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو۔ آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے۔ مگر کیونکر آزاد رہنے دیں۔ نظام عالم بدون اسکے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں۔ بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں اگر ان کو اپنے دعوائے آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت کو کبھی اپنے دعوے سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں۔ اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے۔ جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالی نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں۔ تو ان میں بھی ایک تابع تھے دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے جو بنی اسرائیل و قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السّلام تابع تھے۔ دونوں برابر درجہ میں نہ تھے۔ اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی۔ بلکہ واقعی تابعیت تھی۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام ہارون علیہ السّلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ اُن کی مخالفت نہ کر سکتے تھے چنانچہ حق تعالی نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا۔ جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا۔ جب موسیٰ علیہ السّلام تورات لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لیگئے تو ہارون علیہ السّلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا۔ اور ان کی

اصلاح کرتے رہنا۔ یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونیکا بچھڑا بنایا۔ اور اس میں قدم جبرائیل کی مٹی ڈالدی جس سے اس میں حیات پیدا ہو گئی۔ فقالوا ھٰذا الٰھکم والٰہ موسٰی فنسی۔ جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسٰی علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ بس بے وقوف لگے اُس کی عبادت کرنے موسٰی علیہ السّلام کو حق تعالٰے نے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ غصّہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اُسی وقت اُنہوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کمبخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے۔ میرے پاس باقیماندہ جماعت کو لیکر کیوں نہ چلے آئے۔ اور غصّہ میں اُن کا سر اور ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے۔ قال یا ابن ام لا تاخذ بلحیتی ولا برأسی۔ ہارون علیہ السلام نے کہا کہ اے بھائی میرے ڈاڑھی اور سر کو نہ پکڑو۔ میری بات سنو! مجھے یہ اندیشہ ہوا۔ کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چل دوں گا۔ تو آپ یہ نہ کہیں۔ کہ تو نے وہاں رہکر ان کو سمجھایا کیوں نہیں۔ اُن کی اصلاح کیوں نہ کی۔ اس لئے میں یہیں رہکر ان کو سمجھاتا رہا۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسٰی علیہ السلام سے بڑے تھے۔ مگر نبوت میں اُن کے تابع تھے۔ اس لئے موسٰی علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعیت کے مقتضیٰ پر عمل کیا اور وہ برتاؤ کیا۔ جو حاکم محکوم کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر باوجودیکہ انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے۔ مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کرکے تو دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السّلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی۔ جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں۔ ایک متبوع ہیں۔ اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔ اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہوگا کہ موسٰی علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالٰی کی متبوعیت اور تابعیت کا ظاہر کرنا تھا۔ اس لئے موسٰی علیہ السّلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کردیا جس سے اُنہوں نے اپنی حکومت و متبوعیت کے مقتضا پر

بے تکلف عمل کیا۔ اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہونگی۔ غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے۔ اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں۔ اور جمہوری میں متیقن ہیں شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کہ وہ جو چاہے کرے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیئے۔ بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے۔ اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے۔ اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنی ایجادات ہیں۔ وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا۔ تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح ومحشین کی تقریریں اسکے سامنے غلط ہو جاتی ہیں۔ تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے۔ اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی۔ تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں سب مجبور ہیں۔ غلط رائے کی موافقت پر۔ اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے۔

خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سید احمد خاں سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو۔ کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیف ما اتفق جمع کر لیا جاوے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے۔ لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیفما اتفق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں۔ تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی۔ بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کر لیا جاوے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں۔ تو عقلاء میں بھی کثرت انہی لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہو گئے۔ غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں۔ جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے۔ خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اُس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنیکا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے۔ کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نا اہل ہے۔ تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہوں۔ ہم اُن سے گفتگو نہیں کرتے ان کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نا اہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے۔ اسلام میں جو شخصی

سلطنت کی تعلیم ہے۔ تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے۔ کہ اے اہل حل وعقد اور اے جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ۔ جو اتنا صائب الرائے ہو۔ کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو۔ تو یہ احتمال ہو سکے۔ کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جسکی رائے میں اتنی بدرزانت نہ ہو۔ اُس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب تبلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زرین ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اُس کی رائے کے صائب ہونیکا احتمال ہو۔ وہ حکومت شخصی کے قابل ہے۔ یا نہیں۔ یقیناً قابل ہے۔ بشرطیکہ اہل حل وعقد انتخاب میں خیانت نکریں بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے۔ اور نا اہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس کیلئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو۔ بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو۔ مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے۔ صائب العقل زرین سمجھتے ہو۔ تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ وشاورھم فی الامر مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا۔ اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے۔ اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے۔ کہ ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا۔ کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں اُن کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا اُن کے آقا نے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں۔ تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا۔ کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا۔ اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں۔ اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اسکو اختیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بناء پر حضرت بریرہ رضی نے

نکاح سابق کو فسخ کر دیا۔ لیکن اُن کے شوہر کو اُن سے بہت محبت تھی۔ وہ صدمۂ
فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس پر
رحم آیا۔ اور حضرت بریرہؓ سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے
رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک
فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے۔ گو مجھکو تکلیف ہی ہو۔ آپنے فرمایا حکم نہیں
صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہؓ نے صاف عرض کر دیا۔ کہ اگر مشورہ ہے تو میں اسکو
قبول نہیں کرتی لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجۂ اولیٰ رعایا
کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں۔ تو اُسکو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے۔ اور یہ محض
ضابطہ کا حق نہیں۔ بلکہ واقعی حق ہے۔ چنانچہ جب حضرت بریرہؓ نے حضور کے مشورہ
پر عمل نہ کیا تو حضور اُنسے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہؓ کو کچھ گناہ ہوا نہ اُنپر کچھ عتاب ہوا
سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور
نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائیگا۔ کہ رعایا جو مشورہ دے اُسی
کے موافق عمل کرے۔ اسکے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس شاورہم فی الامر سے صرف یہ ثابت
ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ اُن کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں
اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے
مجبور ہے۔ اور جبتک یہ بات ثابت نہو اُس وقت تک شاورہم فی الامر سے جمہوریت
ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور
نہیں ہوتا۔ تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل
بھی ہے۔ یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہؓ سے دلیل
موجود ہے۔ کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو
اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ اُن کے مشورہ پر عمل کرنے
کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں۔ بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ
کے خلاف ہی کیوں نہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فاذا عزمت فتوکل

علی اللہ کے مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں۔ یہاں اذا عزمت صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود اُن کے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے۔ حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں۔ اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے۔ کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا ہے۔ کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں۔ اہلِ مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجۂ لزوم نہیں۔ تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ چاہے بادشاہ اُن سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے۔ تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے۔ کہ ہم سے بدون مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے (تقلیل الاختلاط مع الانام ص۳۵)

(۱۲) امن عامہ کامل طور پر دین پر قائم ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے

مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے لیکن آپکو خبر نہیں۔ صاحبو! غضب ہے کہ غیر قومیں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی جا رہی ہیں۔ اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے۔ اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور وہ پانچ چیزیں ہیں۔ عقائد۔ عبادات

معاملات اداب معاشرت - اخلاق باطنی - یعنی یہ کہ تکبر نہو ریا نہ ہو - تواضع ہو - اخلاص ہو قناعت ہو شکر ہو - صبر ہو وعلیٰ ہذا پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے اسوقت کسی نے کسی کو کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے - کسی نے اعمال کو چھوڑا کسی نے معاملات کو کسی نے معاشرت کو اسی طرح اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے بلکہ ان اخیر کے دو جزو کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے - اس تفصیل کے بعد حاصل آیت شریف کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلال کو افساد فی الارض میں دخل ہے - بس اب اس کو دیکھ لیجئے - مشاہدہ کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے - سنو بعض کا دخل تو بین ہے - مثلاً اخلاق کہ انکا اثر امن عام میں بین ہے - اور ذرا سی غور سے معاملات کا اثر . . . . بھی امن عام میں ظاہر ہو جاتا ہے - کیونکہ احکام معاملہ کا حاصل حقیقت یہ ہے - کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جاوے - پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے - بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں - کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جیسی کہ شریعت نے کی ہے - جیسے پھل فروخت کرنا کہ آنے سے قبل از وقت پھل فروخت کئے - تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے - کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے - اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے - اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں - تو امن قائم ہو گا - تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے - باقی اور تین چیزوں کا امن عام میں دخیل ہونا سو یہ کم ظاہر ہے - اس لئے اسکو بھی ثابت کرنا ضرور ہے - کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخیل ہیں - سو اول یعنی عقاید کو تو یوں سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معاد ام العقاید ہیں - اور ان سب کو امن عام میں بڑا دخل ہے - آپ نے اخلاق اور معاملات کو تو امن عام میں دخیل مان لیا ہے - اس کی تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائیگا ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں - کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا - سچ بولنا - ہمدردی کرنا - خود غرضی نہ کرنا داخل ہے - اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں - جن پر تمام دنیا کا مدار ہے - لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں - جن میں ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہے اور دوسرا قائل نہو

تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا۔ یعنی منکر توحید میں۔ تو یہ اخلاق محدود العمر ہونگے اس طرح سے کہ جبتک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اسکے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں۔ یا اُنکے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہوکر رُسوائی کا اندیشہ ہو۔ اُس وقت توان اخلاق پر عمل کیا جاویگا۔ اور اگر کوئی ایسا موقع آپڑے گا۔ کہ ان اخلاق پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو۔ اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو جس میں اندیشہ بدنامی نہو۔ تو اس منکر توحید ورسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروا نہ ہوگی۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اُسی وقت تک کیجاتی ہے۔ جبتک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں۔ یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہو۔ اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو۔ تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس وپیش نہیں ہوتا۔ یا فرض کرو کہ دو شخص ہمسفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں۔ اور دوسرا ایسا ہو کہ اُس پر فاقے گذرتے ہوں۔ اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کرجائے۔ اور دوسرے رفیق سفر کو ان نوٹوں کے لیلینے کا موقع ملے۔ اور عاقل بھی یہ اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف ان کو فروخت کرسکے۔ اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو۔ اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو۔ کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے۔ اس صورت میں اخلاق اور نفس میں سخت کشاکش ہوگی۔ اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا۔ کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہیئے۔ اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی یا کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر انکو کیوں نہ رکھ لیا جاوے۔ اس کشاکشی میں میں نہیں سمجھتا۔ کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم مہلکہ سے بچالے۔ پس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے۔ وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا۔ البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے۔ وہ اس سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا۔ اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا نہ پڑا۔ تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا۔ اسی طرح سے ایک اور جزئی یاد آئی کہ میرے پاس اکثر الیٹے کنٹ

آجاتے ہیں کہ ڈاک خانہ کی مہر سے بالکل نیچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں ان کو استعمال
کرلوں تو کوئی بھی بازپرس نہیں کرسکتا۔ کیونکہ نہ میرے پاس ڈاک خانہ والے ہوتے
ہیں۔ نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے۔ لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے
اول ان ہی کو چاک کرکے پھینک دیتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں۔ علی ہذا اگر روز
مرّہ کے واقعات کو دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت
جب ہی ہوسکتی ہے۔ جب دل میں خدا کا خوف ہو۔ یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی
ورنہ غور سے معلوم ہوگا۔ کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبداء و معاد کا
معتقد ہو۔ اس کی تفصیل کیلئے رسالہ مآل التہذیب دیکھنے کے قابل ہے۔ اس میں
دکھلایا ہے کہ اس مخترع تہذیب کا مآل دنیا ہی میں ہونے والا ہے۔ انہوں نے ایک
ایک مفسدہ کو لکھا ہے اور ختم پر ہر جگہ یہ کہدیتے ہیں فویل یومئذ للمہذبین۔ غرض
امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے۔ جب اخلاق درست ہوں۔ اور اخلاق
کی کامل درستی جب ہی ہوسکتی ہے۔ کہ عقائد درست ہوں اب اعمال کا دخل لیجئے۔
یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کرلینے سے ثابت ہوجائیگا۔ سب کو معلوم ہے
کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے
کیونکہ فساد کا مبنیٰ ہے نااتفاقی اور نااتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر تکبر نہ ہو
اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نااتفاقی کی کوئی وجہ نہیں۔ تو اتفاق
کیلئے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے۔ اور اس تواضع کی
عادت نماز سے خوب ہوتی ہے۔ نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اسکو ذلت نہ
سکھلائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہوتی ہے۔ اور نماز میں اول سے ہی اللہ اکبر
کی تعلیم ہے۔ تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہیگا۔ اور جوارح
سے رکوع اور سجدہ کریگا۔ زمین پر پیشانی رکھیگا وہ کیونکر اپنے کو بڑا سمجھیگا۔ اگر کچھ ہو
اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا نہ سمجھیگا۔ لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے
کی کوئی وجہ نہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ ناتجربہ کاری کا اعتراض ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار

اپنے جونش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو۔ اور اچانک لفٹنٹ گورنر آ جائے۔ تو خود اُن کے ذہن میں بھی وحدانا سب اختیارات مسلوب سے ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہدیتا ہے۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے گولی ماردی۔ تو جس کے دلمیں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو چیونٹی سے بھی مغلوب اور ناتوان سمجھے گا۔ کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے۔ چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی تو اللہ اکبر کی وہ تعلیم ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نااتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے۔ علی ہذا قوت بہیمیہ سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزہ سے قوت بہیمیہ ٹوٹتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ سے لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والیکے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ دیکھو حاتم طائی سے بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنی یہی محبت ہے۔ تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔ علیٰ ہذا حج پر غور کیجیے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں ایک زمانہ میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں۔ اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق واتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجمعوں میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی۔ بہت سی واردات ہو جاتی ہیں۔ اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔ البتہ اکثر لوگ شاید بدوؤں کے شاکی ہوں گے۔ سو اصل میں انکا مقصود سلب وقتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں ان کی حالت بالکل یہاں کے گاڑیبانوں کی سی ہے۔ کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دیدیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھیے کیسے پیر پھیلاتے ہیں۔ ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کی جائے۔ ان کو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دے دیا جائے تو وہ بہت آرام پہنچاتے ہیں اور یہ جو سننے میں آتا ہے کہ بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں۔ تو اول تو ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اور اگر ہوتا بھی ہے

عہ الحمد للہ کہ سلطان کے حسن انتظام کی وجہ سے آجکل بدوؤں کی یہ تمام شکایتیں رفع ہو گئی ہیں۔ علی محمد۔

تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں۔ بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ بہلے
رہتے ہیں۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اُس وقت جبکہ خود اپنی حفاظت نہ کرے
کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے۔ غرض حج کو اتفاق وامن میں بہت بڑا دخل ہے۔ جس
کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال حج از سرتاپا تواضع سے پر ہیں۔ اب رہی معاشرت۔ سو تامل سے
معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں۔ وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر
ٹپکتا ہے مثلاً ناجائز وضع سے شریعت نے منع کیا ہے۔ سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں۔ ان
سب میں تکبر ہے۔ جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں۔ وہ غور کریں۔ کہ اس وقت
اُن کے دل کی کیا حالت ہے۔ اور اس حالت کو یاد رکھیں۔ اور پھر ایک ہفتہ شریعت
کے موافق وضع لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں۔ تو ان کو زمین و آسمان کا فرق
معلوم ہوگا۔ یہ تو سمجھ میں آنیوالی تقریر ہے۔ ایک دوسری تقریر اور ہے۔ جو ان تینوں
میں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے۔ پس اس طرح اعمال میں بھی
ایک خاصیت ہے۔ اور عقائد میں بھی اور معاشرت میں بھی۔ اور وہ یہ کہ ان سب سے
قلب میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے اور اس سوز سے اس کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ۔

اب میں ایک اور بات کہتا ہوں۔ جو تمام اجزاء دین کو عام ہے۔ وہ یہ کہ دین کی
یہ غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو۔ بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے۔ اور جب
خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمالیں گے
من یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب۔ پس دین کی دوستی
کو اس طرح دنیا کی دوستی میں دخل ہوا۔ مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی
ہوگا تو دنیا کے کام بنیں گے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ:

دلارامی کہ داری کہ دل در وبند		دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور جو مصلحتیں سامنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ:

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار		بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار	کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا۔ مگر حاصل ضرور ہوگی۔ وفادار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے اور کوئی کام اُس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اسکو خودغرض اور خودکام کہا جائیگا۔ پھر آقا اپنے کرم سے خود ہی اسکی مصلحتوں کی رعایت فرمائیگا۔ اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے۔ کہ کسی کے حکم کے تابع رہے۔ چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچتا رہے۔ تو کام کچھ نہ کر سکیگا۔

میں نے تین تقریریں کیں۔ ہر تقریر سے یہ ثابت ہوگیا۔ کہ دین کو طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے۔ اور یہ تین تقریریں اس لئے کیں کہ مذاق مختلف ہیں۔ یہ قواعد دینیہ کی خوبی ہے کہ اُن سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہوگیا۔ تو دین گویا اس شعر کا مذاق ہی ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد	برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھ لو۔ پرکھا لو۔ الحمد للہ یہ بات ثابت ہوگئی۔ کہ امن کی صورت ہے۔ تو احکام خداوندی کی پابندی سے ہے (ضرورۃ العلماء صفحہ ۲۳)

(۱۳) اس اعتراض کا جواب کہ دین میں تنگی و دشواری ہے

اسکے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اور یہ دشوار ہے اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہی۔ تو اسلام میں کونسی دشواری ہے۔ آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے۔ خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں۔ اور ان کا وقت دس بجے ہے۔ تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی۔ ضرور ہوتی ہے۔ اور اس وقت کہتے ہیں۔ کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے۔ مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی نہ چھوڑ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی۔ اس میں دشواری ضرور ہوگی۔ تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے۔ تو

تسلیم ہے۔ بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں۔ لاتتبعوا الھوی اور اس سے صاف
انها لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔ غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے۔ مگر اس میں اسلام کی
کیا تخصیص ہے۔ یہ تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے۔ کوئی اپاہجوں سے پوچھے
خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔ مشہور ہے کہ
واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے۔ ان میں باری اس طرح تھی۔ کہ ایک لیٹا ہوا
آرام کرے۔ دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا۔ ایک
بیٹھا ہوا۔ ایک سوار اُدھر سے گذرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو
میرے سینہ پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈالدو۔ اس کو اس آرام طلبی سے سخت حیرت
ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے۔ اس سے
اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں
ڈالدے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا۔ کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہوجاوے گی۔ آپکو
کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا۔ مجکو جو جمائی آئی اس سے مُنہ
کھل گیا۔ ایک کتا آکر مُنہ میں موتنے لگا۔ یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا۔ اور اس سے اتنا نہ ہوا
کہ کتے کو ہٹادے۔ میں ضرور اس کے منہ میں بیر دونگا۔ سوار حیرت میں غرق ہوگیا۔ اور
لاحول پڑھتا ہوا چلدیا۔ تو حضرت اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے۔ ہمارے
عزیز دو بھائی ہیں۔ ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے
ہیں۔ اور چھوٹے سے کہتے ہیں۔ کہ میرے منہ میں لقمے دیکر مجھ کو کھانا کھلا۔ تو ایسی نظریں
بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی
اور قانونی پابندیاں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ۔ اور ڈکیتی نہ ڈالو۔ مگر
اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے۔
اس لئے آپکو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا۔ اور رشوت لینا مقصود ہے
اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں اُن سے کوئی پوچھے
اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک جماعت بیہودوں کی ایسی بھی

ہے کہ اُن کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو۔ حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے۔ مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ پھر اسلام ہی پر کون اعتراض ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور یہ سختی نہیں۔ مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے۔ تو واقعی یہ دشواری ہے۔ مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔ اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کیخلاف ہے۔ تو حقیقت میں۔ اس میں تلبیس ہوئی ہے۔ قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہوجاوے۔ کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھاوے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے۔ کہ اگر سب عمل کرنیکا ارادہ کریں تب بھی تو تکلیف ہو۔ اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے۔ کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں۔ تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے۔ لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجائے۔ وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کرینگے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی۔ کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے۔ تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے۔ بلکہ اس سختی کا منشا ان باغیوں کی بغاوت ہے۔ مثلاً کوئی ایسی جگہ پہنچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہنچکر کوئی چیز خریدے اور دام دیدے۔ پھر اس سے کہا جائے۔ کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لیکر پوری چیز دیدو۔ مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے۔ اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہئے کہ یہ دشواری قانون کی ہے۔ یا ان بدمعاشوں کی بدمعاشی۔ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو بُرا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے۔ وہ دشواری یہ ہے۔ جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے۔ کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنیکے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر سچاس قباحتیں بھی آجاویں۔ جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی

ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہی کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی۔ اب جس کے پاس جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ۔ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کو اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد	ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

مثنوی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا میں تمہارے راتب کیلئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا۔ اور مجھ سے چھین لیا۔ شیر کو غصہ آیا۔ کہ بتلاوہ کہاں ہے۔ اُس نے ایک کنوئیں پر لیجا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا۔ بس شیر اس کنوئیں میں جا کودا۔ اندر پہنچکر معلوم ہوا۔ کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا۔ مولانا اس کو فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد	ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اسی طرح ہمکو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔ اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا اس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا۔ تب ہی تو کوئی تجھکو راستہ میں پھینک گیا۔ ایک اور احمق کی حکایت ہی۔ کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا۔ لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا۔ جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی۔ سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے۔ باپ سے کہا۔ ابا اس نے یہ میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھیننے اُٹھے۔ جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل نظر پڑی۔ بولے کہ لعنت خدا کی بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ تف ہے تیری اوقات پر۔ سو وہ کس کو تف کہہ رہے تھے۔ اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا۔ اور وہ تنگی اپنی صفت تھی۔ اسکو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سختی کی اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں۔ کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے۔ اور بہت شفیق بھی ہے۔ مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی۔ اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا۔ کہ صاحب کھاؤں گیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک۔ وہ بولا یہ تو ملتا نہیں۔

کہا مونگ کی دال - کہا یہ بھی نہیں ملتی - کہا فیرینی - کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے - پھر خود پوچھا
بیگن کھالوں - کہا ہرگز نہ کھانا - کریلہ کو پوچھا - اسکو بھی منع کیا - آلو سے بھی روک دیا - تو
دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں - طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا تو
یہی ہے - دیہاتی نے باہر آکر کہا - کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں - کہ یہ بھی نہ کھاؤ - وہ بھی
نہ کھاؤ - تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے - یا یہ کہا جاویگا - کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں
کی سب کی اجازت دیدی - لیکن وہ مقام ایسا کوردہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا
ہی نہیں - تو یہ طب کی تنگی تو نہیں - اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے -
اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر دیکھیے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں -
اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت بجوز کہے گی - اور پانچ کو لا یجوز - لیکن اگر آپ کے
ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں - اور بیس کو متروک کر دیں - تو یہ تنگی معاشرت
کی ہوئی - یا قانون شریعت کی - پس یہ الزام تو بحمد اللہ بوجہ احسن واکمل رفع ہو گیا - اور
اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو - تو علم دین پڑھیے - اس سے معلوم ہو گا - کہ شریعت نے ابواب
معاش میں کس قدر توسیع کی ہے - اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے - اس میں جی چاہتا
ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آگیا - کہ شریعت میں تو دشواری
نہیں - مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے - جو
شریعت پر عمل نہیں کرتے - عارضی دشواری تو ہو گئی - تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچ گیا
البتہ اعتقاد درست ہو گیا - کہ شریعت میں دشواری نہیں - مگر عمل کس طرح سے کریں -
کیا لین دین چھوڑ دیں - کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز - معاملات اکثر ناجائز - تجارت اکثر ناجائز
تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے - سو اس کے متعلق بھی سُن لیجیے - اس میں قدرے تفصیل
ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام
حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے - غیر مسلم ہے - سمجھیے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک
وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے - اور ایک وہ کہ اُن کی
اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں - مثلاً وضع شریعت کیموافق بنائیے - نماز

روزہ رکھے۔ حج کرے۔ تکبر نہ کرے۔ باجا گاجا چھوڑ دے۔ تو بتلائیے۔ اس میں معاش کا کیا نقصان ہے۔ تو اس میں تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے۔ پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جاویں گے۔ کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں۔ کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اسمیں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی۔ تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ سے اُمید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں۔ درست فرما دیں گے۔ جیسے ایک شعلہ جوالہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے۔ اور بڑی قوس ظلمانی۔ مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے۔ جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے۔ پس اگر ہم یہ کہیں۔ کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے۔ کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے۔ تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں۔ کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے۔ ہمنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اُٹھا نہیں جاتا۔ مگر نماز کیوقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

ہر چند کہ پیر خستہ و بس ناتواں شدم	ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

اُن کی خدمت میں جب جی چاہے۔ جا کر دیکھ لیجئے۔ غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا۔ کہ ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مگر جب قوت ہو گی تو تمام موانع مضمحل ہو جاویں گے۔ اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جاوے۔ یہ تدبیر بھی نہ کرے۔ تو دوسری بات ہے۔ جیسے کسی نے یہ سُن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے۔ کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔ یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی۔ تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاویگی کہ اس معصیت کی ندمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جاویگی

اور اس سے نفرت پیدا ہوجاویگی۔ اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کردیگی۔ اور آخری بات یہ ہے۔ کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے۔ اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے۔ اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں۔ مگر ایک نہیں ٹل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہیگا کہ جواب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔ اب وہ حصہ رہ گیا۔ جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے۔ تو اول تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں۔ اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ تھوڑے تغیر سے وہ ناجائز ہو جاوے گا۔ مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی۔ تو اس میں مسئلہ یہ ہے۔ کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو۔ تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اب اگر کہے کہ صاحب اچھا مسئلہ کہ نرخ کے حساب سے تو سو روپے کی چاندی ایک سو بیس بھر آتی۔ مگر اب سو روپے کی سو ہی روپے بھر ملی۔ اچھا عمل کیا۔ کہ بیس روپے کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کیلئے مولویوں کو خیرباد کہدیں گے۔ تو سُنئے بات یہ ہے۔ کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے۔ کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے۔ تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا۔ کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے۔ تو مولوی صاحب یوں کہتے۔ کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملالو۔ تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آویگی۔ تو پچاس روپے بھر تو پچاس روپے کی آویگی اور باقی کی اس گنی میں شریعت محسوب کریگی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شریعت خود فیصلہ کرچکی ہے۔ تو اب بتلائیے کیا نقصان ہوا۔ اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں۔ صاحبو! پوچھتے تو رہو۔ اور میں یہ تو نہیں کہتا۔ کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہدیں گے۔ کیونکہ شریعت اُن کے گھر کی تو ہے نہیں۔ کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے۔ جائز کردیں۔ جیسا کہ ایک مطوف سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھککر کہا تھا۔ کہ مولوی صاحب! بتو معاف کردو۔ اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے

ہیں ۔ کہ علمار ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے لگیں ۔ ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے
کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے ۔ سب جائز ہے ۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں ۔ علمار
سے ۔ جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا ۔ کہ جو ہماری زبان سے نکلے ۔ تم اس
کی تصدیق کر کے توجیہہ کر دیا کرو ۔ چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے نکلا ۔ کہ ہم شکار
کو گئے ۔ ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اُسکے سم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی ۔ سب اہل مجلس
ہنسنے لگے کہ سم اور ماتھے کا کیا جوڑ ۔ نوکر بولا سچ ہے ۔ حضور وہ اس وقت سم سے پیشانی
کھجلا رہا تھا ۔ تو حضور علمار سے تو ایسی نوکری ہوتی نہیں ۔ نہ ہم اتنے ذہین ہیں ۔ اور نہ خدا
کرے کہ ہوں ۔ تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا ۔ کہ سب کو جائز کہدیں ۔ مگر پوچھکر دیکھو تو
بہت سے اشکالات کا جواب مل جاویگا ۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا
اس طرح ختم ہو جاویگا ۔ ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جاویں گے ۔ کہ وہ بالکل ناجائز
ہونگے ۔ مگر اس میں بھی دو درجے ہیں ۔ ایک تو وہ کہ اسکو چھوڑ کر ۔ دوسرے کام میں لگ
سکتے ہیں ۔ پس اسکو تو چھوڑ دیا جاوے ۔ کیونکہ اس کا چھوڑنا مضر حوائج ضروریہ نہیں اور
ایک وہ درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے ۔ کیونکہ دوسرے کام اس کے حوائج ضروریہ کو
کافی نہیں ۔ تو بادل ناخواستہ اس کو کرتے رہو ۔ اور گو یہ جائز تو نہ ہونگے ۔ مگر اسکے متعلق ایک
دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جاوینگے ۔ اور یہ کہ اس میں
دو برتاؤ کرنے چاہئیں ۔ ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے ۔ ابتو یہ غضب ہے کہ لوگ
توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے ۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا ۔ اس پر پچھتایئے ۔ اور دعا
کیجئے کہ اے اللہ مجھے معاف فرمایئے ۔ مواخذہ نہ کیجئے ۔ تو یہ کیوں نہیں کرتے ۔ کیا ایسا کرنے
سے نوکری سے موقوف ہو جاؤ گے ۔ ہرگز نہیں ۔ بلکہ تم نوکر ہی رہو گے ۔ دوسرے یہ دعا
کیا کرو ۔ کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل میرے لئے نکالدیجئے ۔ تو اس میں یا تو کوئی سبیل
نکلے گی اور جو کوئی دوسری سبیل نہ نکلی ۔ تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو
لکھا جاویگا ۔ جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاویگا ۔ اور یہ توسیع آپ میری ہی
زبان سے سنیں گے ۔ اور توسیع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جائے

توشاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جاوے۔ مثلاً یہی کہ
چلو اگر یہ نہیں تو یہ توسع این بلا دفع بلاہائے بزرگ کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہا
ہوں۔ کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے۔ تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے۔ ہمارے
حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں
دعا کرانے آیا کرتے تھے۔ کہ مجھپر ایک شخص نے جائداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔
حضرت دعا فرما دیتے۔ ایک بار آ کر کہنے لگے۔ کہ اب تو اُس نے حد ہی کر دی اور جائداد
غصب ہی کرنے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو۔ اُس نے کہا بہت اچھا۔ دفعۃً
حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا۔ ہرگز صبر مت کرنا
جاؤ نالش کرو اور ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت سے فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے سب
چھوڑ کر بیٹھ رہے۔ اس میں تو اتنی قوت نہیں۔ یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دیگا۔ تو جب
حاجت ستاوے گی۔ یہ جھوٹی گواہی دیگا۔ چوری کریگا۔ تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا
کرتے۔ تو یہ ہے اصل راز اس توسع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجایش نہ سنیں گے۔ مگر یہ
اس لئے ظاہر کر دیا گیا۔ کہ کفر سے بچانا ہے۔ لیکن خدا کیلئے اس کو آپ تمام معاصی میں
آڑ نہ بنا لیں کہ یہ خبر تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے
سب معاصی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اسمیں یہ بھی قید لگی ہوئی ہے کہ
اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو۔ جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہو اور تقاضا نکلنے
کا رہتا ہے۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے
ہوئے تھے۔ اور کہیں جگہ نہ تھی۔ مگر اُنھوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ اور
کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے۔ آخر ضرورت سے پائخانہ میں گئے۔ تو چٹخنی لگ گئی۔ اور
اُن کے کھولنے سے نہ کھلی۔ بڑے پریشان ہوئے۔ لوگوں سے التجا کی سب نے انکار
کر دیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دو سروں کو تنگ نہ کرنیکی قسم کھلائی۔ یہ بھی
نہ دیکھا کہ یہ پائخانہ میں ہے۔ اس میں قسم کھلانا جائز نہیں۔ تو جس طرح وہ پائخانہ سے نکلنے
کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو۔ کیا کوئی پائخانہ میں جا کر

فخر کرتا ہے۔ بلکہ قید سمجھتے ہیں۔ مگر مجبوری ہیں کیا کریں۔ بس اس کی یہ حالت ہوئی ہے

چوں کشاید چابک و برجستہ باش	چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش

تو نکلنے کی تو فکر کرو۔ کوشش تو کرو۔ گو کچھ اُمید نہ بھی ہو۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

خیرہ یوسف وار میباید دوید	گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید

یوسف علیہ السلام کا قصہ یہ ہوا۔ کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کر لیا اور آپ نکلنے کیلئے دوڑے ہیں عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اسکو فرماتے ہیں کہ گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید۔ خیرہ یوسف وار میباید دوید۔ اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے۔ کہ یہ تو دوڑا ٹکر بھی لگ گئی۔ اتنے پر بھی فضل ہوجاویگا۔ اب تبلائیے اس میں کونسی چیز مشکل ہے۔ میں تو نوکری نہیں چھڑاتا۔ مگر نفور رہیں۔ سو یہ کیا مشکل ہے۔ ابتو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے۔ بیباکی ہے۔ سو یہ فخر کیسا۔ اور تبختر کیسا۔ اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے۔ سو اہلِ اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا۔ مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجایش ہوسکتی ہے۔ تو اب کونسا مرتبہ اختلاف کا رہگیا اول تو تو دشوار ہی نہیں اور قانون سخت نہیں۔ صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہوجاتی ہے۔ تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں۔ اور جو مخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہوسکتا ہے۔ اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہوسکے۔ وہ اولاً بہت مختصر۔ ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پچھتانا اور توبہ کرتے رہنا۔ تو اب وہ کونسا جزو ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے۔ تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہوگیا کہ ما جعل اللہ علیکم فی الدین من حرج (الآیۃ) نفی الحرج ص۱۸

(۱۴) ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا غلطی ہے

دلائل شرعیہ چار ہیں۔ کتاب۱ سنت۲۔ اجماع۳۔ و قیاس۴۔ جو ان دلائل چہارگانہ میں سے

کہا مونگ کی دال - کہا یہ بھی نہیں ملتی - کہا فیرینی - کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے - پھر خود پوچھا بینگن کھالوں - کہا ہرگز نہ کھانا - کریلہ کو پوچھا اسکو بھی منع کیا - آلو سے بھی روک دیا - تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں - طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا تو یہی ہے - دیہاتی نے باہر آکر کہا - کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں - کہ یہ بھی نہ کھاؤ - وہ بھی نہ کھاؤ - تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے - یا یہ کہا جاویگا - کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی سب کی اجازت دیدی - لیکن وہ مقام ایسا کور دہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں - تو یہ طب کی تنگی تو نہیں - اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے - اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں - اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت بجوز کہے گی - اور پانچ کو لا یجوز - لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں - اور بیس کو متروک کردیں - تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی - یا قانون شریعت کی - پس یہ الزام تو بحمد اللہ بوجہ احسن واکمل رفع ہو گیا - اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو - تو علم دین پڑھئے - اس سے معلوم ہوگا - کہ شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسیع کی ہے - اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے - اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آگیا - کہ شریعت میں تو دشواری نہیں - مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے - جو شریعت پر عمل نہیں کرتے - عارضی دشواری تو ہو گئی - تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچا البتہ اعتقاد درست ہو گیا - کہ شریعت میں دشواری نہیں - مگر عمل کس طرح سے کریں - کیا لین دین چھوڑ دیں - کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز - معاملات اکثر ناجائز - تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے - سو اس کے متعلق بھی سُن لیجئے - اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے - غیر مسلم ہے - سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے - اور ایک وہ کہ اُن کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں - مثلاً وضع شریعت کیموافق بنائیے - نماز

بہر حال حسبًا بالغ ہو یا نہ ہو۔ روحًا بالغ نہیں ہے۔ بلکہ حسبًا بھی ہمکو تو ایسے لوگ بالغ نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیئے کہ ظاہری علامت بلوغ کی ڈاڑھی تھی اور وہی صفاچٹ ہی معلوم بھی نہیں ہوتی کہ نکلی ہے یا نہیں۔ بہر حال ایسے لوگ جن کی یہ حالت ہو کہ علوم دین کی ان کو ہوا تک نہیں لگی۔ وہ دلائل کا مطالعہ کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے اندر ایک دعویٰ مضمر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں کہ شریعت میں قرآن شریف کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم اس دعوی پر ان سے اول دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم کو یہ سمجھا دو کہ شریعت میں قرآن شریف ہی دلیل ہی۔ اور کوئی دلیل نہیں۔ خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ علاوہ قرآن شریف کے اور بھی دلائل ہیں۔ فرماتے ہیں وما آتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اگرچہ وہ قرآن نہ ہو مثل قرآن شریف کے حجت ہے۔ اور کیوں نہ ہو ما ینطق عن الھویٰ آپ کی شان ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود	گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اور فرماتے ہیں ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جھنم۔ اس آیت شریف سے اجماع امت کا حجت ہونا معلوم ہوا اور فرماتے ہیں ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم اور فرماتے ہیں فاعتبروا یا اولی الابصار۔ یہ آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیاس بھی حجت ہے۔ پس اگر آپ قرآن شریف کو حجت مطلقہ مانتے ہیں۔ تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بعض دعاوی مسموع اور حجت اور بعض نا مسموع۔ غرض یہ سخت غلطی ہے۔ دیکھیئے عدالت میں دعوی کی سماعت کیلئے شہادت مطلقہ کی ضرورت ہے مدعی اگر دو با وجاہت آدمیوں کو پیش کردے۔ تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں جج صاحب اور فلاں مولوی صاحب گواہی دیں گے تو مانوں گا۔ اور اگر وہ ایسا کہے تو حاکم ہرگز نہ سنے گا اور یہ کہے گا کہ تم ان گواہوں میں جرح کرو۔ تو اس کی طرف التفات ہوگا۔ لیکن اگر جرح نہیں تو تمہاری یہ تخصیص کہ فلاں فلاں اشخاص گواہی دیں ایک لغویات ہوگی۔ اسی

طرح مسئلہ عقلیہ ہے کہ دعوے کے اثبات کیلئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے مستدل جس دلیل کو چاہے اختیار کرے۔ مخاطب کو یہ اختیار ہے کہ اس میں جرح کرے۔ اس کا جواب بذمہ مدعی ہوگا۔ لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے یہ دلیل کیوں اختیار نہ کی۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ شرعیہ کے اثبات کیلئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے۔ جو ادلۂ اربعہ میں سے ہو۔ کسی خاص دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کا لحاظ ضروری ہے کہ قطعی دعوے کیلئے قطعی دلیل اور ظنی دعوئی کیلئے ظنی دلیل ہونا چاہئے۔ جس کی تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے۔ غرض ایک تو غلطی یہ ہے اور دوسرے اس کے مقابل یہ ہے۔ کہ ان چاروں سے گذر کر نرے ظن کو ہی حجت سمجھا جائے کہ نرا گمان بھی کسی مسئلہ کا مثبت نہیں ہے۔ بلکہ دلیل صحیح ادلہ اربعہ میں سے ہونا ضروری ہے
(حصہ ششم دعوات عبدیت وعظ الغار المجازفہ ص ۱۲۱)

(۱۵) آزادی کے معنی

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے۔ کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے۔ کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا۔ مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے۔ آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لیگئے۔ حضرت عمرؓ کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے۔ کہ خلاف حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا۔ اس لئے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا۔ لیکن آپ نے تین گناہ کئے۔ ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستأنسوا وتسلموا علیٰ اھلھا۔ دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا۔ اور قرآن شریف میں تجسس کی ممانعت ہے لا تجسسوا۔ تیسرا یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔ لیس البر بان تاتوا البیوت من ظھورھا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں۔ تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کرلو۔ آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ کہ آزادی ان حضرات میں تھی۔ یا آج کے مدعیان آزادی میں بہائم کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے۔ کھالیا اور ہوا پرستی میں عمر گذار دی۔ صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں۔ یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا۔ اور مطلق العنانی ہے۔ یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے۔ کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا۔ جدھر چاہا چلدیا۔ جو چاہا کرلیا تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب نعم ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے یہی لقب لیجئے۔ اور اگر لا میں جواب ہے۔ تو پھر ذرا مہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق بتایئے (نسیان النفس ص۱۸)

(۱۶) اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا

اہل حق اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریر میں جو فرق میں نے سمجھا۔ وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں نہایت وقیع اور مؤثر ہوتی ہیں۔ اور حق انہیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو ان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے۔ اور ان کا لچر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور پر تلمیع ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی تقریریں نظر اول میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے۔ تو انکی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اور قلب پر نہایت گہرا اثر اُن کا ہوتا ہے کہ اُسکے سامنے تمام تلمیعات قلب سے دھل جاتی ہیں۔ یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آجکل کے علماء پر منجملہ دوسرے اعتراضات کے وہ بھی کیا جاتا ہے۔ کہ ان کو لیکچر دینا نہیں آتا۔ وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن شریف اور حدیث شریف ہے۔ اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آمیزش تاب کی کیا ضرورت ہے۔ خوب کہا ہے ؎

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست	باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

ہمیں لیکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لیکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے ۔ وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ۔ ہمکو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے ۔ نحن امۃ امیۃ ۔ امیۃ کے معنی سادگی کے ہیں ۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اصل مرضی یہ ہے ۔ کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے ۔ اسی لئے آپ نے لفظ نحن فرماکر ساری امت کو شامل فرمالیا ۔ یہی روح ہے اتباع نبوی کی ۔ کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو ۔ امیۃ ام کی طرف منسوب ہے مطلب یہ ہی کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونیکے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے ۔ کہ اس کی کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی ۔ بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے ۔ اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو اُن سے محبت ہوتی ہے ۔ ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہیے تھی ۔ اور یہی بے ساختگی ہے ۔ کہ جن بوڑھوں میں یہ پائی جاتی ہے ۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین اُن پر جان فدا کرتے ہیں ۔ تو اصلی مفہوم امیۃ کا یہی بے ساختگی ہے ۔ اور نہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے ۔ یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے ۔ تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہیئے ۔ اور تلبیس اور تلبیع سے بالکل پاک ہونا چاہیئے ۔ البتہ بیان میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جاتا ہے ۔ ہم اہلِ علم کو دیکھتے ہیں ۔ کہ ان میں ایک نو رواج زبان کا طرز آتا جاتا ہے ۔ حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہیئے ۔ کہ ہماری مادری زبان اُردو ہے ۔ اور اس کی کچھ خصوصیات ہیں ۔ جیسا کہ ہر زبان کیلئے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں ۔ اب اس طرز جدید کو اختیار کرکے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اُردو میں لے لیا گیا ہے ۔ اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں ۔ حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتی ۔ ان کی بدولت زبان بالکل بھدی اور خراب ہوتی جاتی ہے ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اُردو کا حامی کہتی ہے ۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اُردو کے ماحی ہیں ۔ کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے

اور ایک ہیئت۔ اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ نہ کہ صرف مادہ کا۔ تو جب زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہے گی۔ تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی۔ پس اگر ہم اُردو کے حامی ہیں۔ تو ہم کو چاہیئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں۔ اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے۔ کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے۔ اور نہ انگریزی طرز سے ہمکو مناسبت ہے۔ اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے۔ کہ اس وقت عربی خواں طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں۔ حالانکہ انکی تقریریں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے۔ تو عربی کے الفاظ آتے۔ کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے۔ اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے۔ اور اُردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی اور پدری زبان عربی ہی ہے۔ کیونکہ ہمارے آباواجداد عرب ہی سے آئے ہیں۔ اور ہندوستان میں بودوباش اختیار کرلی ہے۔ غرض جب ہماری اصلی زبان عربی ہے۔ تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا۔ تو اس بنا پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کردیتے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اُردو ہونے ہی سے نکل گئی۔ اصل اردو زبان وہ ہے۔ جیسے چہار درویش یا اُردوئے معلےٰ غالب کی۔ اگر اس میں آمیزش ہو۔ تو عربی کی آمیزش ہونا چاہیئے۔ کہ عربی کی آمیزش لطف کو دوبالا کردیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجاتا ہے۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گلفشانی ہوگئی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے خلط سے ایک جدت پیدا ہوگئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے۔ اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہوسکتی ہے اور پُرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور یہ مشابہت خود حرام ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ مَن تشبہ بقوم فھو منھم۔ کیونکہ تشبہ عام ہے۔ لباس اور طرز سب چیزوں کو۔ اور گو

ممکن ہے کہ اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن ہم کو اس کی اصلا پروا نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر اُن کے مسلّم دلائل سے اس کا بُرا ہونا ثابت کر چکے ہیں۔ باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کیلئے بڑھی ہے۔ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے۔ کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔ غرض اس وقت تقریرات میں یہ تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں۔ جن سے بہ سبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کالعدم سمجھا جائے گا۔ پس ثابت ہوگیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلق انسان پر اسی طرح اس کا وجود شرعی موقوف ہے۔ تعلیم قرآن پر اور یہی حاصل ہے ان آیات کا اور چونکہ تقاریر میں آجکل یہ نقص عام طور سے پیدا ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ جی بھی چاہتا تھا۔ کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کی جائے کہ قرآن شریف ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہو جاوے۔ سو بحمد اللہ یہ آیت الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان علیٰ کہ اس میں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور ہے۔ کہ قرآن شریف سکھلایا۔ کیونکہ غایت اس کی عمل ہے۔ اور بیان میں اگر حدود شرعی کا لحاظ نہ رہا۔ تو قرآن پر عمل نہ ہوا۔ کیونکہ عمل بالقرآن کے فوت ہونیکے معنی یہی شریعت کا فوت ہونا ہے (تعلیم البیان صؔ)

(۱۷) غلط ہونا اس خیال کا کہ ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں

بعضے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور شریعت اسلام کو تہذیب سے معرا سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک یک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی میں گیا۔ سیر کیلئے چاندنی چوک میں نکلا۔ اتفاق سے آپکی گردن بھی نہ مڑ سکتی تھی۔ اس لئے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دوکانیں نظر آئیں۔ دوسری جانب کی نظر نہ آئیں۔ جب وہاں سے واپس ہونے لگا۔ تو دوسری جانب کی

ؔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی مرد زنانہ جوڑا پہنکر زنانے میں آبیٹھے تو اسکو معیوب کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اس نے بجز تشبہ کے کسی جرم کا کونسا ارتکاب کیا ہے۔

دو دکانیں نظر آئیں۔ ان کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں۔ کہ دلی کے لوگ بھی کیا ستم کے لوگ ہیں ابھی یہ دو دکانیں داہنی جانب تھیں۔ ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھدیا۔ تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اس لئے وہ محتاج سمجھتے ہیں۔ ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے۔ چندروز ذرا اگر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خونخوار بتلایا جارہا ہے۔ وہ کیسی دلفریب ہے۔ جب اس کی حقیقت سے واقف ہو گے تو اس پر عاشق ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کرو۔ دل کھنچا چلا جاتا ہے (مضار المعصیت صلا)

(۱۸) اس شبہ کا جواب کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم امریکہ میں تو تشریف نہیں لے گئے تو پھر حضور کی بعثت عام کیسے ہوئی

ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہ سوال کیا۔ کہ یہ تو ہمارا اعتقاد ہے کہ جناب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام ہے۔ لیکن یہ خلجان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ اور نہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھیجا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا۔ تو ضرور کہیں منقول ہوتا۔ حالانکہ منقول نہیں نیز امریکہ کا حال بہت بعد میں معلوم ہوا ہے۔ کہ ایک جہاز غلط رستے پر ہو لیا تھا اور وہ وہاں پہنچگیا۔ اور اس کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔ جب وہاں آپکی دعوت نہیں پہنچی تو نبوت عام کیسے ہوئی۔ جواب میں فرمایا کہ بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ بعثت کے عام ہونیکے معنی یہ ہیں۔ کہ جب کبھی جس کسی کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے۔ تو وہ کافر ہے اور یہ معنی نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہو گئی تھی اس تقریر کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہنچی اسی

وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہونگے (مجادلات معدلت و دعوات عبدیت حصہ پنجم ملفوظ ۴۲)

(۱۹) اس شبہ کا جواب کہ جب انسان کی تقدیر میں خدا تعالیٰ نے یہ لکھدیا کہ وہ فلاں گناہ کرے گا۔ تو اس میں انسان اس فعل کے کرنے میں مجبور ہے

فرمایا کہ یہ مجبوری عمل کرنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ یعنی جب گناہ کر چکا اُس وقت خبر ہوئی کہ یہ گناہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے قبل جب گناہ کیا ہے۔ اس کی خبر نہ تھی۔ اور اگر کہا جائے۔ کہ گو اس کو علم تقدیر کا نہ تھا۔ مگر واقع میں تو علم الٰہی اس کیمتعلق تھا اور اس کا خلاف محال ہے۔ تو اس طرح واقعہ میں مجبور ہوا۔ اب جواب یہ ہے۔ کہ علم الٰہی اس طرح تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے ایسا کرے گا۔ تو اختیار منفی ہوا۔ یا اور مؤکد ہوگیا۔ پھر سوال کیا گیا۔ کہ اگرچہ انسان کا مجبور ہونا لازم نہیں آتا۔ لیکن خدائے تعالیٰ رحیم ہیں۔ اسلیئے اگر اپنی رحمت سے ہوائے نفسانی کو پیدا ہی نہ کرتے تو انسان کیلئے بہتر ہوتا۔ اس پر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں۔ ازاں جملہ ایک صفت حکیم ہونا بھی ہے اور ہر صفت کا ایک خاص ظہور ہے۔ پس جس طرح ہوائے نفسانی وغیرہ کا پیدا نہ ہونا مقتضائے رحمت ہے۔ اُسی طرح ان کا پیدا ہونا مقتضائے حکمت ہے رہا یہ سوال کہ وہ حکمت کیا ہے۔ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ہم کو اس حکمت کی اطلاع نہیں ہے اور فرمایا کہ یہ جواب کم فہموں کے نزدیک زبردستی کا جواب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصل جواب یہی ہے۔ البتہ اس جواب کی حقیقت سمجھنے کیلئے اس کے قبل چند مقدمات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جبتک وہ سمجھ میں نہ آئیں اُس وقت تک اُس کی حقیقت سمجھنی مشکل ہے۔ اور اُس وقت تک یہ زبردستی کا جواب نظر آتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جب انسان کے ہر عمل میں اختیار کا سلسلہ امور غیر اختیاریہ تک پہنچتا ہے۔ جس سے اہل سائنس بھی انکار نہیں کرتے اور بنار تقدیر یہی امر ہے۔ جیسا اوپر بیان ہوا۔ تو اہلِ طبیعات کو تو تقدیر کا ضرور ہی قائل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ لوگ تو اس مسئلہ انتہاء الاختیار الی غیر الاختیاری کو اس حد تک مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے افعال اختیاری کو بھی اس قاعدہ کا پابند کرتے ہیں چنانچہ

تخلیق اختیاری کو موقوف مانتے ہیں۔ وجود مادّہ قدیمہ پر جس کو اختیار خداوندی سے خارج کہتے ہیں۔ گو اہل حق اسکے قائل نہیں۔ پس اس تسلیم کردہ مسئلہ کی بنا پر ان طبعیین کو تو ہم سے زیادہ قایل تقدیر ہونا چاہیئے (مجادلات معدلت دعوات عبدیت حصّہ دوم۔ ملفوظ نمبر ۲۲)

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت چھین کر کفار کو کس لئے دیدی

فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف و شفاف ہو۔ اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود میلی ہو۔ اس پر ناگوار نہیں ہوتا۔ جیسے ٹوپی چھینٹ لگ جانے سے اُتار کر پھینک دیتے ہیں۔ اور جوتے میں لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مسلمان دعوٰی محبت کرتے ہیں۔ ان سے ذراسی بے احتیاطی ناگوار ہوتی ہے۔ بخلاف اعدا کے کہ وہ جب وہ کچھ بھی اُصول پر عمل کریں تو اللہ میاں ان کو دیدیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اللہ تعالےٰ کے دشمن ہی ہیں۔ مجادلت معدلت حصّہ سوم دعوات عبدیت ملفوظ نمبر ۲۱)

(۲۱) اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند کر دینے سے ہماری قوم پر تباہی آگئی

عقلاء وقت اس میں مختلف ہیں کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے۔ میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بدمعاملگی ہے۔ بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی۔ جو قومیں سود لیتی ہیں۔ وہ خوب ترقی کر رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لیتے ہیں۔ لیکن اُن کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔ کیونکہ مال سے مقصود تمتع دنیوی ہے۔ اور سود خوار جمع کرتے کرتے مرجاتے ہیں۔ اور بسا اوقات جن کے لئے جمع کرتے ہیں ان کو بھی نہیں ملتا ہے اور فرض کرو اگر متمتع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی نہیں یعنی سخت دل ہو جاتے ہیں۔ کسی پر ان کو رحم نہیں آتا۔ کسی کی مصیبت سے اُن کا دل نہیں دکھتا۔ اور اپنے رشتہ دار سے بھی سُود نہیں چھوڑتے جیسے بیرسٹروں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ سمجھتے ہیں۔ کہ اگر ان سے

نہ لیا۔ تو نرخ بگڑ جائیگا۔ اور اکثر سود خواروں کو ترقی دنیوی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر سود خوار کا مال ضائع ہی ہوتے دیکھا ہے۔ اور فرض کرو۔ اگر ترقی بھی ہوئی۔ تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لیکر کیا کرینگے ؎

مبادا دل آں فرومایہ شاد
کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔ دوسرے ایک دنیاوی غلطی بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ترقی کا سبب وہ شے ہو سکتی ہے جس سے عام لوگ منتفع ہوں اس لئے کہ ترقی یافتہ وہی قوم ہو گی جس کے سب افراد کو ترقی ہو۔ اور عام طور سے ان میں غنی پیدا ہوں۔ اور سود ایسی شے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہو سکتا۔ اول تو سب کے پاس مال نہیں۔ دوسرے آخر لیگا کون۔ اس لئے لامحالہ بعض لیں گے۔ اور بعض نہیں۔ تو جو لیں گے وہ تو ترقی کرینگے اور جو نہیں لیں گے وہ ترقی نہیں کرینگے بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے۔ پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہو سکتا۔ ترقی کا صحیح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے۔ مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں۔ مسلمانوں میں تاجر اہلِ ملک۔ رئیس سب طرح کی مخلوق ہے۔ مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں۔ اس وجہ سے تباہی آتی ہے۔ تو ایسی صورت ہونا چاہیئے کہ سود نہ دینا پڑے اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اپنے بھائیوں سے بلا سودی ملتا نہیں۔ اس لئے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں۔ اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں میں بہت مالدار ہیں۔ لیکن وہ بوجہ خوف بدمعاملگی کے قرض نہیں دیتے بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں۔ اور ان کو قرض دیں مگر ڈرتے ہیں کہ دیکر کیا لے لیں گے۔ اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہو جائے تو خود آپس ہی میں ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی ہے اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے تو جو تباہی کا سبب ہے وہ رفع ہو جائے۔ پس ثابت ہوا کہ بدمعاملگی تنزل کا سبب ہے۔

ہم لوگوں کی یہ حالت ہی کہ کسی کا روپیہ لیکر دینا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہونگے تو وہ بھی ٹال کردیں گے اور اس کو لازمۂ ریاست سمجھتے ہیں۔ کہ ہم سے تقاضا کرنے کی مجال نہ ہوئی۔ اسی طرح قرضخواہ کو نہ دینگے۔ اور بہانہ کردیں گے۔ کہ بھائی ابھی خرچ نہیں آیا۔ اور اسی حالت میں اگر بچہ کی ختنہ درپیش ہو جائے۔ یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتیرا روپیہ اُگل دیں گے۔ غرض بدمعاملگی کا مرض عام ہے (تعظیم الشعائر ص۱۱)

(۲۲) تغلیط اس رائے کی کہ تمام علوم قرآن شریف میں ہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علوم حتیٰ کہ طبعیات۔ سائینس وغیرہ سب قرآن شریف میں ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کرلیا ہے کہ مادہ منویہ میں کیڑے ہوتے ہیں۔ سو قرآن مجید میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے۔ اس لئے کہ فرمایا ہے۔ خلق الانسان من علق اور علق کے معنی جونک کے ہیں۔ حالانکہ یہاں علق کے یہ معنی نہیں ہیں۔ بلکہ خون بستہ کے ہیں۔ وہ زبردستی اس تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بناتے ہیں۔ ایک اور سائینس دان کہتے تھے کہ جیسے حیوانات میں نر و مادہ ہیں۔ اسی طرح نباتات میں بھی ہیں۔ اور قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر ہے۔ خلق الازواج کلھا۔ اس عقلمند نے ازواج کا ترجمہ میاں بیوی سے کیا۔ حالانکہ زوج کے یہاں یہ معنی نہیں ہیں۔ بلکہ معنی اصناف ہے۔ صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ سخت مضر ہے ع۔ دوستی بیخرد چوں دشمنی است۔ اس میں بڑی دشمنی ہے۔ اسلام کے ساتھ اس لئے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سائینس کے مسائل منقح نہیں ہوئے۔ اور اس کو اہل سائینس بھی مانتے ہیں۔ کہ ہم کو ابتک اس دریا کا قطرہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ بس جبکہ مسائل منقح نہیں ہوئے۔ تو اگر آج آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بنایا مثلاً یہی کہ تخم درخت میں نر و مادہ ہوتے ہیں۔ اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت ہو گئی اور دوسری تحقیق نئی ہوئی۔ تو اس میں تکذیب کلام الٰہی کی بھی لازم آئیگی۔ پس یہ لوگ یصدون عن سبیل اللہ کے مصداق بن رہے ہیں۔ غرض یہ کوشش کرنا

کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت ہو سخت حماقت ہے۔ بلکہ قرآن شریف کا کمال یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے، وہ فن اس میں ہو۔ اور دیگر خرافات سے خالی ہو۔ قرآن شریف ایک طب روحانی ہے اور اس فن میں وہ یکتا ہے۔ اور موٹی بات ہے۔ کہ جب مسائل دینیہ فرعیہ بھی سب کے سب قرآن شریف میں نہیں ہیں۔ تو فنون و تجربے کے مسائل تو اس میں کل کیسے ہونگے (اطاعت الاحکام صـ۱۶)

(۲۳) بعض لوگوں کے اس شبہ کا جواب کہ زکواۃ دینے سے مال کم ہی ہوتا ہے۔ بڑھتا کہاں ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپے رکھتے ہیں اور زکواۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں۔ تو کم ہو جاتے ہیں بڑھنا در کنار برابر بھی نہیں رہتے۔ بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ نہوتا۔ مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھا ہوا مال اپنے کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائے۔ اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہیں لیکن وہ دس کے دس اسکے کام آئیں۔ یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہ دو شخص ہیں۔ اور ان کی برابر آمدنی ہے۔ مگر فرق اتنا ہی کہ ایک زکوۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کرتا ہے۔ سو اس کی چین و آرام سے زندگی گذرتی ہے۔ اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہی۔ آج چوری ہو گئی کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ خود بیمار ہو گیا۔ بچے بیمار ہو گئے۔ عطار کے یہاں روپیہ جا رہا ہے۔ طبیب کی فیس میں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آرہی ہے۔ جو مال کے بڑھنے سے غرض ہے۔ وہ اسکو حاصل ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ دیتے ہیں۔ اور پھر جو لیتے ہیں۔ وہ اپنے لئے نہیں وہ بھی تمہارے ہی لئے ہے (ذکر الموت صـ۹۸)۔

(۴۲) اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ مصائب میں زیادہ مبتلا رہتے ہیں

اگر آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام اٹکتے ہیں۔ کوئی تنگ دست ہے۔ کوئی بیمار ہے۔ غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک تو صورت ہوتی ہے۔ اور ایک اس کی حقیقت و روح ہوتی ہے۔ مال۔ اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اس کی راحت و جمعیت قلب ہے۔ مال و جاہ اور صحت سب سے مقصود اطمینان اور راحت ہے۔ اگر سب کچھ ہو۔ لیکن قلب پریشان ہو۔ تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت حشمت و شوکت سب کچھ ہو۔ اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جاوے۔ اور اسکے مقابلہ میں ایک شخص فرض کیا جاوے کہ جس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔ اور مزدوری کرکے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جاوے کہ فلاں شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی۔ اگر بجائے اسکے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ۔ اور یہ اقرار کرلو کہ قاتل میں ہوں۔ وہ ہرگز منظور نہ کریگا۔ اور کہیگا کہ میں دولت کو لیکر کیا چولھے میں ڈالوں گا۔ جب میری جان ہی نہ ہوگی۔ تو ایسی دولت کو کیا کروں گا۔ اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے۔ کہ تم کو خلاصی ہو جائیگی۔ مگر اس شرط سے کہ اس کا فقر و فاقہ تم کو ملے گا۔ تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔ معلوم ہوا۔ کہ کامیابی کی حقیقت مال و جاہ و صحت نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔ پس ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر و فاقہ اور مصائب خواہ کسی قدر ہوں۔ ان کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش و عشرت ہو۔ لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں۔ کیونکہ اسکو وہاں زبان کا بھی کھٹکا لگا ہے۔ تو اس کا گناہ تو اور بھی بے لذت ہے۔ اب آپکی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ فرمانبرداری سے روح عیش میسر ہوتی ہے۔

ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی ہے۔کیمیاگر اگرچہ مفلس ہو لیکن وہ ہر وقت خوش ہے۔کہ جب چاہوں گا سونا بنالوں گا۔اس واسطے بڑے بڑے والیان ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔پس صاحبو! جبکہ وہ کیمیا جو تانبے کو سونا بنادیتی ہے۔یہ اثر رکھتی ہے۔تو حقیقی کیمیا۔یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہو گا۔پس یہ خیال غلط ثابت ہوا۔کہ شریعت پر عمل کرنیسے کامیابی نہیں ہوتی۔اور یہ ثابت ہوگیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت میں ہی منحصر ہے (شرط الایمان ص۲۲۴)

(۲۵) ناول بینی کی مضرتیں

اس میں اسقدر مشغولی ہوتی ہے۔کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا اگر کوئی کہے کہ غفلت تو کچہری میں کام کرنے اور روٹی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے تو چاہئے کہ سب چھوڑدیں۔بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں۔ایک ضروری۔اور ایک غیر ضروری۔ضروری اشغال کا یوں تجربہ ہوا ہے۔کہ مضر نہیں ہوتے۔اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے۔اور جب اسکو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شے کو سمجھے گا۔تو دل اسی اصلی کام کی طرف رہیگا۔کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کرینگے۔اور جو تھوڑی غفلت اس میں ہو جاتی ہے اُس کے لئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ دھل دھلا جاویگی اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے۔اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا۔اور وہ مضر ہے اور مورث غفلت ہے اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے مفضی الی الکبائر بلکہ الی الکفر ہو جاتی ہے۔بالخصوص ناول سے ایک بڑا ہی سخت مرض پیدا ہوتا ہے۔وہ یہ کہ اسکے دیکھنے سے بدمعاشی کے طریقے خوب یاد ہو جاتے ہیں۔ہمارے ناول کے شیدائی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں۔اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع ہو جاتا ہے۔

لیکن اخلاق پر بُرا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصے صریحاً کذب اور عادۃً مستحیل ہیں۔ مثلاً گل بکاولی کا قصہ۔ بکاولی کی تصویر اور جنوں کی عملداری وغیرہ من الخرافات ان قصوں سے کوئی ترکیب بدمعاشی کی نہیں سیکھ سکتا۔ کیونکہ اس میں وصال بکاولی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہو کر پہنچا دینا ہے۔ تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کریگا۔ بخلاف ناولوں کے کہ اسمیں لکھا ہے۔ کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیجدیا۔ جس کو ہر شخص کر سکتا ہے۔ ناول کا طرز چونکہ ایسا دکھلایا جاتا ہے۔ جیسے کہ واقعات ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا ایک اثر خبیث پڑتا ہے۔ کہ اکثر آدمی اسکے دیکھنے سے عشق نساء یا اطفال میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قلب میں سوزش کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اور یہ سخت مضر ہوتا ہے (الصوم صد۹)

(۲۶) اس شبہ کا جواب کہ قرآن مجید میں تکرار مضامین کیوں ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو صاف صاف بیان فرما دیا۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ مکرر سہ کرر بیان فرمایا۔ کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا۔ ہم نے کیا کیا۔ کہ اس کی قدر تو کی نہیں برعکس اسکے اس میں شبہات نکالنے لگے۔ کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو مکرر کیوں بیان فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت یہی ارشاد فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ولقد صرفنا القرآن للناس لیذکروا۔ یعنی ہم نے لوگوں کیلئے طرح طرح سے اس لئے بیان کیا ہے۔ تاکہ نصیحت قبول کریں۔ اُس کی قدر اُس کو ہو گی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے۔ دیکھو باپ بیٹے کو کس کس طرح سے سمجھاتا ہے۔ صرف ایک مرتبہ سمجھانے پر اکتفا نہیں کرتا۔ اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد مواخذہ کرتا ہے۔ بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے دوسری تیسری۔ چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے۔ جتبک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اسکو چین نہیں آتا۔ جب بالکل لاچار ہو جاتا ہے۔ بمجبوری زجر و توبیخ سے کام لیتا ہے۔ پھر اس میں بھی ایلام اور ایذا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مدنظر ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کو تو باپ سے بدرجہا زیادہ شفقت ہے۔ اور اس کو باپ سے زیادہ اس کے مصالح کی رعایت ہے۔ اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں۔ نوع بنوع کے طرز سے بیان فرمایا ہے

اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ کو بیٹے کے حال پر جو عنایت ہی۔ اس کا منشار تو غرض ہے کہ باپ کو یہ اُمید ہوتی ہے۔ کہ بیٹا میرے کام آوے گا۔ یا یہ کہ اس سے میرا نام چلیگا۔ اور کچھ نہیں یہ تو ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ ایسا علاقہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے باپ اسکی تربیت واصلاح کی طرف مضطر ہوتا ہے۔ اور اسی سے اس کو راحت ہوتی ہے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے۔ اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہی غنی بالذات ہے۔ اور نہ ہماری طرح کسی شے سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔ ہم تو محبت سے یا کسی دوسری غرض سے مجبور بھی ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں چونکہ غنا ذاتی ہے۔ اس لئے کسی شے کی احتیاج نہیں اور ما سوا اس کے سب محتاج ہیں۔ بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے۔ اسلئے کہ اگر عالم میں انسان نہ رہے۔ تو کسی شے میں کوئی خلل نہ آوے سب اپنے ہی حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شے بھی نہ رہے تو انسان کی بقار دشوار ہو جائے۔ مثلاً پانی نہ رہے۔ یا آگ نہ رہے۔ تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور انسان اگر ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شے کا محتاج ہے۔ اور یہ بات کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونیکے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا۔ سو راز اسمیں یہ ہے کہ اسکو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب نہ ہو جاوے۔ اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگا دی گئی ہیں۔ کہ جب ناز اور فخر ہو تو فوراً اس طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا ناز کروں۔ میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہونگی۔ بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شے انسان کی محتاج نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو انسان کی کیا احتیاج ہوتی۔ جن چیزوں کا انسان خود محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں۔ بلکہ یہ امر عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ ہر شے اپنے وجود اور بقا میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے۔ پس حق تعالیٰ کے اس استغنا اور انسان کے احوج ترین مخلوقات ہونیکا اقتضار تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخاطب نہ بناتے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے۔ حقوق تو

ضروری ہوتے ۔ پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا جاتا ۔ تو سخت
مصیبت ہوتی ۔ جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلاتے ہیں ۔ خادموں کو سخت
مصیبت کا سامنا ہوتا ہے ۔ اور ایک دو ہی کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتنا مزاج شناس ہو
کہ اشارہ کو سمجھے ۔ علی حزین شاہزادۂ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضانی نام ایسا
مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا ۔ ایک مرتبہ علی حزین نے شاہ دہلی سے درخواست کی
کہ ہمکو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے ۔ بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو
بھیجدیا ۔ علی حزین باغ میں بیٹھے تھے ۔ اور نیا خدمتگار باغ کے دروازہ پر تھا ایک شخص
آیا اور اُس نے ایک رقعہ دیا اس خادم نے وہ رقعہ پہنچا دیا ۔ اس میں درخواست تھی
کہ لیموں عنایت فرمائیے ۔ علی حزین نے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دیدیا ۔ یہ خادم
سخت پریشان ہوا کہ زبان کو تو بند کر لیا ۔ اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے
ہیں ۔ یہ کس بات پر بگڑے ہیں ۔ اتفاق سے وہاں رمضانی بھی آنکلا ۔ اس سے خدمتگار
نے سارا قصہ بیان کیا ۔ رمضانی نے کہا ۔ چہرہ پر بل ڈالکر رقعہ دینے کا مطلب یہ ہے
کہ لیموں دیدو ۔ لیموں ترش ہوتا ہے ۔ اُنہوں نے چہرہ ترش کر کے بتلادیا ۔ وہ خادم یہ سُنکر
بھاگا اور سوچا کہ میں یہاں رہوں گا تو سخت مصیبت میں رہونگا ۔ یہ حکایت صحیح ہے
یا غلط بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے ۔ تو حق تھا
لیکن کیسی مصیبت ہوتی ۔ اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا ۔ سو ایسا نہیں کیا ۔
بلکہ ایک مضمون کو خوب کھولکر دو دو مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا ۔ اور بیان بھی اس
طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی کہ کوئی پرچہ بھیجدیتے کہ اسکے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے
میں دقت ہوتی ۔ بلکہ ایک عجیب اور فطرۃ کے موافق طریقہ اختیار فرمایا ۔ وہ یہ ہے کہ
ایسی ذات مقدس کو بھیجا ۔ جن کی شان یہ ہے لقد جاءکم رسولٌ من انفسکم
یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے ۔ پس حضور کا ہماری جنس
سے ہونا ۔ ایک نعمت تو یہ ہے ۔ اس لئے کہ اگر کسی فرشتہ یا جن کو بھیجدیتے تو سب
ہیبت ہی کے مارے مرجاتے اور آپس میں کچھ مناسبت نہ ہوتی ۔ آجکل لوگ اس

فکر میں ہیں پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبے سے گذار کر اللہ تک پہنچادیں۔ گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافہ ہوئی ہے حالانکہ یہ عین رحمت الٰہی اور عین کمال نبوی بھی ہے کہ بشر ہو کر قریب کے ایسے درجہ پر ہے۔ یہ تو کمال تھا اور رحمت اس لئے ہے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لاویں (الشکر ص ۱۰۵)

(۲۷) پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب

جواب نمبر ا۔ حق تعالیٰ نے بنوں کو زینت حیوۃ الدنیا تبلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا۔ اسکی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں۔ تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہونگی۔ دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالے نے یہ تبلادیا کہ بنات زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں۔ اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں۔ تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے۔ پس صرف بنوں کو زینت دنیا فرمایا اور بنات کو ذکر نہ فرمایا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں۔ کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے۔ جو منظر عام پر زینت بخش ہوا اور وہ ایسی زینت نہیں ہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے پھرو۔ اور سب دیکھیں کہ ان کے اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں۔ بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں۔ یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔ دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے۔ کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس کے معنی لغت میں چھپانے کی چیز کے ہیں تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورت کو پردہ نہ کراؤ۔ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے۔ کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ۔ پہننے کی چیز کو نہ پہنو۔ اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے۔ کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ۔ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے۔ کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیز ہیں۔ ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ

عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رُکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں اسی واسطے تو
ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں۔ بہت تعلیم یافتہ ہوگئی ہیں۔ یہ جواب
سُنکر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا
بے پردگی کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کی عورتوں کی
تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں۔ ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں
ہو سکتا۔ بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ تعلیم کیلئے یکسوئی
اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے۔ اور وہ گوشۂ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس
واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشۂ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلبا کو اس کا
اچھی طرح اندازہ ہے۔ پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کیلئے معین ہے نہ کہ مانع۔ نہ معلوم
لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں۔ ہاں علوم تجارت کیلئے سیر و
سیاحت کی البتہ ضرورت ہے۔ مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں۔ اُن کیلئے
سیر و سیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھیگی
اس لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی۔ کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں
کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق
کا قصد کرتا ہے۔ وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی
بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں۔ اور اگر عورتوں کے ہاتھ طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق
دیکر نئی شادی کیا کرتیں۔ بس عورتوں کیلئے یہی سیر و سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں
چل پھر لیا کریں۔ جن تجربوں کی ان کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہکر ہی ان کو حاصل ہو
سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت بین سے دیکھئے۔ تو مردوں کو بھی اسکی ضرورت
نہیں۔ اگر سیر و تماشہ چاہتے ہو۔ تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے۔ دل کی آنکھوں
سے دیکھ لو۔ تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئیگا کہ دنیا کے پھول پھلواڑیوں سے
استغنا ہو جائیگا ؎

توز غنچہ کم نہ میدہ ٔ در دل کشا چمن درآ	ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است		چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت است

(منظاہر الآمال ص۱۶)

دوسرا جواب ۔ مردوں کو تو یہ حکم فرمایا قل للمومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم یعنی آپ مؤمنین سے کہدیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ۔ اور عورتوں کیلئے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضافہ فرمایا ۔ ولا یبدین زینتھن یعنی بناؤ سنگار کا موقع ظاہر نہ کریں ۔ اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے ۔ جب اس کا اظہار بھی اجانب کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہوگا ۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے والقواعد من النساء التی لا یرجون نکاحاً فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجات بزینۃ یعنی جو عورتیں بوڑھی ہیں وہ اگر اپنے زائد کپڑے اُتار کر رکھدیں جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اُتار دے بشرطیکہ بدن ظاہر نہو ۔ تو کچھ حرج نہیں ۔ لیکن اس حالت میں بھی اپنے مواقع زینت کو ظاہر نہ کریں ۔ مثلاً گردن کان کہ ان میں زیور پہنا جاتا ہے اور آگے ارشاد ہے ۔ وان یستعففن خیر لھن یعنی ان زائد کپڑے اُتار کر رکھنے سے بچیں ۔ تو ان کیلئے زیادہ بہتر ہے ۔ پس جب بوڑھیوں تک کیلئے یہ حکم ہے تو اے لڑکیوں اور اے جوان عورتو تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے بے محابا آجاؤ ۔ حضور سے زیادہ تو کوئی نہوا نہ ہوگا ۔ حضور خود اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آجکل جو بعضے نوتعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں محض غلط ہے ۔ بات یہ ہی کہ ان لوگوں نے قرآن وحدیث کو دیکھا ہی نہیں ۔ بس دیکھا کیا ہے ۔ کوئی اخبار دیکھ لیا ۔ اگر کچھ عربی پڑھی ہے ۔ تو مصری اخبار دیکھ لیا ۔ سو سمجھ لو ۔ کہ یہ پردہ جو آجکل مروج ہے ۔ یہ قرآن سے بھی ثابت ہی اور حدیث سی بھی ثابت ہی چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک عورت نے حضور کو پردہ کے پیچھے سے خط دیا ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے ۔ اور قرآن اوپر گذرا ہے ۔ پھر جبکہ حضور خود سے پردہ

کراویں۔ تو کونسا پیر ہے۔ اور کونسا رشتہ دار ہے جس سے بیحجابی جائز ہوگی۔ خواہ کوئی خالو ہو یا بھوپھا دا انگتا ہو۔ یا چچا اگر محرم نہو۔ وہ اجنبی ہے۔ بڑا ظلم و ستم ہی۔ کہ عورتوں کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔ ہم نے مانا کہ تمہارا دل پاک ہے لیکن تم کو دوسرے کی کیا خبر۔ اگر کہو کہ دوسرا بھی پاک ہے تو توبہ توبہ خدا اور رسول کو تمنے ظالم قرار دیا۔ کہ باوجودیکہ یہ پاک تھا۔ پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا۔ اگر یہ پاک صاف ہوتے۔ تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔ یاد رکھو اللہ تعالےٰ کو سب خبر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہی۔ انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں ہوسکتا یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونیکے فرماتے ہیں وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی۔ یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں۔ نفس تو بُری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے۔ مگر جس پر میرا رب رحمت فرمادے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔ اب بتلایئے کہ کس کا منہ ہے۔ جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے۔ مجھکو بُرا وسوسہ نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے۔ چنانچہ بعض بزرگوں کو اس میں دھوکا بھی ہوا ہے کہ اُنھوں نے جب دیکھا۔ کہ ان کو وسوسہ نہیں آتا۔ تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مرگیا ہوگیا ہے۔ اس لئے اُنھوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی باک نہیں کیا۔ اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہوگئے۔ خواہ وہ فتنہ قلب ہی کا ہو۔ اور یہ کارگذاری شیطان کی ہی کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے اول یہ تدبیر بتلائی کہ نگاہ نیچی رکھو۔ اگر بضرورت تمکو کسی غیر کے سامنے آنا پڑے۔ تو نگاہ نیچی اور کپڑوں میں لپٹ کر آؤ۔ یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن اصل تمام پھل پھول کی یہی ہے۔ جیسے زکام ہے۔ کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے۔ لیکن سینکڑوں بیماریونکا منشار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح نظر بھی ہے۔ اگر یہ بگڑ گئی۔ تو پھر آیندہ امن اُٹھ گیا۔ اسی واسطے اول اسی کو روکا ہی۔ دیکھو نبی کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت نہیں ہوسکتی میں تمکو قصہ سُناتا ہوں۔ جس سے تمکو اندازہ ہوگا۔ کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے حضرت عبد اللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں۔ وہ ایک مرتبہ حضور

کی خدمت میں آئے۔ ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیٹھی تھیں۔ حضور نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ اُنہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ تو اندھے ہیں۔ حضور فرماتے ہیں افعمیاوان انتما لستما تبصرانہ یعنی کیا تم بھی اندھی ہو۔ اس کو دیکھتی نہیں ہو۔ دیکھو حضور کی بیبیاں امہات المومنین۔ دوسری طرف نابینا صحابی۔ بھلا یہاں کون سے وسوسہ کا احتمال ہوسکتا ہے۔ مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔ (العفۃ ص۶)

(۲۸) اس اعتراض کا جواب کہ علماء ترقی سے مانع ہیں

جواب نمبر ۱۔ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کرونگا۔ اس پر جنٹلمین چونکے۔ کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان۔ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے ہیں۔ اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں۔ اس پر اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولکل وجھۃ ھو مولیھا فاستبقوا الخیرات ط یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے۔ پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا۔ جس کے معنی ایک دوسرے پر سبقت کرنیکے ہیں۔ اور یہی حاصل ہے ترقی کا۔ تو ترقی کی ضرورت قرآن سے ثابت ہے۔ بلکہ استبقوا صیغہ امر ہے جس کا مقتضیٰ وجوب ہے۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ قرآن میں ترقی کو واجب و فرض کیا گیا ہے۔ تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ وہ ان پر کتنا بڑا افترا کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے۔ علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کر سکیں۔ پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے۔ البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ جنٹلمین کہتے ہیں۔ کہ جس طرح ہم کہیں۔ اسی طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے اُسی طرح ترقی کرو۔ سو قرآن میں فاستبقوا کیساتھ الخیرات کی بھی قید ہے۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔ اب

اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے۔ آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ
خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے۔ تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے
منع نہ کرینگے۔ اور اگر ترقی فی الشر ہے۔ تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاً
کے نزدیک مسلم ہے۔ ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے۔ کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں
منع کیا جاتا ہے۔ میں تو ترقی کا طالب ہوں۔ بتلایئے اسے کیا جواب دیں گے۔ ظاہر
ہے۔ کہ اس سے یہی کہا جاویگا کہ تیری یہ ترقی ترقی محمود نہیں۔ بلکہ ترقی مذموم ہے۔
جو کہ بُرے طریقے سے حاصل کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں
بلکہ وہی مطلوب ہے۔ جو محمود ہو۔ مذموم نہ ہو۔ پس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس
ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے مذموم نہیں۔ یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی
ہے۔ جس کی ہم تعلیم دے رہے ہیں۔ اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے
ہیں۔ اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے۔ اور اقرار کر لیا۔ کہ واقعی علماء کو ترقی سے
اختلاف نہیں۔ بلکہ اس کے طریق تحصیل سے اختلاف ہے۔ کیونکہ ان طرق نے
خلاف شرع ہونے کیوجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشر کا مصداق بنا دیا ہے۔ غرض
دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ ان کی ہر حالت
کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے
ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو۔ کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی
ترقی سے مانع ہے۔ اگر عورتیں آزاد ہونگی تو علوم صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کرینگی
اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ اٹھائیں گی۔ ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان
کی تھی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشین ہیں۔ جن کی تعداد
ہندوستان میں بہت کم ہے۔ زیادہ تعداد تو چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا
ہمیشہ سے رواج نہیں ہے اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں
نہ کر لی۔ بس اس کا جواب کچھ نہ تھا۔ وہ میرے منہ کو تکنے لگے (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۴۵)
جواب نمبر۲۔ یہ سب کہتے ہیں کہ عزت اور ترقی حاصل کرنا چاہئے۔ اور اسکے ساتھ ہی

علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں۔ کہ علماء ترقی کے مانع ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عزت حاصل کرنا چاہیئے۔ اور علماء اس کے مانع نہیں ہیں۔ اور علماء کیسے مانع ہوتے۔ جس شئے کو قرآن وحدیث ثابت کرتے ہیں۔ اسکو کونسا مولوی مٹانے والا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین یعنی اللہ ہی کیلئے عزت اور اُس کے رسول کیلئے اور مومنین کیلئے۔ بھلا جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہوگا وہ کیسے اسکی نفی کریگا۔ پھر علماء پر الزام کیسا۔ بات یہ ہے۔ کہ ان کی بات پوری طرح سُنتے تو ہیں نہیں۔ بے سوچے سمجھے ہانک دیا کہ علماء ترقی سے روکتے ہیں۔ صاحبو! علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں۔ علماء جو طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہیں وہ نفس ترقی کی طلب پر نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ لوگ اس کو غیر طریق سے حاصل کر رہے ہیں۔ طریق یہ نہیں ہے۔ اگر کوئی پشاور جانا چاہے۔ اور ٹکٹ لے لے کلکتہ کا۔ اور اسکو کوئی اسکی غلطی پر آگاہ کرے تو وہ پشاور جانے کا اور ریل میں سوار ہونیکا مخالف نہیں بلکہ طریق کے اندر مخالفت کرتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ رستہ یہ نہیں ہے۔ پشاور کو دوسری گاڑی جاویگی اس کا ٹکٹ لو۔ وہ تمکو پشاور پہنچاویگی۔ اور یہ گاڑی پشاور نہیں پہنچاویگی میرے ایک ہموطن اسٹیشن سہارنپور سے میرٹھ جانیوالے لکھنؤ جانیوالی گاڑی میں غلطی سے سوار ہوگئے۔ اتفاق سے میں بھی لکھنؤ جارہا تھا۔ عین روانگی کے وقت تو ان سے کوئی بات ہوئی نہیں۔ اس لئے کہ خیال ہوا کہ یہ تو گاڑی میں موجود ہیں ہی۔ ان سے باطمینان بات کرونگا۔ جو لوگ مجھکو پہنچانیکے لئے آئے تھے اُن سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل چھوٹ گئی تو میں اُن کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے۔ کہنے لگے کہ میرٹھ۔ میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جائیں۔ مگر یہ گاڑی میرٹھ نہ جائیگی۔ یہ تو رڑکی ہوتی ہوئی سیدھی لکھنؤ پہنچے گی۔ یہ سُنکر تو بہت چکرائے۔ اور سردی کا موسم تھا۔ ان جنٹلمینوں کو یہ بھی مرض ہے کہ کپڑا ساتھ نہیں لیتے اور رزائی اور روئی دار انگرکھہ پہننے کو خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ بیک بینی و دوگوش ہی سفر کرتے ہیں۔ ایسے ہی وہ بھی تھے۔ خیر رڑکی وہ اُترے پھر وہاں سے اخیر شب میں میرٹھ پہنچے۔ پس دیکھئے میں اُن کے

ریل میں سوار ہونے کا اور میرٹھ جانیکا مخالف نہیں تھا۔ بلکہ گفتگو یہ تھی کہ آپ نے طریق میں غلطی کی۔ پس علماء کو اگر کہیں طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہوئے سُنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترقی کے مخالف ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق سے آپ ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ طریق اس کا نہیں ہے ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی　　کیں راہ کہ میروی بترکستان است

طریق اس کا وہ ہے جو مولوی بتاتے ہیں۔ اور یہ مولوی کیا بتاتے ہیں۔ خدا اور رسول نے جو بتایا ہے وہ طریقہ ہے۔ مولوی بیچارے تو سرکاری حکم کی منادی کرنیوالے ہیں۔ منادی کرنے والے سے اگر کوئی معارضہ اور مناظرہ کرے تو وہ یہی کہیگا کہ میں تو منادی کرنے والا ہوں۔ مجھ سے گلنجپ نہ کرو۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے چپراسی سمن لایا اور اس سے کوئی مباحثہ کرنے لگے۔ تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہونگے۔ ایک تو تعمیل نہ کرنے کا۔ دوسرے سرکاری آدمی سے مقابلہ کرنے کا۔ پس یاد رکھو کہ یہ علماء سرکاری آدمی ہیں۔ ان سے منازعت کرنا سخت جرم ہے۔ غرض طریق ترقی کا وہ نہیں ہے۔ جو آپ لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ ترقی اور عزت حاصل کرنے کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن طریق یہ نہیں ہے۔ اب میں اس کو بیان کرتا ہوں۔ مگر اسکی تحقیق کے لئے اول یہ سمجھئے۔ کہ عزت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے۔ اور وہ کیوں ضروری ہے۔ سو لوگ تو ترقی اور عزت کے طالب ہیں۔ کہ اسکی غرض محض بڑا بننا ہے۔ مگر میں اس کی اصل وجہ بیان کرتا ہوں کہ اس کی کس لئے ضرورت ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقلی طور پر انسان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ منافع کو حاصل کرنا اور مضرات سے بچنا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے۔ اس کی غایت صرف یہی ہوتی ہے۔ کہ یا تو نفع کی تحصیل ہو۔ یا مضرت کا دفع۔ مثلاً کھانا کھاتا ہے۔ تاکہ بھوک کے ضرر سے بچے۔ اور قوت کی منفعت حاصل ہو۔ دوا کرتا ہے۔ تاکہ مرض دور ہو۔ اور صحت حاصل ہو۔ غرض جو کچھ کرتا ہے۔ یا تو جلب منفعت کیلئے۔ یا دفع مضرت کیلئے۔ اور دوسرا قاعدہ عقلی یہ سمجھو کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ پس جلب

منفعت اور دفع مضرت جس طریقے سے حاصل ہو وہ بھی ضروری ٹھیرا۔ سو طریقہ اس کا یہ ہے مال وجاہ کا حاصل ہونا۔ مال تو اصل میں منافع کی تحصیل کے واسطے ہے۔ اور جاہ اصل میں دفع مضرت کے واسطے ہے۔ گو کبھی کبھی جاہ سے خطرہ میں بھی پڑنے کا احتمال ہے۔ لیکن وہ بحیثیت جاہ ہونے کے خطرہ کا سبب نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ جاہ فی حد ذاتہ خطرات سے بچانیوالی ہے۔ بلکہ سبب وقوع فی الخطرہ کا قلت جاہ ہوتی ہے۔ مثلاً بعض بڑے لوگوں کے کچھ دشمن ہو گئے۔ اور آزار پہنچایا تو یہ ایذا جاہ کے سبب سے نہیں ہوئی۔ جاہ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر غلبہ پورا ہوتا تو اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ اسی واسطے حق تعالیٰ کا کوئی کچھ نہیں کرسکتا اس لئے کہ غلبہ اور عزت غیر محدود اور کامل درجہ میں ہے۔ لیکن تاہم جاہ ہی ایسی شے ہے۔ جو بہت سے مصائب اور خطرات سے آدمی کو بچاتی ہے۔ مثلاً اب ہم اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ کوئی ہمکو ذلیل نہیں کرسکتا۔ بیگار میں نہیں پکڑ سکتا تو اس کا سبب کیا ہے۔ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی ہے۔ بخلاف اُن لوگوں کے جن کو عزت حاصل نہیں ہے۔ پولس نے حکم دیدیا کہ دس چماروں کو بیگار میں پکڑ لاؤ۔ بیچارے چار و ناچار آتے ہیں۔ پس جاہ اور عزت کی غرض مضرت سے بچنا ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ عزت اور مال دونوں مطلوب اور ممدوح ہیں۔ مہروب عنہ اور مذموم نہیں ہیں۔ اور جو مال وجاہ کی مذمت کرتے ہیں اُن کا عنوان تعبیری مختصر ہوتا ہے۔ مقصود مذمت کرنا حب مال اور حب جاہ کا ہے اور حب بھی وہ جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کہ ان کی ہوس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھی پس پشت ڈال دے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ قل ان کان آباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ۔ احب الیکم من اللہ سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ مذموم اور منہی عنہ نہ مال ہے نہ جاہ اور نہ حب مال اور حب جاہ۔ بلکہ مال اور جاہ کی حب

مفرط ہے۔ جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے مقابلہ میں دین کی بھی پرواہ
نہ رہے۔ عزت اور آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ دین رہے یا جائے مگر بات نہ جائے
جیسے ایک شخص ریل میں سوار تھے۔ اُنہوں نے نماز نہ پڑھی۔ اور کہتے تھے کہ میں نے
نماز اس لئے نہ پڑھی کہ ہندوؤں کا مجمع تھا۔ اگر اُن کے سامنے نماز پڑھتا تو وہ یوں
کہتے کہ کیا اُٹھک بیٹھک کرتا ہے۔ اور اس سے اسلام کی اہانت ہوتی۔ استغفر اللہ
یہ اُس شخص کا گمان فاسد تھا اگر وہ نماز پڑھتا تو زیادہ عزت ہوتی۔ ایک وزیر اعظم ریاست
بھوپال کی حکایت ہے کہ کسی بڑے حاکم کا لیکچر ہو رہا تھا۔ نماز کا وقت آگیا۔ بڑے
بڑے اُمراء وزراء شریک تھے۔ ان میں نمازی بے نمازی سب قسم کے تھے۔ سب یہ
سمجھے کہ یہاں سے اُٹھنا بڑی سُبکی کی بات ہے۔ اس لئے سب ساکت بیٹھے رہے۔ وزیر
صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضور نماز کا وقت آگیا ہے۔ ہم نماز پڑھیں گے۔ حاکم نے
بہت خوشی سے کہا کہ ضرور پڑھ لیجئے۔ وزیر صاحب کھڑے ہوئے اور لوگ بھی نماز
کیلئے کھڑے ہو گئے دربار ہی میں بڑی شان وشوکت سے نماز باجماعت ہوئی۔ دیکھئے
عزت یہ ہے۔ آجکل یہ حالت ہے۔ کہ گو دین جاتا رہے مگر ہماری آبرو وعزت مزعومہ میں
فرق نہ آنے پاوے۔ ہماری آمدنی میں فرق نہ آنے پاوے۔ چنانچہ مختلف تدبیروں
سے خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ کوئی مال بڑھا رہا ہے۔ کوئی جائداد کی فکر میں ہے
عورتیں زیور کے بڑھانے کی فکر میں ہیں۔ اسی طرح جاہ کو مختلف تدبیروں سے حاصل
کرتے ہیں اور اس کو ریاست سمجھتے ہیں۔ آجکل ریاست کا حاصل کیا ہے کہ اپنے دباؤ
اور زور سے غریبوں پر ظلم کرنا کسی کی گھانس چھین لی۔ کسی کی زمین دبالی وغیرہ غرض
حب عزت کے مقابلہ میں دین کی پرواہ نہ کی تو کیا عزت ہے۔ ہاں یہ بھیڑیے کی عزت
ہے۔ اگر ابھی بھیڑیا آجاوے۔ تو سب کھڑے ہو جاویں۔ خواہ وہ یہ سمجھے کہ میری
تعظیم کو کھڑے ہوئے (حالانکہ لوگ اپنی حفاظت کیلئے کھڑے ہوں۔ علی محمد) واللہ
ان امراء اور ظالموں کی ایسی ہی عزت ہے۔ کہ لوگ اپنے بچاؤ کی وجہ سے اُن سے
ڈرتے ہیں۔ ورنہ ویسے تو کوستے اور گالیاں ہی دیتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ اس کو غارت

کرے ۔ عزت ہے اللہ والوں کی کہ اُن کے لئے جان تک فدا کرنے کیواسطے لوگ حاضر ہیں ۔ پس حقیقی عزت یہ ہے کہ دلوں پر قبضہ کرے اور دلوں پر سکہ جما ئے ۔ سو ایسی عزت اللہ والوں کی ہے ۔ (العزۃ صفحہ ۱۴)

(۲۸) تو تعلیم یافتہ طبقہ کے اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ فلاں بات خلاف عقل ہے اسلئے قابل قبول نہیں

ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے کہدیا کہ یہ خلاف عقل ہے ۔ اس لئے قابل قبول نہیں ۔ اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے ۔ چنانچہ اُن کے نزدیک صراط پر چلنا بھی خلاف عقل ہے اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں ۔ تو اس طرح اُنھوں نے عقاید میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا ۔ اب ایمان کے معنی وہ نہ رہے ۔ جو پہلے تھے ۔ یعنی تصدیق بما جاء بہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم ۔ بلکہ معنی یہ ہو گئے ۔ کہ تصدیق بما اوفق عقل مما جاء بہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم یعنی اُن کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اُس چیز کے ماننے کو جو حضور کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو ۔ میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمہ ہیں ایک یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے ۔ دوسری شق تو مسلم نہیں ۔ کیونکہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی ۔ وہ ان کو خلاف عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو ایسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں ۔ جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے ۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ و علماءؒ و صلحاءؒ امت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں ۔ اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغری تو مسلم مگر یہ کبریٰ مسلم نہیں ۔ کہ جو تمہاری عقل کیخلاف ہو وہ غلط اور نا قابل قبول ہے ۔ کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں ۔ مگر تم قانون والوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو ۔ اسکو بھی

جانے دو۔ میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو
کیا یہ تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ ہمکو اس پر حیرت اس لئے نہیں ہوتی کہ رات دن
اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اگر اس کا مشاہدہ نہوتا۔ اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم
ہوتا۔ تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔ اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ تم ایک نوزائیدہ
بچہ کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے۔ کہ بچہ ماں کے پیٹ
سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ
پڑھائیں۔ مگر یہ نہ پڑھائیں جس میں طریق ولادت کا ذکر ہو۔ پھر جب وہ بی۔ اے اور
ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی ہو جائے اس وقت اُس سے کہو کہ تجھ بھی ہے تو کیونکر
پیدا ہوا تھا۔ اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس
سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے
پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی۔ کہ خون بنا۔ اور خون سے علقہ پھر مضغہ بنا
پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں۔ پھر جسم کامل تیار ہو گیا۔ تو اس میں روح پڑی جس کی
پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی۔ پھر نو ماہ کے بعد تو شرمگاہ مادر سے
نکلا۔ اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آگیا۔ جس سے دو
برس تک پرورش پاتا رہا۔ الی آخرہ تو میں سچ کہتا ہوں کہ۔ واللہ العظیم وہ نہایت
سختی سے آپ کی مخالفت کریگا۔ اور کہے گا کہ ایک قطرے سے ایسے حسین جسم کا بننا
پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف
ہے۔ اب بتلائیے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جاوے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے
وہ غلط ہوا کرے۔ تو پھر آپ کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے۔ بات
یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں۔ جیسے وہ نوزائدہ بچہ جسکی
ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف
عقل کہیگا۔ کیونکہ اُس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سُنی نہ تھی۔ اور آپ اس کو خلاف
عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی۔ ورنہ آپ بھی وہی کہتے

جو وہ کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ خلاف عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ خلاف عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں۔ جن کا وقوع مشاہد ہو جاوے تو وہ خلاف عقل نہ رہیں۔ معلوم ہوا۔ کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہ رہے ہیں۔ اور کسی بات کے صحیح ہونے کیلئے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونیکی دلیل ہے۔ ورنہ پھر اس لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہیئے۔ جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونیکو غلط کہتا تھا۔ اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ غلط کہنا چاہیئے۔ جیسے ریل کا ایک گھنٹہ میں ۶۰ میل طے کر لینا۔ اور ۵ منٹ میں لنڈن سے تار کے ذریعے سے خبر آجانا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے مرغی کا ایک بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے اور آجکل دہلی میں دو لڑکیاں جڑی ہوئی نمایش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضا جدا جدا تھے۔ مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی۔ مگر پیشاب نکلتا ایک کے رستے سے تھا۔ تو بتلایئے کیا خلاف عادت کیلئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے۔ جس کے اوپر بنا کر کے بعض امور کو مانا جائے۔ اور کسی بات کے متعلق یہ کہا جاوے چونکہ یہ خلاف عادت ہے۔ اسلئے ہم نہیں مانتے۔ صاحبو! آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی عادت کیخلاف ہے۔ کیونکہ عادت کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہر شے اپنی حالت پر رہے۔ جو معدوم ہے معدوم رہے۔ اور جو موجود ہے۔ وہ کبھی فنا نہ ہو۔ مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے۔ ہزارہا معدوم وجود میں آتے۔ اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونیکو مستلزم نہیں اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں میں فرق نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے سُنیئے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔ خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو۔ مگر مشاہدہ نہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہی

اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے۔ یعنی عقل اس کے استحالہ پر دلیل قائم
کر سکے۔ اور استحالہ کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو۔ تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے
سے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے۔ اب
جو لوگ معادیات کو اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل سمجھتے ہیں وہ مہربانی
کر کے اُن کے استحالہ پر دلیل قائم کریں۔ اور بتلائیں کہ اُن کے ماننے سے اجتماع
نقیضین کیونکر لازم آتا ہے۔ یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی اُن کے استحالہ پر نہیں قائم
کر سکتے۔ بس بہتیرے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائیگا۔ اس
کی نظیر دکھلاؤ۔ بس آجکل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔
اسلئے یہ محال ہے اور جو دعویٰ امکان کا کرتا ہے۔ وہ اس کی نظیر دکھلائے عجب اندھیر
ہے کہ نظیر پر ثبوت شے کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اُس کو خلاف
عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ نظیر پر ثبوت کو
موقوف سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہد
ہوئے ہیں۔ کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اس
وقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں۔ اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیونکر ہوا۔ معلوم
ہوا کہ کسی شے کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں تو خوب سمجھئے کہ کسی دعوی کا ثبوت
نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں۔ بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لئے ہوا کرتی ہے مدعی
ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمے جو کسی امر کا
ثبوت یہ کہکر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلاف عادت یوں
ہوگا اُسکے ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو اپنے دعوے میں
تصریح کر رہا ہے کہ مدعی بے نظیری کی صفت کیساتھ متصف ہے اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں
لازم بھی ہو سکتا ہے۔ تو صرف اُس مدعی کے ذمے ہو سکتا ہے۔ جو اپنے دعوے کو موافق
عادت بتلائے۔ اور جو خرق عادت کا مدعی ہو۔ اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجب ہے
اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ جس کے نہ ماننے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق

ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے۔ شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا۔ یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں۔ چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں مدعی اگر نظیر بیان کردے تو یہ اس کا تبرع ہے۔ بلکہ ثبوت خبر کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک مخبر بہ کا ممکن ہونا۔ دوسرے مخبر کا صادق ہونا۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے۔ ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں۔ دوسرے مخبر صادق نے اُن کے وقوع کی خبر دی ہو ان دو باتوں کے ثابت کرنیکے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔ اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں۔ یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے۔ اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ اُن کے امتناع پر دلیل قائم کرے۔ اور ہمکو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا ہی امکان کی دلیل ہے۔ اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امتناع کہتے ہیں۔ اجتماع نقیضین کو کہ محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے ہو تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی خبر کوئی مخبر صادق خبر دے وہ ثابت ہے اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر مخبر صادق نے دی ہے۔ پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے۔ تو اس کا جواب ہمارے ذمے ہے۔ باقی نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمے نہیں۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہی سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہونگا۔ کہ بتلاؤ کیوں سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چیز پر پیر آجائے۔ جب یہ محال نہیں اور مخبر صادق اسکے وقوع کی خبر دے رہا ہے۔ تو پھر انکار کی کیا وجہ۔ اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے۔ کہ یہ مخبر صادق کی خبر نہیں۔ تو ہم دلیل امتناع سُننے کیلئے تیار ہیں

اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں۔ پھر ہم نظیر پیش کرنیکے ذمہ دار نہیں۔ اور اگر نظیر ہمکو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے۔ کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ہم اپنی سب معلومات آپ کو بتلادیں۔ ہاں اگر تم یہ ثابت کردو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے۔ تو جب ثابت کردوگے اُس وقت دیکھا جائیگا۔ بدون اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دینگے یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے۔ کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے۔ عوام سمجھے کہ یہ بھی مجیب کے ذمّے ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمے یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے۔ یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے۔ اور جو دلیلیں آج کل بیان کی جاتی ہیں۔ جن میں زیادہ تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے۔ وہ مطرد نہیں ہیں اب میں عقلاً یہ بات ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس کے لئے بھی نظیر کی ضرورت ہے۔ یا نہیں۔ وعلیٰ ہذا اگر ہر نظیر کیلئے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئیگا۔ اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر کہیں جاکر ٹھیروگے۔ کہ اس نظیر کے لئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہو گیا۔ تو پھر پہلے ہی کیلئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے۔ اور جس طرح تمنے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے۔ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمے نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے۔ ہاں اگر بیان کردے تو یہ اس کی تفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے۔ جبکہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جاوے۔ اور تسلیم کرلے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا۔ اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں اس وقت اگر مجیب تقریب فہم کیلئے کوئی نظیر دیدے۔ تو اس کا احسان ہے۔ اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعوے کو موقوف بتلاتا ہے۔ تو مستدل نظیر ہرگز نہ

بتلائے۔ بلکہ اس سے اس توقف علی النظیر کی دلیل مانگیے۔ چنانچہ اس وقت میں
ثبوت پلصراط پر دلیل قائم کرکے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔ اول پلصراط
کی حقیقت سمجھئے۔ مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے۔ اس طور پر پل صراط کو سمجھنا
واجب نہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ آدمی مجملاً پختہ عقیدہ رکھے۔ باقی بعض طبائع
ضعیف ہوتی ہیں۔ اُن کیلئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں۔ اگر وہ اس طرح بھی پل
صراط کو سمجھ لیں تو حرج کچھ نہیں۔ مگر لازم بھی نہیں۔ لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس
تنبیہ کے بعد کہتا ہوں۔ کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اول یہ مقدمہ سنو!
کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور
مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس اُنکے جواب کیلئے وہی دلیل مطرد ہے
جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے۔ کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل
امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا
عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ دوسرا
مقدمہ یہ سُنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں۔
اسکی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا
ہوں۔ جیسے اقالیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں مثلاً یہاں
اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے۔ یہاں آجکل گرمی ہے
اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے۔ وعلیٰ ہذا یہاں چوبیس گھنٹہ کا دن رات ہے
اور بعض اقالیم میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے۔ اور یہیں سے معلوم ہوا
ہوگا۔ کہ قرآن میں جو آیا ہے۔ کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔ اور
اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں۔ تو یہ اُن کی حماقت ہے۔ اسمیں استبعاد کیا ہے جب عالم
دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے۔ تو
اختلاف، عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو۔ تو کیا تعجب ہے
تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے۔ نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے۔ یہ مقدمہ

بدیہی ہے۔ محتاج دلیل نہیں۔ اور جو شخص کسی حد پر انتہائے اختلاف کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے۔ وہ اس پر دلیل قائم کرے۔ چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جو چیز یہاں عرض ہو اُس عالم میں جا کر جوہر ہو جائے۔ اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شے واحد عرض و جوہر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ایک شے یہاں عرض ہو۔ اور دوسری جگہ جوہر ہو جائے۔ اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے۔ اور تقریباً اس کے طور پر اس کو یوں سمجھیئے۔ کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے۔ حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقولۂ کیف سے سمجھتے تھے جس کیلئے وزن اور مقدار نہیں ہو سکتی۔ مگر اس زمانہ میں اُن کیلئے وزن ہونا ثابت ہو گیا۔ اس لئے میں تو کہا کرتا ہوں۔ کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کیلئے معین و ممد ہیں۔ چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں۔ اور کلام کرتا ہے۔ تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب ہے۔ جن میں حیات کا تلبس ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔ جو نسائی میں موجود ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا۔ کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے تھے۔ کہ جنت و دوزخ تو آسمان و زمین سے بڑی بتلائی جاتی ہے۔ حضور نے ان کو دیوار پر کیونکر دیکھ لیا۔ اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کرایا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔ اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جا سکتی ہے۔ تو خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اُس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اُتار دیا ہو۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھدی ہو۔ جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کو اصلی حالت پر نظر آگئی ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے مثلت لی الجنت والنار۔ یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں سی اُتر آئی تھیں۔ بلکہ آپنے یہ فرمایا کہ وہ

میرے لئے ممثل ہوگئیں۔ اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے۔ تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آجکل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا۔ کہ اس مکان میں کس قدر وزن کی حرارت موجود ہے اور کس درجہ کی برودت ہے۔ اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے۔ اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے۔ تو اس کو کتنا تعجب ہوگا۔ تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا۔ جس کی حقیقت ہے۔ مابہ الوزن کے انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا۔ جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر سے ہے۔ تو اگر دوسرے عالم میں جاکر وہ جوہر ہی بن جاوے۔ تو کیا تعجب ہے۔ اور لیجئے۔ اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو۔ تو اور وزن ہوگا۔ اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو۔ تو اور وزن ہوگا۔ آخر کمی بیشی کیوں ہے۔ پانی کی مقدار تو دونوں حالتوں میں یکساں تھی۔ معلوم ہوا کہ برودت وحرارت کا بھی کچھ وزن ہے۔ اب خواہ اس کو یوں تعبیر کیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے۔ مگر بشرط برودت وحرارت کے۔ آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا۔ تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جاوے کہ یہ عرض جوہر بن جاوے۔ تو کیا تعجب ہے۔ اور سنئیے۔ اطبار کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفرار کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے۔ دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی۔ جو کہ جوہر ہے۔ پس اُس عالم میں عرض کا جوہر بنجانا کچھ بعید نہیں۔ اب پل صراط کی حقیقت سمجھئے۔ گو اس کے بیان کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے۔

حدیث مطرب ومی گو و رازِ دہر کمتر جو	کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمارا

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمے اس کا بیان کرنا لازم نہیں۔ میرے ذمے تو وہی تھا۔ جو میں بیان کر چکا ہوں۔ مگر اس میں حظ نہ آیا تھا۔ اس لئے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے۔ اچھا ہے۔ تو سنئیے پل صراط کی حقیقت شریعت

ہے (کما قال اصحاب الکشف من العرفاء) پس دنیا میں پل صراط کی نظیر شریعت
موجود ہے۔ اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جاکر جوہر بنجائیگی۔ باقی
اور تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے۔ جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہی
جس پر چلنا دشوار ہے۔ اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے۔ جس
پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا کام نہیں۔ کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے
علم و عمل سے۔ تو اس پر چلنے کیلئے دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ایک قوت علمیہ کی
دوسری قوت عملیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ
سے پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر۔ تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت
ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اُس کو قوت
شہویہ کہتے ہیں۔ اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو۔ اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں۔
تو شریعت پر چلنے کے لئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ قوت عقلیہ۔ قوت شہویہ
قوت غضبیہ۔ یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے
ہیں افراط تفریط اور توسط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا۔ شریعت میں افراط عقل
سے بھی کام نہیں چلتا۔ نہ تفریط سے کام چلتا ہے۔ بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا
نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کی افراط کا نام جزبزہ ہے۔ یہ نہایت مضر ہے۔ جب
عقل بہت بڑھ جاتی ہے۔ تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جس
سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے۔ جیسے اہلِ فلسفہ میں ایک فرقہ لا ادریہ مشہور ہے۔ وہ
کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔ اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے۔
کہ ہم ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں۔ اور وہ گدھا نکلتا ہے۔ بہت
لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں۔ اور بہت سے اس کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ بعض
لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے۔ اسی طرح
مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے۔ کوئی غلط۔ تو جب ہمارے حواس
ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے۔ اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ تو یہ

تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہمنے آدمی سمجھا ہے۔ وہ آدمی ہی ہے۔ گدھا نہیں۔ اور جس کو ہم زمین کہتے ہیں۔ وہ زمین ہی ہے۔ آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو۔ بس اب ان کا یہ حال ہو گیا۔ کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے فھو شاکؒ وشاکؒ فی انہ شاکؒ۔ تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی۔ کہ انہوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا۔ اور ہر چیز کا اپنی حد سے آگے نکل جانا مضر ہے میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کیلئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے۔ اور پھر پہاڑ پر بھی اس پر سوار ہو کر چڑھنے لگے۔ یہ غلطی پر ہیں۔ ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گر ینگے۔ اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہنچ کر تھک گئے۔ یہ بھی نہ چڑھ سکے۔ تو ان دونوں کی رائے غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا با کار سمجھا کہ اخیر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا۔ اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کار آمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کیلئے بیکار ہے۔ اسکے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔ یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔ پس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو۔ اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو۔ اس سے آگے فروع میں عقل سے کام نہ لینا چاہئے۔ بلکہ اب خدا و رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے۔ چاہے ان کی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔ دیکھئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ جارج پنجم بادشاہ ہیں۔ اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہدیا جاوے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں۔ اس لئے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے۔ اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں۔ دوسری صورت

صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مانکر پھر بھی ہر قانون میں اُلجھنے لگے۔ کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا۔ تو بتلایئے۔ اس شخص کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا۔ اور عقلاء کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت ہونا معلوم۔ تو پھر انکار کی کیا وجہ۔ ضرور ماننا پڑے گا۔ چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پہچاننے کے لیئے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں اخیر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں۔ یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب خدا کا خدا ہونا مسلم۔ رسول کا رسول ہونا مسلم۔ کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم۔ پھر ہر حکم میں اُلجھنے کا آپ کو کیا حق ہے۔ اور ہر شخص آپ کو بیوقوف بنائیگا۔ اور تمام عقلاء کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے۔ سچ یہ ہے ؎

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت	بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

غرض عقل سے اس وقت تک کام لو جبتک وہ کام دے سکے۔ اور جہاں اس کا کام نہیں۔ وہاں اس کو چھوڑ دو۔ اور حکم کا اتباع کرو تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی۔ اور کیوں نہ ہو۔ وہ بھی تو ایک قوت ہے۔ جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے۔ اور اس کی ایک حد ہے اس سے آگے دوربین لگانے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے۔ اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے بلکہ دوربین وحی سے کام لینا ضروری ہے۔ ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے جس کیلئے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ پیروں کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے تو جب ہر قوت محدود ہے۔ تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی ضرور ہوگی۔ اس کے آگے وحی سے کام لو۔ ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر رستہ نہ ملیگا۔ کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں۔ وہاں تو اتباع رسول کی ضرورت ہے۔ اور اسے

خلاف پیمبر کسے رہ گزید	کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں۔ دیکھئے جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجودین میں سے کون زیادہ حاذق و تجربہ کار ہے اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے۔ پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہیں لکھی۔ اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا۔ چھ ماشہ کیوں نہ لکھا۔ ہم نے کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا۔ اور اگر کوئی اس سے اُلجھنے لگے تو عقلاء اس کو بیوقوف بناتے ہیں۔ اور طبیب بھی صاف کہدیتا ہے۔ کہ اگر تم میرے پاس مجھکو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کروں اُس میں تمکو چون وچرا کا کوئی حق نہیں اور اگر چون وچرا کرتے ہو۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تم مجھکو طبیب نہیں سمجھتے۔ پھر میرے پاس کیوں آئے تھے اور اسکے اس جواب کو تمام عقلاء صحیح کہتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ رسول کو رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جاوے۔ اور بات بات میں الجھا جاوے۔ کہ یہ تو خلاف عقل ہے۔ ہم اُسے کیونکر مان لیں۔ صاحب اگر تمنے رسول کو رسول مان لیا ہے تو ہر بات کو بلا چون وچرا مان لینا پڑے گا۔ اور یہ کہنے کا حق نہو گا۔ کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ ورنہ اس کے یہ معنے ہیں۔ کہ تم نے اب تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا۔ اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جاوے اور امور آخرت میں اسکی کوئی بھی حد نہو۔ صاحبو! جب دنیا کے کام بدون اُس کے نہیں چل سکتے۔ کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جاوے اور بلا چون وچرا دوسرے کا اتباع کیا جاوے تو آخرت کا کام بدون اسکے کیونکر چلے گا۔ کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھالی ہیں۔ ان میں کسی قدر عقل چل بھی سکتی ہے۔ پھر بھی ان کو چھوڑ کر کاملین و ماہرین کی تقلید کی جاتی ہے۔ اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں۔ وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلیگا۔ اور اگر اسمیں

عقل سے کام لیا گیا۔ تو وہی مثال ہوگی۔ جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ شان ورود اس کا یہ ہے۔ کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لئے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا۔ پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے۔ کہا سفید ہوتی ہے۔ حافظ جی نے سیاہ سفید میں کیوں فرق کیا تھا۔ اُن کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ۔ کیونکہ آنکھیں ہی نہ تھیں۔ تو آپ پوچھتے ہیں کہ سفید کیسا ہوتا ہے۔ اُس نے کہا جیسے بگلا۔ حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ لڑکے نے ہاتھ کو اس طرح موڑ کر (۸) کہا کہ ایسا ہوتا ہے۔ حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے۔ بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ میرے گلے سے کیونکر اُترے گی۔ تو دیکھئے۔ جو چیز آنکھ سے نہ دیکھی ہو۔ اس میں عقل سے کام لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا۔ جس میں چبانے اور نگلنے کی بھی مشقت نہ تھی۔ اب وہ گلے میں پھنسنے لگی۔ تو واقعی اندھے کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے۔ اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق میں رہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سوانکھے کی تقلید کرلی جائے۔ اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے کبھی آم نہ کھایا ہو۔ آم کا مزہ سمجھانا چاہو۔ تو کیا وہ سمجھ جائیگا۔ ہرگز نہیں۔ تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے۔ وہ کہیگا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں۔ بس آم ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ صاحب! اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آم لاکر اُسے کھلا دو۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہیئے۔ اور اپنی عقل سے اسکی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں۔ اسی طرح اُمور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اُسکی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو۔ مرنیکے بعد صراط اور وزن اعمال وغیرہ کی سب حقیقت سامنے آجائے گی۔ اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہو۔ تو اُس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن و رسول نے جو کہدیا ہے اُس کی تقلید کرو۔ اور ان کی نظیریں دریافت کرنیکے درپے نہ ہو۔ مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت الٹی ہی سمجھو گے۔ جیسے حافظ نے کھیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا۔ بس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے۔ جس سے بڑھ جانا مضر ہے۔ اطبا نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے۔ اور امراض میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ افراط عقل کا نتیجہ اوہام

وشکوک میں ابتلا ہے۔ جس سے قلب و دماغ دونوں ضعیف ہوجاتے ہیں۔ فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوہ بیچتا پھرتا تھا۔ اُس سے پوچھا کیف تبیع الحلوۃ تو حلوہ کس طرح بیچتا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ کذا اجد انی کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں۔ تو آپ کہتے ہیں اسئلک من الکیفیۃ وتجیبنی عن الکمیۃ میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے۔ آپ حلوائی سے اُلجھ گئے۔ اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اُسی کے چکر میں رہے۔ چنانچہ افراط عقل کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا۔ اور جب عاجز ہوگئے۔ تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا۔ مگر کہنے لگے کہ یہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں۔ ہمکو نبی کی ضرورت نہیں۔ نحن قوم قد ھذبنا نفوسنا بالحکمۃ ہمنے تو اپنے کو . . . . حکمت سے مہذب بنالیا ہے۔ حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں فرحوا بما عندھم من العلم۔ یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہوگئے۔ اور یہ نہ سمجھے۔ کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں۔ چنانچہ الٰہیات میں فلاسفہ نے تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کہ آج مسلمانوں کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے یہ تو افراط فی العقل ہے۔ اور ایک ہی تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی۔ اس کو حماقت کہتے ہیں شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں۔ بلکہ مطلوب توسط ہے۔ جس کو حکمت کہتے ہیں۔ دوسری قوت شہویہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کا نام فجور ہے شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں کیونکہ اس کا انجام فسق ہے۔ اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بنجائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو۔ یہ بھی مطلوب نہیں۔ کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہوجاتا ہے اور اُلو العزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہوجاتے ہیں۔ جو بڑا نقص ہے۔ اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے۔ یہ مطلوب ہے۔ تیسری چیز قوت غضبیہ ہے۔ اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کو تہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھلانے لگے۔ جیسا آجکل ہورہا ہے۔ کہ جس طرف چلتے ہیں۔ جوش میں اندھے بنکر چلتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہوگا یا نقصان۔ یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں۔ اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے

ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جاوے۔ جیسے بعضے لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے۔ یہ بھی مطلوب نہیں۔ اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے۔ یہ مطلوب ہے اس کا حاصل یہ ہے۔ کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے۔ جہاں نفع کا ظن غالب ہو اور بے موقع جوش سے کام لیا جائے۔ جہاں نفع کی کچھ اُمید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔ غرض اخلاق پسندیدہ کے اُصول تین ہیں۔ حکمت[1]۔ عفت[2]۔ شجاعت[3]۔ اور اُن کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے۔ اور قرآن میں جو فرمایا ہے۔ وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً۔ اس سے بھی عدل مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسی شریعت دیکر جو کہ سراپا عدل ہے۔ امت وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔ ایک مقدمہ اور لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وسط حقیقی۔ ایک وسط عرفی۔ وسط حقیقی وہ خط ہے جو بیچوں بیچ ہو۔ وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا اور ایک وسط عرفی ہے۔ جیسے کہا کرتے ہیں۔ کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے۔ تو وہ وسط حقیقی نہیں۔ کیونکہ وہ تو منقسم ہے۔ اس کے اندر بھی ایک جز دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے۔ پھر وہ وسط حقیقی کہاں ہوا حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے۔ سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ پس سمجھ لو۔ کہ شریعت اس وسط کا نام ہے۔ جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو۔ بلکہ عین توسط ہو۔ یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے۔ اور یہی کمال ہے۔ اور اوپر معلوم ہو چکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے۔ تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جن اُصول اخلاق کو ہم نے بیان کیا ہے۔ ان میں افراط تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔ پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونیکے بال سے باریک ہوگی۔ کیونکہ بال بھی منقسم ہے۔ اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے۔ پس قیامت میں بھی روح شریعت یعنی وسط حقیقی جوہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جاویگا۔ پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت

کے ساتھ چلا ہوگا۔ وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلیگا۔ کیونکہ وہ بھی شریعت تو ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے۔ اور جو یہاں نہیں چلا۔ یا کم چلا ہے۔ وہ پل صراط پر بھی نہ چل سکیگا۔ یا سُستی کے ساتھ چلیگا۔ لیجئے میں نے آپ کو پل صراط کی نظیر بھی دکھلادی۔ ابتو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شرعیات کیلئے عقلی نظائر موجود ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ پلصراط ہی کی خصوصیت ہے۔ لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے۔ ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ ؎

ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم	از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لئے بیان کردی تاکہ معلوم ہو جائے۔ کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں۔ اور سمجھ میں آجائے کہ علم شریعت کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں جس سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کردیا ہے۔ تاکہ آپ علمائے اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں۔ بحمد اللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن۔ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں اُفتد راز	ورنہ در مجلس رنداں بے خبرے نیست کہ نیست

(تفصیل الدین ص۳۵ تا ۵۲)

(۳۰) نو تعلیمیافتہ طبقہ کی اس رائے کا جواب کہ مولوی سب باہم متفق ہو جائیں تو سارا باہمی نزاع دور ہو جائے

واقعی یہ ایک قیمتی رائے ہے۔ مگر اس میں ایک دھوکا اُن صاحبوں کو ہو رہا ہے جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اول اس کی ایک نظیر پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ آجکل بدوں اسکے لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ اس وقت یہ بات سب کو مسلم ہے۔ کہ اہلِ یورپ آجکل سب سے زیادہ متمدن ہیں۔ بالخصوص انگریز دنیاوی اُمور میں اُن کی عقل فہم سب سے زیادہ حجت سمجھی جاتی ہے۔ اُن کا ایک قانون ہے کہ جب کوئی عدالت میں جاکر نالش کرے تو حاکم کو اس کی تنقیح کرنی چاہئے۔ شہادت اور ثبوت طلب کرے اور وکلا طرفین میں گفتگو ہو۔ اور

اخیر تک حاکم سب کی گفتگو سنتا ہے۔ پھر اپنی رائے کیموافق کسی ایک کو ترجیح دے کر ڈگری دیتا ہے اور اس درمیان میں ظاہر ہے کہ ہر ایک وکیل اپنے مؤکل کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور طرفین میں اچھی طرح مباحثہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کوئی تعلیم یافتہ اس طریقۂ تنقیح میں اس حاکم کو ظالم کہے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر ایک شخص اس کو عدل کے مواقف سمجھتا ہے۔ بس اگر نا اتفاقی بُری چیز ہے۔ تو ان وکلا طرفین کو کیوں نہیں ملامت کی جاتی اور سب سے زیادہ اس حاکم کو ملامت کرنی چاہیے جس نے اپنی کچہری میں نزاع اور بحث قائم ہونے دی۔ اور اسی پر اپنے فیصلہ کی بنیاد ڈالی۔ مگر جب اس منازعت کو قابل ملامت نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اس کو عین عدل کہا جاتا ہے۔ تو اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ منازعت اور نا اتفاقی مطلقاً بری نہیں۔ بلکہ طریقہ یہی۔ کہ اول معاملہ کی تنقیح کی جاتی۔ اور قبل تنقیح کے دونوں میں سے کسی کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔ اور تنقیح کے بعد جو حق معلوم ہو۔ اس کا ساتھ دو۔ اور جو ناحق پر ہو اس کو ملامت کرو۔ یہ کیا کہ دونوں کو ملامت کی جاتی ہے۔ اور دونوں کو اس اختلاف چھوڑنے اور اتفاق کر لینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں ایسا اتفاق ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اگر حاکم بھی ایسا ہی کرے کہ دونوں فریق کو ملامت کرنے لگے تو کیسے ہو مگر دنیاوی معاملات میں یہ نو تعلیم یافتہ بھی اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے اور ہمیشہ ایک فریق کا جو حق پر معلوم ہو ساتھ دیا کرتے ہیں۔ پھر دین کے بارہ میں یہ قاعدہ کیوں نہیں برتا جاتا۔ اس سے ایک راز معلوم ہوا۔ کہ ان لوگوں کے دلوں میں دین کی وقعت و عظمت کوئی چیز نہیں اس لئے اس کی کچھ فکر ہی نہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ اگر حاکم کے برابر بھی اُن کے نزدیک مذہب کی ضرورت ہوتی تو یہ ہمیشہ صاحب حق کی مدد کرتے یہ کیا کہ زید کو بھی ملامت عمر کو بھی ملامت اُس کو بھی اتفاق کی ترغیب اس کو بھی۔ آخر کس بات میں دونوں متفق ہوں کس بات کو قبول کریں۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جس میں اتفاق ہو سکے تو خیر۔ جب اعتقاد کا اختلاف ہے۔ ایک فریق حضرت علیؓ کو نبی سمجھتا ہے۔ دوسرا فریق ایسا نہیں سمجھتا ایک فریق ابو حنیفہؒ کو فقیہہ مجتہد سمجھتا ہے۔ دوسرا ان کو مخالف خدا اور رسول جانتا ہی

تو اب بتلاؤ۔ کہ اتفاق کی کیا صورت ہے۔ دونوں کے عقائد میں تضاد ہے۔ اب سوا اس کے کہ ایک فریق اپنا عقیدہ بدلے اس کے سوا کوئی صورت اتفاق نہیں اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہ کر اتفاق ہرگز متصور نہیں۔ البتہ اگر مذہب و عقیدہ کوئی ضروری چیز نہ ہو۔ تو پھر واقعی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کو بجز ان نو تعلیم یافتہ حضرات کے کوئی عاقل بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور زبان سے تو یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگرچہ دلوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں دوسرے اس طریقہ پر دنیاوی امور میں بھی عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے مجلس میں ایک بات نکالی۔ تو اس میں بھی دو چار اختلاف کرنے والے ہو جائیں گے۔ اب اگر ان دونوں فریق کو ملامت کی جائے اور اتفاق کی ترغیب دی جائے۔ تو سو قباحتیں آجائیں گی۔ مگر اتفاق ناممکن ہو گا۔ پس آپکا طریقہ تو ایسا ناتمام ہے۔ کہ نہ دین میں کار آمد اور نہ دنیا میں۔ اب میں بتلاتا ہوں کہ اتفاق کیونکر ہو۔ پہلے آپ خود تحقیق کیجئے کہ صورت معاملہ کیا ہے۔ پھر جو حق بجانب ہو اُس کا ساتھ دیجئے اور دوسرے کو ملامت کیجئے اور پہلے کا تابع بنائیے۔ یہ جو دونوں کو ملامت کی جاتی ہے سخت غلطی ہے۔ اس زمانہ کے نوجوانوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ اتفاق کو محمود اور اختلاف کو مذموم سمجھ کر علماء کو یہ مشورہ دیتے ہیں۔ کہ آپس میں اتفاق کر لو۔ پس انکی اتنی بات تو قابل تسلیم ہے۔ کہ واقعی نزاع و اختلاف بُری چیز ہے۔ اُسکے زایل کرنیکا جو طریقہ بتلایا جاتا ہے۔ کہ دونوں کی ملامت کر کے اتفاق کی دونوں کو ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ بالکل سراسر عقل کے اور فطرت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ صاحب باطل کچھ صاحب حق کا اتباع کرے اور صاحب حق کچھ صاحب باطل کا اتباع کرے کہ پہلے ایک فریق جو خالص حق پر تھا تو اب وہ بھی باطل کا پیرو ہو جاوے۔ اسکو فطرت انسانیہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ عجب بات ہے کہ یہ لوگ خلاف فطرت کی تعلیم کو ہمیشہ ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ مدعی فطرت ہیں۔ مگر دین میں نہ معلوم وہ فطرت کیا ہو جاتی ہے جو خود خلاف فطرت کی تعلیم دیتے ہیں۔

(وحدۃ الحب ص ۸۲)

(۱۳۱) مساوات نسائی کے مسئلہ کے متعلق جو نزاع ہو رہا ہے۔ اس کا فیصلہ

آجکل کے نوجوانوں کا یہ دعویٰ مساوات محض زبان سے ہی ہے۔ عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے۔ ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا۔ کہ وہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں ایسے لوگوں کی تقلید پابند مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے۔ پھر اُن کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر نہ کی۔ کہ اس مساوات کا اثر اُن کے حق میں مفید ہوا۔ یا مضر۔ غرض بالکل کورانہ تقلید کر کے مساوات نسار کے قائل ہونے لگے۔ جب خدا ہی نے عورت کو تشریعاً و تکویناً محکوم بنایا ہے۔ تو اس کو برابر کون کر سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کا عورتوں کو محکوم بنانا۔ جیسا کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے۔ دلیل عقلی سے بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بات پر سارا عالم متفق ہے۔ کہ عورتیں مرد سے کم ہیں۔ بہت سی باتوں میں۔ اس کا کسی کو انکار نہیں۔ اور جس بات پر ساری دنیا کا اجماع ہو۔ وہ عینی تقاضا اور فطری قانون ہوتا ہے۔ عقلی دلیل کے علاوہ حسی دلیل بھی اس بات پر قائم ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں...

....

.... چنانچہ مشاہد ہے۔ کہ خدا نے عورت و مرد کی خلقت میں کتنا فرق رکھا ہے۔ مرد جسمانی قوت میں عورت سے زیادہ ہوتا ہے عقل مرد کی زیادہ ہوتی ہے۔ آواز مرد کی بلند ہوتی ہے۔ مرد عورت سے رائے میں زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ اور عورت کو دیکھا جائے۔ تو اس کی ہر چیز مرد سے کم نظر آتی ہے۔ ظاہری اعضار کی بناوٹ میں بھی اور عقل و رائے میں بھی۔ قرآن میں حق تعالےٰ کفار کی خرابی عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ام اتخذ مما یخلق بنات و اصفٰکم بالبنین یعنی کیا خدا تعالیٰ نے اپنے لئے مخلوقات میں سے لڑکیاں تجویز کی ہیں۔ اور تم لڑکوں کے ساتھ منتخب کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں اومن ینشؤ فی الحلیۃ وھو

فی الخصام غیر مبین۔ کہ خدا تعالیٰ کیلئے تجویز ہی کیں تو لڑکیاں جو ابتدا ر سے زیور اور گہنے میں پرورش پاتی ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ قوت بیانیہ میں نہایت ضعیف ہیں یہ دو باتیں عورتوں میں نقص کی ایسی ہیں۔ کہ آنکھوں سے دیکھ لو۔ واقعی لڑکیوں میں ابتدا ہی سے زیور کا شوق ہوتا ہے۔ اور یہ دلیل ہی اُن کی محدودیت نظر کی۔ چنانچہ خود مردوں ہی میں دیکھ لو۔ جس کو زینت کا شوق ہوگا اُس کے خیالات پست اور محدود ہوں گے اور جو سادہ ہوگا۔ اُس کے خیالات عالی ہونگے اور اس کا راز یہ ہے کہ لباس وغیرہ ضرورت کی چیزیں ہیں۔ اصل مقصود نہیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ ضرورت کی چیزوں سے کتنا تعلق ہونا چاہیئے۔ سو ظاہر ہے کہ ہر عاقل ضرورت کی چیزوں سے بقدر ضرورت تعلق رکھیگا اور زیادہ کوشش اصل مقصود میں کریگا۔ وہ شخص نہایت پست خیال ہے جو غیر مقصود چیزوں کی دھن میں لگا رہتا ہو۔ پس لڑکیوں کو زیور اور زینت سے غنیت ہونا ان کی پستیٔ خیالات کی دلیل ہے۔ مرد اکثر سادہ ہوتے ہیں۔ ہاں جن مردوں پر زنانہ پن غالب ہو یہاں اُن کا ذکر نہیں۔ تعلیم یافتہ قوموں کو بھی دیکھ لیجئے۔ تجربہ کار لوگوں کا بیان ہے کہ اُن کی عورتیں باوجود تعلیم حاصل کر لینے کے پھر مردوں سے بہت کم ہیں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ اگر ان میں کسی عورت کو کچھ بیان کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ چند جملے کہکر بیٹھ جاتی ہے مردوں کی طرح اس کی گفتگو میں کبھی وسعت نہیں ہوتی۔ تو یورپ کی عورتیں بھی لیاقت علمی میں مردوں کے برابر ہرگز نہیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ دستکاری میں یا کسی خاص سلیقہ میں برابر یا زیادہ ہوں۔ غرض جس کو قدرت نے محکوم بنایا ہو۔ اُسکو مساوی کون کر سکتا ہے۔ اور یہ محکومیت عورتوں کیلئے خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے (اور یہ اس لئے کہا گیا تاکہ عورتیں اس تقریر کو سُن کر دلگیر نہ ہوں)۔ نعمت اس لئے ہی۔ کہ اگر دنیا میں سب برابر درجے کے ہوتے تو انتظام قائم نہ رہ سکتا تو یہ ضروری بات تھی کہ ایک گھٹا ہوا ہو۔ دوسرا بڑھا ہوا۔ اگر سارے حاکم ہی ہوتے۔ تو کاشتکاری کون کرتا۔ عمارت کون بناتا۔ آٹا کون پیستا۔ غرض دنیا کا انتظام اس کو چاہتا ہے کہ سب ایک درجے کے نہوں۔ بلکہ ایک بادشاہ ہو۔ ایک وزیر۔ کوئی حاکم کوئی رعیت

کوئی تاجر۔ کوئی مزدور۔ یہ فرق مراتب ضروری تھا۔ ہاں۔ اس فرق مراتب کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ عورتیں بڑھی ہوئی ہوتیں۔ وہ گھٹے ہوئے۔ مگر چونکہ ان کی عقل ورائے ضعیف ہے۔ اس لیے تمدن خراب ہوجاتا۔ وہ خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ دوسروں پر حاکم بن کر اُن کی نگہبانی تو کیا کریں۔ بیوقوف کے لئے یہی مصلحت ہے کہ کسی کے تابع ہو کر رہے۔ اگر کسی بیوقوف کو حاکم بنا دیا جائے تو دیکھو انجام کیا ہوگا۔ خود بھی ہلاک ہوگا۔ دوسروں کو بھی تباہ کریگا۔ اگر چھوٹے بچے کو ماں باپ کا تابع نہ کیا جائے۔ تو وہ یقیناً ہلاک ہوگا..

...... کیونکہ اس کو اپنے نفع اور ضرر کی کچھ خبر نہیں۔ تو بیوقوف کیلئے کسی کا ماتحت ہونا بھی مصلحت ہے تاکہ دوسرا اس کو روک ٹوک کر سکے۔ اور یہی راز ہے۔ اس حدیث کا جو حضور سے مروی ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس کی حاکم عورت ہو کسریٰ شاہ فارس کی بیٹی جب بادشاہ ہوئی تھی اُسپر آپنے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا یہیں سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آجکل ہماری خرابی و خستگی کا باعث ایک یہ امر بھی ہے کہ ہمنے عورتوں کو اپنے گھر کا حاکم بنا دیا ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی حکومت ہے مگر اس کا نتیجہ بھی خراب ہی ہے مثلاً شادی بیاہ کی ساری رسمیں عورتوں ہی کی خواہش سے پوری کی جاتی ہیں جس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے کسقدر خاندان ان رسوم شادی میں تباہ ہوگئے۔ یہ سارا فساد عورتوں کے حاکم بنانے کا ہے۔ عورتوں کی دلجوئی کرنا ضروری ہے۔ مگر ان کے تابع بنمنا بُرا ہے۔ اس وقت سارا مال و اولاد عورتوں کے قبضہ میں ہم نے کر دیا ہے۔ پھر دیکھ لیجئے روپیہ کیسے بیجا مواضع میں صرف ہوتا ہے۔ اور بچوں کی صحت خراب اور اخلاق تباہ ہورہے ہیں۔ عورتیں بچوں کو جو چاہیں کھلا پلا دیتی ہیں۔ جس سے اُن کی زندگی بیماری میں کٹتی ہے۔ محبت و پیار حد سے زیادہ کرتی ہیں جس سے لڑکے شوخ ہوجاتے ہیں۔ تو اپنے مال و اولاد کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہیئے۔ عورتوں کو حاکم کر دینا سخت باعث تنزل ہے جس کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے فرما گئے ہیں۔ اس حدیث پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض متمدن قوموں میں عورتیں حاکم ہوتی ہیں اور بعض جگہ اب بھی یہاں

اور پھر اُن کو ترقی ہے۔ اوّل تو مال و مادیات کی ترقی فلاح نہیں۔ فلاح قومی کی اصل ترقی اخلاقی و علمی و روحانی ہے۔ تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جن قوموں میں عورت بادشاہ ہے۔ اُن کو یہ ترقی نصیب ہوئی۔ دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے۔ کہ اُن کی ترقی حقیقی ترقی ہے۔ تو ہم کہیں گے۔ کہ یہ اس کا اثر ہے۔ کہ ان میں عورتیں خودمختار حاکم نہیں محض ضابطہ کی حاکم ہیں۔ اصل بادشاہ پارلیمنٹ ہے۔ تو ایسی حکومت کوئی حکومت نہیں۔ نام کی بادشاہت ہے۔ اس سے مضمون حدیث پر کوئی غبار نہیں آسکتا میں نے اس حدیث کو اس وقت اسی لئے پڑھ دیا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت جو ہم نے گھر باہر کا حاکم عورتوں کو بنا رکھا ہے۔ اس کو بھی ہماری پستی اور تنزل میں دخل ہے۔ اور آجکل ہم پر یہ ایسی تباہی آ رہی ہے کہ بجائے متبوع بننے کے عورتوں کے بالکل تابع ہو گئے۔ اور غضب یہ ہے کہ عذر کے موقع میں کہا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں عورتیں نہیں مانتیں۔ سو یہ کہنا کتنی کم ہمتی کی بات ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک بہانہ ہے جس بات کو ان کا خود جی چاہتا ہے۔ اس میں عورتوں کے کہنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ورنہ جس بات کو ان کا جی نہ چاہے۔ مثلاً بعض لوگ اپنی عورتوں کو باپ کے گھر نہیں جانے دیتے اس میں عورتیں لاکھ تقاضا کریں کبھی نہیں مانتے۔ بس اوّل تو یہ عذر بالکل غلط ہے۔ اور اگر سچ ہے تو اور بھی بُرا ہے۔ کہ مرد ہو کر بیوی کے غلام بن گئے۔ غرض عورت کیلئے یہی مصلحت ہے کہ مرد کے تابع ہو کر رہے۔ اور شریعت نے بھی عورتوں کو محکوم ہی بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے الرجال قوامون علی النساء (شعب الایمان[۱۰۳])

(۱۳) بعض تعلیم یافتہ لوگوں کے اس خیال کی تردید کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں

میں اس وقت ایسے مسلمانوں سے ملا ہوں جن کا خیال ہے کہ جنت اور دوزخ کوئی چیز نہیں محض تخویف اور ترغیب کیلئے یہ نام بیان کئے گئے ہیں۔ نعوذ باللہ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جتنی وعیدیں چوری اور زنا ظلم و ستم۔ کفر و معصیت پر ہیں۔ یہ سب ایسی ہیں۔ جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے۔ کہ چپ رہو۔ ہوا آ جائے گا۔ ویسے ہی جتنے انعامات جنت

وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بھی محض بھسلانا ہے۔ جیسا کہ بچوں کو بہلایا کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے جواب میں کہتا ہوں۔ کہ اوّل تو یہ بات ایک ادنیٰ عالم کے کلام میں ہونا سخت عیب ہے۔ چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے کلام میں ہو۔ کیونکہ اس کو تو جھوٹ موٹ بہکانا بولتے ہیں۔ اور خدا جھوٹ سے بالکل بری ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علوا کبیرا و من اصدق من اللہ حدیثا۔ لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ جنت و دوزخ محض ترغیب و ترہیب کیلئے ہے۔ اور واقع میں کچھ نہیں۔ تو رغبت و رہبت اُسی وقت تک ہو سکتی ہے جبتک کہ مخاطب کو یہ راز معلوم نہو کیونکہ ظاہر ہے کہ بعد اصل حال معلوم ہو جانیکے کہ یہ ترغیب ترہیب ایک غیر واقعی امر ہے۔ رغبت و رہبت بالکل نہیں رہ سکتی۔ پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرنا۔ کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں۔ سراپا غلط ٹھیرا۔ غرض اوّل تو اس کے خلاف واقع ماننے سے معاذاللہ کلام اللہ پر لغویت کا دھبہ آتا ہے جس کو کوئی مسلمان کلام الٰہی کے لئے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ پھر جو مقصود شارع کو ان وعیدوں اور انعاموں کے بیان کرنے سے ہے۔ کہ لوگوں کو مکلّف و مقید بنایا جائے اس صورت میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا۔ ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارہ میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں۔ یقیناً ارتکاب جرائم میں دلیر ہوگا۔ اول تو یہ سب کے سامنے جو چاہے کریگا۔ اگر سامنے کرنے میں کسی کا پاس و لحاظ ہوا۔ تو تنہائی میں تو ہرگز نہ چوکیگا۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے۔ اور وہاں ایک دوسرا شخص بھی موجود ہے۔ سوائے ان دونوں شخصوں کے وہاں کوئی موجود نہیں نہ پولیس۔ نہ چوکی پہرہ۔ اب فرض کرلو کہ اتفاق سے اس دوسرے شخص کی موت آگئی۔ اور اس کے پاس ایک لاکھ روپے کا نوٹ ہے۔ اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ فلاں خاندان کا اور فلاں شہر کا باشندہ ہے۔ اور یہ بھی اُسے خبر ہے۔ کہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر اس واقعہ کی کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا اور اس کے پاس مرتے وقت کیا سامان تھا۔ نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے۔ نہ مقدمہ چل سکتا ہے۔ بتلائیے ایسی حالت میں یتیم بچے

تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی قوت اس شخص کو بجز خوفِ خدا۔ و عذاب آخرت کے مجبور کر سکتی ہے۔ اور کیا ایسا شخص جو وعید الٰہی کو محض تخویف سمجھتا ہے۔ اس روپے کو اصل وارث تک پہنچا دیگا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ اس کو روپے کی حاجت بھی ہو۔ یہ اُسی شخص کا کام ہے۔ جو خدا کے تمام وعدوں وعید کو حق سمجھتا ہے۔ اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے۔ اس گندے عقیدہ سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں۔ مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہوئے جاتے ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ تمدن کیلئے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے۔ صرف حکومت سے تمدن ہرگز قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حکومت کا زور ظاہر تک منحصر ہے۔ دلمیں شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں۔ اگر کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہو گا۔ مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ دعوےٰ تمدن کے بعد مذہب سے لاپرائی کرنا ایسا ہی ہے کہ ؎

یکے بر سرِ شاخ و بن می برید　　　خداوند بستان نگہ کرد و دید

تو یہ لوگ جس تمدن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُسی کی جڑ کو کاٹ رہے ہیں۔ پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدن ثابت کی جاتی ہے۔ اور فعل سے اس کی نفی کرتے ہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہو گیا۔ کہ جنت و دوزخ واقعی چیزیں ہیں۔ اور یہ اسلام کا مسلمہ مسئلہ ہے (شعب الایمان صـ۱۰۸)

(۳۴) ڈارون کے اس کہنے کی تردید کہ اصل انسان بندر ہے

کتنے افسوس کی بات ہے۔ کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک ملحد ہے وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلقہ موجود تھا اور پھر تحرک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی۔ اور شمس وغیرہ بنا۔ اور اس کے بعد پھر نباتات بنے۔ پھر حیوانات بنے۔ ان میں بندر بنا۔ اور بندر یکایک تعبت کر کے

انسان بن گیا - اسی طور پر وہ تمام حیوانات و نباتات میں اسی کا قائل ہی کہ ایک دوسرے سے نکلتے چلے آئے ہیں - تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر تو شبہ کیا جاتا ہی - اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہی - یہی ایمان ہے ؟ ڈارون تو صانع کا قائل نہیں تھا - اس لئے ایسی بعید اور بیہودہ تاویلیں کرتا تھا - مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہی - کہ صانع کو مانتے ہیں - اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں - شاید کوئی یہاں یہ کہے کہ ہمکو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس سے ہوتا ہی کہ حکما کا تو مشاہدہ ہے اور اسی بنا پر ہمکو قرآن پر شبہ ہی کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہی میں کہتا ہوں کہ آپکا مشاہدہ کی حقیقت کو ہی نہیں جانتے ہیں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہی کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہو گئی - پھر شمس و کواکب ہوئے - نباتات ہو گئی اور نباتات سے حیوانات اور حیوانات میں ایک خاص نوع بندر بھی تھی - پھر بندر یکا یک جست کر کے انسان ہو گیا - یہ سب ڈھکوسلے ہیں - ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان مقرین بالقردیتہ کو بھی بندر نہ بننے دیں - آدمی ہی بنائیں - یہی مشاہدات - انہی ڈھکوسلوں اور مہمل اور وہمی باتوں کو مشاہدات قرار دیکر خدا اور رسول پر شبہات اور اپنے کو مسلمان کہتے ہیں افسوس کی بات ہی - کیا یہ مشاہدہ ہے - کہ آفتاب کو سکون ہے - زمین کو حرکت ہے - خیر ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس کو سکون ہو اور کس کو حرکت - کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں - مگر یہ سوچ لو کہ اتنا بڑا دعوی کس بنا پر ہے - دلیل کچھ بھی نہیں - مگر ہم کہیں گے - کہ الشمس تجری - چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے - اس لئے آفتاب کے ساکن محض ماننے سے گنہگار ہوں گے - زمین کو چاہے آپ ساکن نہ مانئے متحرک محض مانئے - مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا - شاید کسی کو یہ شبہ ہو - کہ وجعلنا فی الارض رواسی الخ سے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے - پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں - جواب یہ ہے - کہ اس سے نفی حرکت اضطرابیہ کی مراد ہے - غیر اضطرابیہ کی نفی مراد نہیں - غرض اس کی آپکو اجازت ہے - کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک مانیں کچھ حرج نہیں - اسی طرح اس طرح اس کی خبر دی

دی گئی ہے۔ کہ آسمان موجود ہے۔ یہ کون سے مشاہدہ کے خلاف ہی۔ گو اس نظام طلوع وغروب کے لئے سمٰوات کی ضرورت نہو۔ لیکن نظام خاص میں ضرورت نہونا نفی کی تو دلیل نہیں ہوسکتی آسمان دوسری مستقل دلیل سے ثابت ہے۔ اس کی نفی کرنا جائز نہیں۔ یہ کس مشاہدہ سے ثابت ہوا۔ کہ آسمان نہیں ہے۔ بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر مان کر آسمان کی نفی کا ہمیں جواب سکھا دیا کیونکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آتا۔ کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے۔ یہی آسمان ہے۔ پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے۔ تو نظر کیوں نہیں۔ ہم یہ کہیں گے۔ کہ نظر اس لئے نہیں آتا کہ آپ نے اسی سقف نیلی کو حد نظر مان لیا۔ پس جب یہ حد نظر ہے تو آسمان اس کے آگے ہے۔ اور چونکہ نظر کی یہاں تک انتہا ہوجاتی ہے اس لئے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آپ کو آسمان کے نفی کرنے کی بالکل گنجایش نہیں رہی۔ اب اس شبہ کی بالکل گنجایش نہ رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی تکذیب نہیں کرتے۔ بلکہ مشاہدہ کی بناء پر جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں۔ کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا اور قرآن مجید میں سکندر ذوالقرنین کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کیچڑ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا۔ بھلا دیکھو کتنا مشاہدہ کیخلاف ہے۔ آفتاب ایک جرم عظیم ہے۔ زمین سے کتنا ہی حصے بڑا ہے۔ کہیں زمین کی دلدل اور کیچڑ میں غروب ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آئے گا۔ یعنی قرآن مجید میں وجدھا الخ وارد ہوا ہے۔ یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا۔ یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ یہ نہیں فرمایا غربت فی حمئۃ جہاز پر سوار ہوکر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر ہیں سے نکلتا ہے۔ اور اسی میں ڈوب رہا ہے۔ اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع وغروب کا۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا زمین ہی میں گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا اب فرمائیے۔ مشاہدہ سے کہاں تعرض ہے۔ تعرض کہیں بھی نہیں۔ پھر افسوس ہی کہ مسلمان ہونیکا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور قرآن اگر فیثا غورث کے قول کے مخالف ہو۔ تو قرآن پر

خلاف منشاء کا شبہ کرتے ہیں۔ فیثا غورس کے قول پر خلاف واقع ہونیکا شبہ نہیں ہوتا۔ اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی۔ غرض یہ ہے کہ نئے مذاق میں یہ خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ سائنس والے جو کہدیں اس پر تو آمنا و صدقنا۔ اور قرآن پر شبہات (الوقت۔ صفحہ ۱۲)

(۳۴) اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب ہو۔ تو ناجی کیوں نہیں۔

ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے۔ مگر ہمیشہ قانون کے خلاف عمل کرتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے جوا بھی کھیلتا ہے۔ اور بد تہذیب بھی ہے۔ تو ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے۔ اس لیئے اُسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کیلیئے مردود نظر نہ ہوگا۔ بلکہ صرف اختتام سزائے معین تک اور اس کے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائیگا۔ برخلاف اس شخص کے جو کہ نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو۔ مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ تو اسکو بغاوت کی یہ سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا۔ یا پھانسی دیدیا جائیگا۔ اور ہمیشہ کیلیئے معتوب رہیگا۔ اے صاحبو! سمجھ لیجیئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے۔ اگرچہ نماز روزہ کرے۔ اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لیئے مردود بارگاہ ایزدی ہوگا۔ اگر توبہ نہ کرے۔ برخلاف اُس شخص کے کہ جو نماز روزہ کچھ نہیں کرتا۔ اور ہر قسم کے معاصی میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر عقائد اچھے ہوں۔ تو اسکو وہی میعادی سزا خلاف قانون عمل کرنے کی ہوگی۔ اگر توبہ نہ کرے۔ لیکن باغیوں میں شمار نہ ہوگا۔ اور اختتام سزا کے بعد پھر وہی حق تعالیٰ کی محبوب رعایا۔ یعنی جنتیوں میں داخل ہو جائیگا۔ مگر یہاں پر بعضے شبہ کیا کرتے ہیں۔ کہ جب کسی غیر مسلم میں اخلاق و اعمال شائستہ ہوں۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ ناجی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ پر بھی اعتراض کیا ہوتا۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ جب ایک باغی مہذب ہے۔ بقیہ جرائم قانونی

سے بھی محفوظ ہے۔ پھر کیوں اس کو سزا ہوئی ہے۔ اس کے سزا ہونیکی وجہ یہ ہے کہ جب وہ باغی ہے تو اس کے سارے کمالات ہیچ در ہیچ ہیں۔ پس اسلامی قانون بھی ایسا ہی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جتنے شبہے اسلام پر ہیں اپنے معاملات میں غور کریں تو سب کا جواب نکل آئیگا۔ مگر غور کون کرے۔ دین تو آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ افسوس کیسی آفت ہے کیسا طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔

(الوقت ص ۱۲۹)

(۳۵) اس اعتراض کا جواب کہ آدمی علم دین پڑھکر کم عقل ہو جاتا ہے

فرمایا میں اکثر وعظ میں بیان کیا کرتا ہوں کہ فی زمانہ جو اہل علم کم عقل مشہور ہیں اور ان کو دیکھ کر لوگ علم دین پڑھانے میں یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ عربی پڑھکر آدمی بیوقوف ہو جاتا ہے۔ یہ عذر کرنیوالے ذرا غور تو کریں۔ کہ یہ بیوقوفی انہیں کی نامعقول تجویز کا ثمرہ ہے کسی چیز کے پڑھنے سے عقل نہیں بڑھا کرتی ہے۔ ہاں علم بڑھتا ہے عقل تو ایک فطری شے ہے۔ اب اہل علم کے بیوقوف ہونیکی وجہ ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ عادت یوں ہو گئی ہے کہ سب اولاد میں جو بیوقوف۔ گنجا۔ اندھا۔ لنجا۔ یعنی جس میں سب عیب ہوں اور جو کسی طرح انگریزی میں کام نہ دے سکے جس کو انگریزی والے درجہ میں بھی نہ گھسنے دیں۔ اس کے واسطے عربی تجویز کی جاتی ہے۔ کہ اسکو ملاں بنائیں گے۔ اب وہ احمق نہو گا تو اور کیا ہو گا۔ اور جو اولاد تیز۔ ذہین۔ ذکی ہے۔ وہ انگریزی کیواسطے چھانٹی جاتی ہے۔ آپ ہی تو احمقوں۔ بیوقوفوں کیلئے عربی تجویز کرتے ہیں۔ اور آپ ہی کہتے ہیں کہ عربی پڑھکر بیوقوف ہو گیا۔ یہ بیوقوفی انہیں نامعقولوں کی تجویز کا ثمرہ ہے۔ اور اگر ایسا شخص مقتدائے دین ہو گیا۔ تو طرح طرح کی خرابیوں کا اندیشہ اس سے ہے۔ اور اگر کہیں ایسا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کسی نے اپنے تیز ذہین لڑکے کیواسطے ہی عربی تجویز کی۔ اور پھر بھی اس سے کوئی فساد ظاہر ہوا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ لوگ اوّل درجہ کے طماع ہیں۔ تو وہ بھی بیوقوفی میں داخل

ہوا۔ کیونکہ طمع بھی تو حماقت ہے۔ بلکہ طمع راس الحماقت ہی۔ پس عربی پڑھنے کے واسطے دو چیزیں۔ اگر ہوں تو اس کا مزہ معلوم ہو۔ اول ذہن۔ ذکاوت عقل کی تیزی۔ دوم سیر چشمی استغنا۔ پھر دیکھو اہل علم کیسے عقلمند ہوتے ہیں۔ انہیں بیوقوف کہنا اپنی حماقت کا اظہار ہے (مقالات حکمت حصہ ہشتم۔ دعوات عبدیت ملفوظ نمبر ۶۰)۔

(۳۶) اس شبہ کا جواب کہ اس حالت میں قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ جبکہ ہم اس کو سمجھتے ہی نہیں

بات یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے میں جو فائدہ ہے۔ اس سے یہ لوگ واقف نہیں اگر فائدہ سے واقف ہو جاتے تو اس کیلئے کوشش کرتے۔ جیسا کہ تجارت کرنیوالے ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا کر مال تجارت لاتے ہیں۔ اور اس میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے نفع سے واقف ہیں کہ ایک روپے کے دو ہو جائیں گے۔ دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کی یہ حالت ہی۔ کہ جب کسی تجربہ کار سے یہ معلوم کر لیا۔ کہ فلاں چیز کی تجارت میں بہت نفع ہے۔ تو اس کے قول پر اعتماد کر کے وہ تجارت شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر ایک دو بار نقصان ہی ہو جاتے۔ تو ہمت نہیں ہارتے۔ بلکہ پھر وہی کام کرتے ہیں۔ چنانچہ آم والوں کو بعض دفعہ خسارہ بھی ہوتا ہے مگر خسارہ والا پھر وہی کام کرتا ہے۔ اور اگر خسارہ نہ بھی ہو۔ بلکہ برابر معاملہ رہتا ہو۔ کہ نہ نفع ہے نہ نقصان۔ جب تو اس تجارت کو چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ تجارت میں یہ بھی ایک قسم کی کامیابی ہے کہ نقصان نہ ہو۔ دوسرے اب نفع نہیں ہوا۔ تو آئندہ تو اُمید ہے۔ بلکہ خسارہ بھی ہو۔ تب بھی اس اُمید نفع کو نفع سمجھا جاتا ہے۔ مگر افسوس دین میں معلوم نہیں۔ یہ اُصول کہاں گئے۔ صاحبو! کیا یہ حیرت نہیں کہ دنیا کے کاروبار میں تو نقصان نہ ہونے کو بھی کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ اور دین کے کام میں نفع کی تاخیر کو بھی کامیابی نہیں سمجھا جاتا۔ زراعت۔ تجارت۔ ملازمت سب میں کبھی نفع ہوتا ہے۔ کبھی نہیں اور بعض دفعہ نقصان بھی ہو جاتا ہی۔ مگر ان کو کیوں نہ چھوڑ دیں

وہاں تو تجربہ کاروں کا قول ہے۔ کہ ان کاموں میں فائدہ ہی۔ گو ہمیشہ نہیں۔ اکثر ہی ہو۔ اور گو عاجل نہ ہو موخر ہی ہو۔ مگر افسوس کیا خدا اور رسول کا قول ان تجربہ کاروں کے قول سے بھی کم ہو گیا۔ جو صاف صاف قرآن کے منافع بیان کر چکے ہیں۔ پھر وہ بھی ہر حالت میں۔ خواہ سمجھ کر پڑھو۔ یا بدون سمجھے پڑھو۔ اور میں واللہ بقسم کہتا ہوں۔ کہ جو لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ جب ہم سمجھتے نہیں تو قرآن کے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ یہ محض حظ نفس کے بندے ہیں۔ ان کو عقل سے ذرا مس نہیں۔ گو دعویٰ بہت کرتے ہیں۔ اگر یہ عقل کے بندے ہوتے تو ایسی بے عقلی کی بات نہ کہتے۔ کیونکہ عقلی قواعد میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک دلیل سے ضد شئے اور عین شئے دونوں پر استدلال ہو سکے۔ اگر یہ شبہ عقلی ہوتا۔ کہ جب معانی نہ سمجھے تو الفاظ سے کیا فائدہ۔ تو بتلائیے اس قاعدہ عقلیہ سے کیا ثابت ہوتا آیا یہ کہ الفاظ کو چھوڑ دو۔ یا یہ کہ محض الفاظ پر اکتفا نہ کرو۔ بلکہ معانی بھی حاصل کرو۔ ظاہر ہے کہ اس سے الفاظ کے چھوڑنے پر دلالت نہیں۔ کیونکہ جب معانی کی ضرورت اس قاعدہ میں مسلم ہے۔ اور معانی الفاظ کے تابع ہیں۔ اور ضروری کا موقوف علیہ ضروری ہوتا ہے۔ تو اس سے تو خود علم الفاظ کی ضرورت پر دلالت ہو رہی ہے۔ اگر وہ یہ کہیں۔ کہ ہاں ہم الفاظ کی۔ ضرورت تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کو اُس وقت حاصل کرنا چاہیئے۔ جبکہ معانی کی فہم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہو سکے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کی یہ تاویل اُس وقت چل سکتی تھی۔ جبکہ ہم دیکھتے کہ تم اپنے بچّوں کو بچپن میں تو قرآن نہ پڑھاتے۔ کیونکہ اُس وقت سمجھیں گے نہیں۔ بلکہ بڑے ہو کر پڑھاتے کہ اُس وقت سمجھیں گے۔ مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم نہ بچپن میں پڑھاتے ہو۔ نہ جوانی میں تو معلوم ہوا کہ تم اس قاعدہ سے علی الاطلاق خود عدم ضرورتِ الفاظ پر بھی استدلال کرنا چاہتے ہو اور یہ وہی بات ہے کہ دلیل سے ضد شئے پر استدلال کیا گیا ہے حالانکہ وہ عین شئے کو بھی مثبت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ عقلیہ نہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس کا منشا محض نفس پرستی ہے۔ ان لوگوں نے اس قضیہ کو غرض نفس کا ایک بہانہ بنا لیا ہے۔ اور دل میں اُن کے یہ ہے۔ کہ نہ قرآن کے الفاظ

کی ضرورت ہے ۔ نہ معانی کی ۔ گو زبان سے معانی کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں ۔ مگر ان کا عمل بتلاتا ہے کہ وہ کسی کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے ۔ ورنہ کسی وقت تو قرآن کو معانی ہی کے ساتھ حاصل کرتے ۔ اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دلاتے ۔ جب عمل یہ ہے ۔ تو اب زبان سے معانی کی اہمیت ظاہر کرنا مخلوق کو دھوکہ دینا ہے ۔ مگر خدا کو کس طرح دھوکہ دے لوگے ۔ جو علیم بذات الصدور ہے ۔ وہ تو تمہارے دل کی حالت کو خوب جانتا ہے ۔ کہ تم خود قرآن کی تعلیم ہی کو مطلقاً بے فائدہ سمجھتے ہو ۔ خواہ محض الفاظ ہوں یا معانی کے ساتھ ہوں ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام		در غلط اندازی تا ہر خاص و عام	
کارہا با خلق آری جملہ راست		با خدا تزویر و حیلہ کے رواست	
کارہا او راست باید داشتن		رایت اخلاص و صدق افراشتن	

خدا کے ساتھ دھوکہ نہیں چل سکتا ۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز باز خواست		نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما	

یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا آبِ حرام شیخ کے نان حلال سے قیامت میں بڑھ نہ جائے ۔ کیونکہ وہ مخلوق کو دھوکہ دینے کے لئے تقویٰ اور بزرگی کی صورت بناتا ہے ۔ اور ہم اپنے کو قصور وار سمجھ کر گناہ میں مبتلا ہیں اور خدا کے یہاں دھوکہ چل نہیں سکتا ۔ اس لئے اندیشہ ہے ۔ کہیں ریاکار مشایخ کا تقویٰ ہماری رندی سے گھٹ نہ جائے ۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ فاسق مسلمان جو اپنے کو گنہگار سمجھتا ہے ان مہذب لوگوں سے اچھے پڑ رہیں گے ۔ جو عقائد اسلام میں شبہات نکالتے ہیں اور عقل سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ چونکہ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان ہیں اس لئے زبان سے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن پڑھنے کو مطلقاً ہمارا جی نہیں چاہتا ۔ ورنہ کفر کا فتویٰ لگ جائیگا ۔ اس لئے یہ قاعدہ غرض نفس کے موافق گھڑ لیا کہ جب معانی نہیں سمجھتے تو الفاظ سے کیا نفع ۔ اس کا جواب بس یہی ہے کہ بہت اچھا ۔ آپ اپنے بچوں کو معانی ہی کے ساتھ قرآن پڑھائیے ۔ اور ان کو ابتدا ہی سے

عربی کی تعلیم صرف و نحو کی دیجئے۔ مگر اس سے تو اور بھی خون خشک ہو جائیگا۔ کیونکہ وہ تو الفاظ کو ٹال کر معانی سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ یہ کیسی اُلٹی پڑی کہ صرف و نحو بھی گلے پڑ گئی۔ مگر جو شخص الفاظ کو بدون معانی کے بے فائدہ کہے۔ اور صرف معانی ہی کی ضرورت کا قائل ہو۔ اس کو یقیناً ضروری کی تحصیل پر مجبور کیا جاویگا۔ صاحبو! ظاہر میں یہ قضیہ کہ بدون سمجھے الفاظ سے کیا فائدہ۔ پرمغز معلوم ہوتا ہے مگر در اصل ان لوگوں نے مغز اسلام نکال دیا ہے۔ ان میں سے بعض نے تحصیل معانی کی بھی کوشش کی مگر وہ اس کا مصداق تھی ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی	تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اُنھوں نے معانی حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ ترجمۂ قرآن کا مطالعہ کر لیا مگر یہ ایسا ہے۔ کہ جیسے کوئی خوان نعمت سے گلگلے پکانا سیکھے۔ کیونکہ اس میں سب کھانوں کی ترکیب لکھدی ہے۔ مگر اس سے آٹا گوندھنے کا طریقہ اور پانی کھپانے کی ترکیب اور آنچ کا انداز کیسے معلوم ہو گا۔ نیز اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک صاحب نے ضاد کے بارہ میں مجھ سے تحریراً سوال کیا تھا۔ کہ ضاد کا مخرج کہاں سے ہے۔ اور اس میں اور ظا میں فرق کیونکر ہوتا ہے۔ میں نے لکھدیا کہ یہ بات خط سے نہیں معلوم ہو سکتی۔ کیونکہ ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید	لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

اس کو کسی ماہر تجوید سے زبانی سُنکر سمجھ سکتے ہو۔ تو حضرت بعض باتیں ایسی ہیں۔ جو مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ اُن کیلئے اُستاد کی ضرورت ہی۔ کیونکہ بعض باتیں سینہ بسینہ ہوتی ہیں۔ اور اس میں کچھ تصوف اور سلوک ہی کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ ہر علم میں ایک بات ایسی ہوتی ہے۔ جو سینہ بسینہ ہے۔ کہ صرف اُستاد سے حاصل ہوتی ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست	بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

پھر قرآن ہی اتنا سستا کیوں ہو گیا۔ کہ اس کا مطلب بدون اُستاد کے سمجھ لیں

آجائیگا۔ آجکل تعزیرات ہند کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے۔ ذرا کوئی اس ترجمہ کو دیکھ کر
مطلب صحیح تو بیان کردے۔ یقیناً بہت جگہ غلطی کریگا۔ اسی طرح کیمیا کی کتابیں اردو
میں ہو گئی ہیں۔ کوئی ان کو دیکھ کر کیمیا تو بنالے۔ کبھی نہیں بنا سکتا۔ پس معانی قرآن
کے حاصل کرنیکا یہ طریقہ نہیں۔ کہ ترجمہ دیکھ لیا جاوے۔ ترجمۂ قرآن اگر دیکھو تو صرف و نحو
اور قدرے فقہ کے بعد دیکھو۔ اگر یہ نہو سکے تو کم از کم اردو ترجمہ کسی عالم سے تو سبقاً سبقاً
پڑھ لو۔ سو ایک جماعت تو یہ تھی جس کے عقائد تعلیم جدید کی وجہ سے خراب ہو گئے
ہیں۔ اور ایک جماعت عوام کی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تو نہیں کہ بدون معانی کے
قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ۔ مگر اس کا اثر لئے ہوئے ہیں۔ کہ قرآن کے پڑھنے میں
کوشش نہیں کرتے۔ سو یہ لوگ دوسرے رنگ میں اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ اس لئے
اس وقت میں اس غلطی کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اوّل آلر
فرمایا ہے۔ یہ تو حروف مقطعات ہیں۔ جن کے معنی ہم کو معلوم نہیں۔ گو بقول بعض محققین رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھے۔ لیکن اُمت کو نہیں بتلائے گئے۔ مگر میں ان سے بھی
اپنے مقصود میں کام لوں گا۔ گو سامعین کو تعجب ہو گا۔ کہ جب معنی ہی معلوم نہیں تو اس سے
مضمون کو کس طرح ثابت کیا جائیگا۔ لیکن یہ تعجب میری تقریر کے بعد مرتفع ہو جائیگا
ابھی میں آیتوں کا ترجمہ بیان کردوں۔ اس کے بعد ان حروف سے مدعی ثابت کرونگا۔
تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں تلک اٰیات الکتاب وقراٰن مبین۔ یہ آیات کتاب اور قرآن
مبین کی ہیں۔ یہی ترجمہ دوسری آیت کا ہے۔ صرف کتاب و قرآن میں تقدیم و تاخیر کا
فرق ہے۔ تو اس جگہ آیات کے دو لقب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک قرآن دوسرے
کتاب۔ قرآن کے معنے ہیں مایقرأ یعنی پڑھنے کی چیز اور کتاب کے معنی ہیں مایکتب۔
یعنی لکھنے کی چیز اور ظاہر ہے کہ پڑھنے اور لکھنے کی چیز کیا ہے۔ الفاظ ہی تو ہیں۔ معانی
کو کون پڑھ سکتا۔ یا کون لکھ سکتا ہے۔ اور ایک مضمون ابھی ذہن میں آیا ہی۔ جو شروع
میں نہ آیا تھا۔ اب تک تو ذہن میں یہ بات تھی۔ کہ الفاظ ہی پڑھنے لکھنے کی چیز ہیں۔ معانی
کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ نحویین نے کہا ہے۔ کہ ضرب میں

ھو مستتر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ظاہر میں ضمیر مذکور نہیں۔ لیکن سمجھنے میں آتی ہے۔ مگر ایک طالب علم یہ سمجھے کہ ضرب کے اندر ضمیر ھو چھپی ہوئی بیٹھی ہے۔ تو آپ نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ کاغذ پھٹ گیا۔ اور اتفاق سے دوسرے ورق میں اس جگہ ھو لکھا ہوا تھا۔ یہ بڑے خوش ہوئے کہ واقعی اُستاد نے ٹھیک کہا تھا۔ کہ اُس کے اندر ھو پوشیدہ ہے۔ دیکھو چھیلنے سے نکل آیا۔ پھر دوڑے ہوئے اُستاد کے پاس آئے۔ کہ دیکھئے میں نے ضرب کو چھیلا تھا۔ یہ ھو نکل آیا۔ جو اس میں چھپا ہوا تھا۔ اُستاد بہت ہنسے اور ان کو مطلب دوبارہ سمجھایا۔ غرض یہ طالب علم یوں سمجھا تھا۔ کہ معانی بھی کتابت میں آ سکتے ہیں۔ مگر یہ اُس کی غلطی ہے۔ معانی قرأت و کتابت میں نہیں آ سکتے۔ ان کا محل صرف ذہن ہے۔ لوگ بے تار کی خبر پر تعجب کرتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ نے اس کو پہلے سے پیدا کر رکھا ہے۔ کیونکہ الفاظ سے معانی کا سمجھنا یہ بے تار کی ہی تو خبر ہے۔ کیونکہ معانی کا مرکز قلب ہے اور جہاں الفاظ کسی کی زبان سے نکلے۔ معاً وہاں معانی سمجھے گئے۔ غرض ان آیتوں میں اشارہ کیا۔ بلکہ صراحت ہے۔ کہ قرآن کے ساتھ پڑھنے کا تعلق رکھو۔ کیونکہ لفظ قرآن کے معنے یہی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ قرأت الفاظ ہی کی ہوتی ہے۔ نہ کہ معانی کی۔ دوسری صفت اس جگہ کتاب ہے۔ جس کے معنے لکھنے کی چیز ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ قرآن کے ساتھ قرأت کے علاوہ ضبط و کتابت کا بھی تعلق رکھنا چاہیئے۔ سو ابتک تو صرف یہی بات ذہن میں تھی۔ اور دوسری بات جو اسی وقت ذہن میں آئی وہ یہ ہے۔ کہ کتاب کا مصداق حقیقۃً نہ الفاظ ہیں نہ معانی۔ کیونکہ الفاظ تو زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ان کا محل زبان ہے۔ لفظ کے معنی لغت میں پھینکنے کے ہیں۔ چونکہ الفاظ زبان سے پھینکے جاتے ہیں۔ یعنی نکالے جاتے ہیں۔ اس لیئے ان کو الفاظ کہا جاتا ہے۔ اور معانی کا محل صرف ذہن ہے۔ وہ تو کتاب کا مصداق کسی طرح ہے ہی نہیں۔ بلکہ اس کا مصداق دوسری چیز ہے۔ یعنی نقوش۔ جن کو عوام کرم کانٹے کہتے ہیں۔ کیونکہ ان پڑھ آدمی لکھا ہوا پڑھ نہیں سکتا۔ نہ سمجھ سکتا ہے۔ اس لیئے وہ ان کو کرم کانٹے کہتے ہیں۔ مگر کتاب کا مصداق مطلق نقوش نہیں۔ بلکہ وضعی نقوش ہیں۔ جیسا کہ الفاظ کی دلالت معانی پر وضعی ہے

اس لئے پڑھے ہوئے آدمی ان کو سمجھتے ہیں۔ ان پڑھ نہیں سمجھ سکتے۔ جب یہ معلوم ہو گیا۔ کہ کتاب کا حقیقی مصداق نقوش ہیں۔ تو آپ تو الفاظ ہی کو غیر مقصود بتلاتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ نقوش قرآن بھی قابل حفاظت و مستحق تعظیم ہیں یہ تو اُلٹی پڑی کہ گئے تھے نماز کو بخشوانے روزے بھی گلے پڑ گئے۔ مگر صاحبو! یہ گلے نہیں پڑے۔ کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ کسی شخص کو اشرفیاں اور جواہرات دے کر اس سے کہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو۔ قفل اور تالا لگاؤ۔ اگر اس شخص کو روپے اور جواہرات کی قدر معلوم ہے۔ تو اس حکم کی قدر کر بجا لاوے گا اور کہے گا ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی	مرا با جان جاں ہمراز کردی

اور جس کو روپے کی قدر نہ ہو گی۔ وہ کہیگا کہ یہ اچھی بلا میرے سر پڑی کہ حفاظت کرو اور قفل لگاؤ۔ اس طرح جو لوگ معانی کی قدر کرتے ہیں۔ وہ ان الفاظ اور نقوش کی بھی قدر کرینگے۔ کیونکہ یہ انہی کی حفاظت کا سامان ہے۔ اور جو قدر نہیں کرتے۔ وہ اس کو سر پڑی بلا سمجھیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ جو تعلیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں درحقیقت وہ معانی قرآن کی قدر نہیں کرتے۔ ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی۔ صاحبو الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے۔ کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے۔ کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں۔ کہ اگر خدانخواستہ خدانخواستہ یہ لکھے ہوئے مصاحف کم ہو جائیں۔ تو ایک بچہ حافظ قرآن اپنی یاد سے اسکو دوبارہ لکھوا سکتا ہے۔ بڑوں کا تو کیا ذکر۔ مظفر نگر کا واقعہ ہے کہ وہاں کے ایک واعظ نے قرآن کے اس معجزے کو ظاہر کرنا چاہا۔ تو درمیان وعظ میں ایک آیت پڑھ کر اٹک گئے اور مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اس مجمع میں جس قدر حافظ موجود ہوں چھوٹے بڑے سب کھڑے ہو جائیں۔ مجھے ایک آیت میں شبہ ہو گیا ہے۔ اسکو حل کرنا چاہتا ہوں تو چاروں طرف سے بہت سے آدمی کھڑے ہو گئے جس میں بچے بھی تھے۔ جوان بھی اور بوڑھے بھی تھے اور اُدھیڑ بھی۔ یہ دیکھ کر واعظ نے کہا۔ الحمد للہ صاحبو! مجھکو آیت میں شبہ نہیں ہوا تھا مجھے صرف یہ دکھلانا تھا کہ اس مجمع میں جس کے اندر حفاظ کو بالقصد جمع نہیں کیا گیا۔ یونہی

کیفما اتفق یہ سب مجمع آگیا ہے۔ اس قدر حفاظ قرآن موجود ہیں۔ اب قیاس کرو کہ سارے شہر میں کتنے حافظ ہونگے۔ پھر یہ اندازہ کرو کہ پورے ضلع میں کتنے ہونگے پھر سوچو کہ سارے ہندوستان میں کتنے ہونگے۔ اور دنیا بھر میں کتنے ہوں گے۔ صاحبو! یہ قرآن کا معجزہ نہیں تو کیا ہے۔ کہ اس زمانہ میں جبکہ قرآن کی طرف رغبت کا کوئی سامان نہیں نہ اُسکے حفظ کرنے والوں کو کوئی بڑا عہدہ ملتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر اُمرا کی توجہ انگریزی پڑھنے کی طرف ہے۔ اور کفار قرآن کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قدر حفاظ موجود ہیں۔ کہ بچے بھی حافظ ہیں اور مرد بھی۔ اور بعض قصبات میں عورتیں بھی حافظ ہیں۔ چنانچہ قصبہ پانی پت میں بہت عورتیں حافظ ہیں۔ اور بعض تو سبعہ قراءت کی حافظ ہیں۔ صاحبو! میں نہایت آزادی سے صاف صاف کہونگا۔ کہ جو لوگ بدون معانی سمجھے الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بیکار کہتے ہیں۔ واللہ وہ حضرت حق تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن کے حافظ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ محفوظ رہے۔ اور یہ لوگ دنیا سے حفظ قرآن کو مٹانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ حفظ قرآن بچپن ہی میں اچھا ہوتا ہے۔ بڑے ہو کر ویسا حفظ نہیں ہوتا تو اب اگر ان لوگوں کے مشورہ پر بچوں کو قرآن نہ پڑھایا جائے۔ تو اس کا انجام یہی ہے۔ کہ حفظ کا دروازہ بند ہو جائے۔ مگر یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم ویأبی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ یہ خدا کے نور کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بخدا یہ خود ہی مٹ جائیں گے۔ اور خدا کا نور اُن کے مٹانے سے ہرگز نہ مٹے گا۔ یہ لوگ اپنے ایمان کی خیر منائیں۔ یہ ہیں کس ہوا میں۔ خدا کی قسم ان لوگوں کا نام و نشان تک نہ رہیگا۔ یہ بالکل تباہ و برباد ہو جائیں گے ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد	ہر آنکو تف زند ریشش بسوزد

اور

اگر گیتی سراسر باد گیرد	چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد

اس عارف نے یہ بات اہل اللہ کے انوار کے متعلق فرمائی ہے۔ تو جب اہل اللہ

کے انوار کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتے۔ تو خود اللہ کا نور کس طرح مٹ سکتا ہے
بعض اہل اللہ پر ظالموں نے ستم کیا۔ اور اُن کو ذلیل کرنا چاہا۔ اُن کی قبر پر گدہ ڈلوایا
مگر اُن کا نام اور اُن کے انوار اب تک تاباں و درخشاں ہیں۔ اور وہ ظالم گمنام اور
ناپید ہو گئے۔ کوئی اُن کے نام سے بھی واقف نہیں۔ نہ اُن کی قبر کا نشان باقی ہے
اور اہل اللہ کے مزارات اس وقت تک مرجع الخلائق بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ
بات مشاہد ہے کہ اہل اللہ اپنے کو خود مٹانا۔ ناپید کرنا۔ گمنام کرنا چاہتے ہیں۔ اور اہل ظاہر
طرح طرح سے اپنے کو ظاہر کرنا۔ مشہور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اہل اللہ یعنی اہل باطن ہی چمکتے
ہیں۔ اور اہل ظاہر کی شہرت چندروزہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہے۔ بعض مصنفین نے
اپنی کتابوں کے اندر اپنا نام تک ظاہر نہیں کیا۔ مگر کتابیں اُن کی مقبول و متداول ہیں
اور اہلِ ظاہر بڑے اہتمام سے اپنا نام ظاہر کرتے ہیں۔ مگر ان کی کتابوں کو کوئی بھی نہیں
پوچھتا۔

میں یہ کہ رہا تھا کہ جب اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ تعالےٰ
کا نور کیونکر مٹ سکتا ہے۔ بس یہ خدا کی حفاظت ہے۔ کہ قرآن کے اسقدر حفاظ ہر زمانے
میں ہوتے رہتے ہیں کہ ان کا شمار واحصار دشوار ہے۔ اس پر بعض لوگ یوں کہدیا
کرتے ہیں کہ جب خدا قرآن کا حافظ و نگہبان ہے۔ تو ہمیں اس کے اہتمام کی کیا ضرورت
ہے۔ اے صاحبو! یہ بات ایسے دل سے نکلی ہے۔ جس میں خدا سے ذرا بھی علاقہ اور
لگاؤ نہیں۔ کیا اگر جارج پنجم آپ کو کوئی تحفہ دیں۔ آپ اس کی بے قدری کر سکتے ہیں۔
اور خصوصاً اُن کی نگاہ کے سامنے ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کو سر اور آنکھوں پر رکھا جائیگا
اور اس کی جان سے زیادہ حفاظت کی جائیگی۔ اور اگر وہ کوئی تحفہ کھانے کیواسطے
آپ کو دیں اور اُن کے سامنے آپ اُسے کھائیں۔ تو کیا زمین پر آپ اسکا کوئی ریزہ گرنے
دیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس طرح شوق سے کھائیں گے۔ کہ گویا کبھی یہ نعمت آپ کو
ملی ہی نہ تھی۔ اور اگر اس میں سے ذرا سا بھی زمین پر گریگا۔ تو فوراً اُٹھا کر سر پر رکھیں گے
نہیں سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقیقت سمجھ لو۔ کہ اگر کھانا کھاتے

ہوئے لقمہ زمین پر گر جائے۔ تو اس کو اُٹھا کر صاف کر کے کھالو۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہمکو دیکھ رہے ہیں۔ تو اُن کی نعمت کی اُن کے سامنے بیقدری کرنا بڑی بیحیائی ہے۔ تو صاحبو! خدا تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں میں قرآن دیدیا ہے۔ تو اب تو یہ آپکا ہو گیا۔ تو کیا اپنی ایسی قیمتی چیز کی جو سلطان السلاطین کے دربار سے ملی ہے آپ کو حفاظت نہ کرنا چاہئے۔ یقیناً کرنا چاہئے۔ خصوصاً جبکہ خدا کی مرضی اس کی حفاظت میں ہے۔ اور وہ اس کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کو بھی مرضیٔ حق پر چلنا چاہئے۔ اس کی حقیقت اولیاء اللہ سے پوچھو۔ صاحبو! محبت کا سبب کمال و جمال و نوال ہے۔ اور یہ سب باتیں حق تعالیٰ شانہ کے اندر کامل طور پر موجود ہیں۔ ان سے بھی اگر محبت نہو تو پھر کس سے ہوگی۔ خبر بھی ہے۔ خدا تعالیٰ کون ہیں۔ تمام حسن و جمال کے مبدا و منتہا ہیں۔ تو جب خدا تعالیٰ ایسے محبوب ہیں تو ہم کو ان کی مرضی کی رعایت کرنا چاہئے۔ اور خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے۔ کہ قرآن محفوظ رہے۔ تو آپ کو اسکی طرف جھکنا چاہئے۔ اور اس کے الفاظ کا پورا اہتمام کرنا چاہئے۔ کیونکہ الفاظ و معانی دونوں قابل اہتمام ہیں۔ مگر الفاظ میں اتنی بات زیادہ ہے کہ معانی کی حفاظت الفاظ کی حفاظت پر موقوف ہے۔ کیونکہ معانی کا ضبط بدون الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے سب سے پہلے معانی کا نزول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا ہے۔ مگر وہاں بھی بواسطہ الفاظ کے ہوا ہے۔ اور حضور کو الفاظ کا اس قدر اہتمام تھا۔ کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔ حالانکہ حضور کا حافظہ بہت قوی تھا۔ بلکہ سارے ہی قوی مضبوط تھے کہ تریسٹھ سال کی عمر میں بھی آپ کے بال کچھ ہی سفید ہوئے تھے۔ اور حضور کی قوت کا کیا پوچھنا۔ آج کل سے تو اس زمانہ کے سب ہی لوگ قوی تھے۔ حضرات صحابہ کا حافظہ بھی ہم لوگوں سے زیادہ قوی تھا۔ پھر حضور کا تو سب ہی سے زیادہ قوی تھا۔ لیکن بایں ہمہ حضور کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا۔ کہ فرشتہ کے ساتھ قرآن کو پڑھتے جاتے تھے کیونکہ

عشق است و ہزار بدگمانی	با سایۂ ترا نمی پسندم

آپ کو ان محبوب الفاظ کے نکلنے کا اندیشہ تھا۔ کہ کہیں کوئی لفظ میری یاد سے نکل نہ جائے۔ اس لئے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ حضور کو الفاظ قرآن سے کس درجہ عشق تھا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے منع کرنیکی نوبت آئی کہ آپ ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت برداشت نہ کیا کریں۔ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ہم ذمہ لیتے ہیں کہ قرآن کو آپ کے دل پر جما دیں گے۔ اس تسلی کے بعد حضور فرشتے کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ جب حضور کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا۔ تو ہم کو بھی ان کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بدون الفاظ کے معانی کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ لہذا معانی کی نگہبانی یہی ہے کہ الفاظ کو یاد کیا جائے۔ حضرات سلف صالحین نے تو قرآن کے نقوش اور رسم خط کی بھی یہانتک حفاظت کی ہے کہ رسم خط قرآن میں مستقل رسائل تصنیف کیئے۔ اور اسکو ایک علیحدہ فن قرار دیا ہے اور اس میں تغیر و تبدل کو ناجائز فرمایا ہے۔ صاحبو! آجکل تو یادگار قدیم کی اس قدر حفاظت کی جاتی ہے کہ اسکے تغیر کے بعد بھی اس کا فوٹو لیا جاتا ہے۔ تو خدانخواستہ اگر رسم خط قدیم متغیر بھی ہوتا۔ جب بھی یادگار قدیم ہونے کی وجہ سے اس کی حفاظت ضروری تھی۔ چہ جائیکہ وہ بالکل محفوظ صحیح ہے۔ بلکہ اس میں نکات ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ بقادر میں الف نہیں لکھا گیا۔ کیونکہ وہاں دوسری قرأت یقدر ہے۔ تو صحابہ نے اس جگہ بقادر میں الف نہیں لکھا۔ تاکہ دوسری قرأت پر بھی رسم خط دال رہے۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ میں مالک یوم الدین میں الف نہیں لکھا۔ کیونکہ ایک قرأت میں ملک ہے۔ پس رسم خط قرآن میں اس کا بعید لحاظ کیا گیا ہے۔ کہ سب قرأتوں کو جامع رہے۔ اس لئے اس کا بدلنا حرام ہے۔ صاحبو! جب قرآن کی ہر چیز کی حفاظت کی گئی ہے اور یہ مسلمانوں کیلئے بڑا فخر ہے کہ ان کے برابر کسی قوم اور کسی امت نے آسمانی کتاب کی حفاظت نہیں کی۔ تو آپ کو بھی اس کی ہر چیز کی ویسی ہی حفاظت کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ ابتک امت نے کی ہے۔ اور یہ مت کہو۔ کہ خدا تو اس کا خود نگہبان ہے۔ پھر ہم کو کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ اسکی

محافظت کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ کہ اسکی محافظت کا حکم اپنے بندونکو دیدیا
اور یہ اُن کا احسان ہے۔ اور انعام ہے کہ اُس نے یہ خدمت ہم سے لے لی۔
اگر تم یہ کام نہ کروگے۔ تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم سے یہ کام لے لیں گے۔
چاہے چھوڑ کر دیکھ لو۔ تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تو ہمارے
پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یہ بھی ان کا انعام محض ہے کہ ہم کو اپنی عبادت
کیلئے پیدا کیا۔ اور پیدا کرنے سے پہلے ملائکہ سے فرمایا انی جاعل فی الارض
خلیفہ کہ میں زمین کے اندر اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ کس قدر عنایت ہے
کہ ؎ ما نبودیم وتقاضا ما نبود لطف تو ناگفتۂ ما می شنود
ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ہم کو خلیفۃ اللہ کا خطاب
دیا۔ تو کیا خلافت کا یہی حق ہے۔ جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ کہ زبان پر یہ بات آرہی
ہے کہ خدا قرآن کا خود نگہبان ہے۔ ہم کو کیا ضرورت ہے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت تو
دیکھیے کہ ہمکو ایسی حالت میں خلیفہ بنایا۔ کہ دوسرے لوگ اس منصب کے طالب
موجود تھے۔ ملائکہ نے اُسی وقت جبکہ اللہ تعالیٰ نے انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ
فرمایا۔ یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔
قرآن میں ملائکہ کا یہ سوال اور اس کا جواب مفصل مذکور ہے۔ میں اس وقت اسکی
تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں۔ کہ حق تعالیٰ کو ہماری ضرورت
نہ تھی بلکہ جس کام کیلئے ہم کو پیدا کیا گیا ہے۔ اُس کے انجام دینے کیلئے اللہ تعالیٰ
کی دوسری مخلوق اپنی خدمات کو پیش کرنے والی موجود تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ہمارے
حال پر غایت کرم ہے۔ کہ دوسری جماعت کے ہوتے ہوئے پھر بھی ہمکو منصب
خلافت عطا کیا۔ اور ہم کو اس خدمت کیلئے پیدا کیا۔ اسی طرح خدمت قرآن کے
لئے بھی خدا تعالیٰ کو ہماری کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم خدمت دین میں کوتاہی کرینگے
تو دوسری قوم کو اس کی خدمت کیلئے پیدا کردیں گے۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ
نے اس خیال کا بھی جواب صاف صاف دیا ہے وان تتولوا یستبدل قوماً

غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔ اگر دین سے اعراض کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے عوض تمہاری جگہ دوسری قوم کو کردے گا۔ پھر وہ تمہاری طرح دست وکاہل اور دین سے جان چرانے والے نہوں گے۔ صاحبو! تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی۔ تم آج چھوڑ کر دیکھ لو۔ گاڑی ویسی ہی چلتی رہے گی۔ ہاں تم خود ہی گر پڑوگے۔ اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت اور قرآن کی حفاظت کیلئے ایسی قومیں پیدا کردیں گے۔ جو تمہارے جیسی نہوں گی۔ صاحبو! میں آپ کو خبردار وبیدار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جلدی سنبھلو۔ کہیں اس وعید کا ظہور نہ ہوجائے۔ کیونکہ مجھے اس کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اس وقت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہا ہوں۔ کہ مسلمانوں کی تحریریں۔ تو کفر آمیز شائع ہوتی ہیں۔ اور اہلِ یورپ کی تحریریں اسلام کی مدح میں شائع ہو رہی ہیں۔ گویا بعضے مسلمان کفر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بعض کفار اسلام کی طرف۔ تو اس حالت کو دیکھ کر مجھکو سخت اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ جب دونوں جماعتیں سرحد پر پہنچ چکی ہونگی۔ تو ایسا نہ ہو وہ تو کفر سے نکل مسلمان ہوجائیں۔ اور یہ اسلام سے نکل کر کافر ہوجائیں۔ صاحبو! دوسری قوموں کو اسلام کی مدح وثنا کی طرف مائل کرکے حق تعالیٰ ہمکو متنبہ فرمارہے ہیں۔ کہ یہ مت سمجھنا کہ خدا کو یا اسلام کو تمہاری ضرورت ہے۔ بلکہ تم ہی کو اسلام کی ضرورت ہے وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔ اگر تم اعراض کروگے تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو کردیں گے۔ جو اس وقت باوجود کفر کے اسلام کی مدح کررہی ہے۔ اور تم اُن کی جگہ ہوجاؤگے کہ باوجود مسلم ہونے کے اسلام کی توہین کرتے ہو۔ اور اگر تم اعراض نہ کرو۔ بلکہ بدستور اسلام کی خدمت انجام دیتے رہو اس صورت میں تم بھی مسلمان رہوگے۔ اور شاید دوسری قومیں بھی مسلمان ہوجائیں۔ اور اسلام کی خدمت یا قرآن کی حفاظت جو کچھ آپ کرتے ہیں۔ یہ محض برائے نام ہے جس سے صرف آپ کا نام ہوجاتا ہے۔ ورنہ اب بھی قرآن کے محافظ دراصل حق تعالیٰ ہی ہیں۔ تم اپنے حفظ پر کیا ناز کرتے ہو۔ ذرا کافیہ یا اور کوئی نظم ونثر کی کتاب تو حفظ کرلو۔ آپ کو اسی وقت اپنے حفظ کی حقیقت معلوم ہوجائیگی۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کی تو

حفاظت ہے۔ کہ قرآن جیسی ضخیم کتاب کا حفظ کرنا ایسا آسان کر دیا ہے کہ بچے تک حفظ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں متشابہات بھی کثرت سے ہیں۔ اس بات پر نظر کر کے یہی کہنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا محض نام کرنا مقصود ہے۔ کہ وہ ہم کو حافظان قرآن کی فہرست میں داخل کر کے انعام دینا چاہتے ہیں۔ ورنہ اصل حافظ وہی ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں	مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

واللہ اس انعام پر جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر فرمایا ہے یوں کہنا چاہیئے ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل	نسیم صبح تیری مہربانی

اور عارفین کی نظر تو اس سے بھی آگے بڑھتی ہے۔ عارفین تو جب قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ تو ان کو یہ بات مکشوف ہوتی ہے۔ کہ ہم خود نہیں پڑھ رہے۔ بلکہ ارگن باجے کی طرح بول رہے ہیں۔ جس میں کسی اور کا کلام بند کیا گیا ہے۔ اور باجہ سے وہی نکلتا ہے۔ جو اس میں بند کیا گیا ہے۔ مگر ظاہر بین یہ سمجھتا ہے۔ کہ باجہ بول رہا ہے یا وہ اس وقت مثل شجرۂ طور کے ہوتے ہیں۔ کہ ظاہر میں یہ درخت کہہ رہا تھا۔ یاموسیٰ انی انا اللہ رب العلمین۔ مگر درخت کی کیا مجال تھی کہ وہ اس طرح خود بولتا۔ بلکہ کوئی دوسرا بول رہا تھا۔ اور درخت محض اس کا ناقل وحاکی تھا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں	کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

ایک عارف اس کو فرماتے ہیں ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند	آنچہ استاد ازل گفت بگوے گویم

عارفین کو جب اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو کچھ نہ پوچھیئے۔ کہ تلاوت قرآن کے وقت اُن کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اور تلاوت قرآن میں تو اس حالت کا غلبہ ایک خاص وجہ سے زائد ہوتا ہے۔ کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ صاف صاف اپنی شوکت وعظمت وجلال کو ظاہر فرماتے ہیں۔ کہیں عتاب ہے۔ کہیں شکایت ہے۔ کہیں تسلی ہے کہیں بشارت ہے۔ کہیں تکلم ہے۔ کہیں خطاب ہے۔ ورنہ ایک تلاوت قرآن ہی کیا۔ انسان

کے توسارے ہی افعال ایسے ہیں۔ کہ ان میں انسان محض برائے نام فاعل ہے۔ ورنہ اصل کو کرنے والے وہی ہیں۔ یہ کیا ناز کرتا ہے۔ اپنے علم و کمال پر کہ میں نے یہ کام کیا۔ میں نے فلاں مسئلہ حل کیا۔ واللہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص دوسرے کے کھیت پر دعویٰ کرے۔ کہ یہ کھیتی میری ہے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی اقرار کرتا ہے۔ کہ زمین بھی دوسرے کی۔ اور بیج اور بیل بھی دوسرے کا۔ اسی نے اسکو پانی دیا۔ کھاد ڈالا۔ اور کھیت کو پرورش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اس مدعی کو احمق بنائیگا۔ کہ جب ساری چیز دوسرے کی ہیں۔ تو کھیتی تیری کدھر سے ہوئی۔ صاحبو! مگر اس حماقت میں ہم سب مبتلا ہیں کیونکہ جس دماغ اور جن ہاتھ پیروں سے ہم کام کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اقرار ہے۔ کہ یہ سب سامان خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہے۔ عقل و فہم اور قوت ارادہ اور قوت عمل بھی انہی کی دی ہوئی ہے۔ اب فرمایئے۔ کہ ان سب قویٰ اور جوارح سے جو افعال و کمالات ظاہر ہونگے وہ ہمارے کدھر سے ہو گئے ؎

تو دادی ہمہ چیز من چیز تست		نیا وردم از خانہ چیزی نخست	

حیرت ہے اگر ہم اب بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم خود قرآن کی حفاظت کرتے ہیں جب ہمارا پڑھنا اور یاد کرنا ہمارے قبضہ کا نہیں۔ تو ہم حفاظت کرنے والے کون ہیں بلکہ وہی محافظ ہیں جنہوں نے ہم سے یہ کام لیا۔ اور اس کے اسباب عطا کیے۔ اور حفاظت کا تو ادھر سے ہونا بہت ہی ظاہر ہے حقیقت میں تو ہمارا پڑھنا۔ اور تلاوت کرنا بھی اُدھر ہی سے ہے۔ اگر اُدھر سے توفیق نہ ہو تو کسی کی مجال نہیں کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔ کانپور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے جمائی لی تھی اسکے بعد منہ بند نہوا۔ کھلا کا کھلا رہگیا۔ بڑی مصیبت ہوئی۔ نہ کھانیکا رہا نہ بات کرنے کا پھر بڑی دقت سے کئی دن میں منہ بند ہوا۔ شاید کوئی کہے کہ دوا دارو سے منہ بند تو ہو گیا۔ یہ کام تو انسان کی تدبیر سے ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی تدبیر کا محض نام ہی ہے۔ خدا کو منظور نہ ہوتا۔ تو قیامت تک منہ بند نہو سکتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تمام اطبا اور ڈاکٹر عاجز ہو جاتے ہیں اور بیمار کو شفا نہیں ہوتی۔ بلکہ جو ل

جوں دوا کرتے ہیں۔ مرض کو ترقی ہی ہوتی ہے۔ اور یہ حال ہوتا ہے کہ ؎

از قضا سر کنگبیں صفرا فزود		روغن بادام خشکی مے نمود	

ہر تدبیر الٹا کام کرتی ہے۔ جس دوا کو تریاق سمجھا جاتا ہے وہی زہر کا اثر کرتی ہی اگر شفا طبیبوں۔ ڈاکٹروں کے قبضہ میں ہے۔ تو ان کی بیوی بچے تو ہمیشہ مرض کے بعد ضرور صحت یاب ہو جایا کریں۔ کیونکہ اس موقعہ پر طبیب و ڈاکٹر کبھی تدبیر میں کمی نہیں کر سکتا۔ مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ پس مجبوراً ماننا پڑے گا۔ کہ ؎

درد از یار است و درمان نیز ہم		دل فدائے او شد و جان نیز ہم	
ہر چہ میگویند آں بہتر ز حسن		یار ما ایں دارد و آں نیز ہم	

ابتو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ قرآن پڑھنا بھی مستقلاً ہمارا کام نہیں۔ اسکے محافظ تو ہم کیا ہوتے۔ تو اب یہ محض حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ وہ ہمارا نام ہی کرنا چاہتے ہیں ورنہ دراصل سب تصرفات وہ خود کرتے ہیں۔ اگر اب بھی اس انعام کی طرف رغبت نہ ہو تو سخت محرومی کی علامت ہے۔ یہ مضمون درمیان میں استطراداً آگیا اس امر پر تنبیہ کرنے کیلئے کہ قرآن کی حفاظت جو آپ کے سپرد کی گئی ہے۔ تو آپ اس پر ناز نہ کریں۔ خدا کو آپ کی ضرورت نہیں۔ بلکہ آپ ہی کو خدا کی ضرورت ہے۔ اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں۔ کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ بدون معنی کے سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ کیونکہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ معانی کی حفاظت بدون حفاظت الفاظ کے نہیں ہو سکتی اور حفظ معانی کی ضرورت آپکو بھی مسلم ہی یہ جواب تو سائنس و عقل کے موافق ہی اور آجکل عقل و سائنس کی پرستش زیادہ ہی اسلئے یہ جواب تو تعلیم یافتہ جماعت پر زیادہ حجت ہی اور ایک جواب نقلی ہی جو دین داروں پر حجت ہی جو نقل کے سامنے عقل کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ وہ یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ہر لفظ پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ جس نے ایک بار زبان سے الحمد کہا اس کے نامۂ اعمال میں اُسی وقت پچاس نیکیاں لکھی گئیں۔ شاید عقل پرستوں کو یہ جواب پھیکا معلوم ہوا ہو گا۔ مگر صاحبو! حقیقت میں یہ بڑا قیمتی نفع ہے۔ جس کی قدر مرنیکے بعد معلوم ہو گی۔ جبکہ نیکیوں ہی کی پوچھ ہو گی۔ اور اس کے سوا

تمام چیزیں ردّی ثابت ہوں گی۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کے پاس مکہ کے ہلالے اور مجیدیاں بہت سی جمع ہوں۔ اور ہندوستان والے اس کا مضحکہ اُڑائیں۔ کہ اس سکہ کو جمع کرنے سے تجھے کیا نفع۔ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے۔ کہ ہاں ابھی تو کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا لیکن ایک خاص دن میں معلوم ہو جائیگا۔ پھر یہ شخص اور اس کا مضحکہ اُڑانے والے دونوں حج کو جائیں۔ تو وہاں پہنچ کر معاملہ برعکس ہوگا۔ کہ اب وہ شخص جس کے پاس ہلالے اور مجیدیاں جمع تھیں۔ ان لوگوں کا مضحکہ اُڑائیگا جنکے پاس ہندوستانی تانبے کے پیسے بہت ہیں۔ مگر مکہ کا سکہ کچھ نہیں تھا۔ اور اب یہ لوگ اُس کے سامنے شرمندہ ہوں گے۔ صاحبو! اسی طرح ایک اور عالم آنے والا ہے جس کے بازار میں آپ کے ان سکوں کی کچھ قدر نہیں۔ جو آپ آجکل جمع کر رہے ہیں۔ نہ وہاں روپے کی قدر ہے نہ اشرفی کی۔ نہ انٹرنس کی قدر ہے نہ بی۔ اے کی۔ نہ ایل۔ ایل۔ بی کی نہ سی۔ ایس۔ آئی کی۔ وہاں کا سکہ یہی نیکیاں ہیں۔ جن کی آپ اس وقت بے قدری کر رہے ہیں۔ پس قرآن کے الفاظ کا دوسرا نفع یہ ہے کہ یہ آخرت کا سکہ ہے جس کی ایک سورۃ سے آخرت کے بیشمار خزانے جمع ہو جاتے ہیں۔ جب آپ وہاں جا کر دیکھیں گے۔ کہ ایک سورۂ فاتحہ اور قل ہو اللہ سے اتنا بیشمار ثواب مل گیا۔ تو بے ساختہ یوں کہیں گے ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را	کہ بیک گل مے خری گلزار را

مگر ابھی اس واسطے قدر نہیں۔ کہ یہ بازار اس سکہ کا نہیں ہے۔ یہاں یہ سکہ رائج نہیں۔ لیکن آخر آپ مسلمان ہیں۔ اور آخرت و قیامت کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ پھر اس نفع کی بے قدری کس لئے ہے۔ واللہ وہاں جا کر آپ افسوس کرینگے۔ کہ ہائے ہم نے رات دن قرآن کی تلاوت کیوں نہ کی۔ جو آج مالا مال ہو جاتے۔ اور اُس وقت اپنے اُن عذروں اور بہانوں پر افسوس ہوگا جو آجکل تحصیل قرآن میں کئے جاتے ہیں۔ مجھے دیندار طبقے کی بھی شکایت ہے۔ کہ یہ طبقہ بھی تلاوت قرآن کا پوری طرح اہتمام نہیں کرتا۔ بعضے یہ عذر کرتے ہیں کہ ہمکو فرصت نہیں ملتی۔ طلبہ اور مدرسین کو زیادہ تر یہی عذر ہے۔ مگر یہ محض لغو ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ دوستوں سے باتیں کرنے میں بہت وقت ضائع کر دیتے ہیں اس وقت

اُن کو کہاں سے فرصت مل جاتی ہے۔ پھر افسوس ہے تلاوت قرآن کیلئے تھوڑا سا وقت نہیں دیا جاتا ہے

قلق از سوزش پروانہ داری		ولے از سوز ما پروانہ داری

دوستوں کے راضی کرنے کا تو اتنا اہتمام۔ اور خدا کے راضی کرنے کا مطلق اہتمام نہیں۔ بتلائیے اگر خدا تعالیٰ آخرت میں یہ سوال فرمائیں کہ تم نے فلاں دن فلاں دوست سے ایک گھنٹہ تک باتیں بنائیں۔ مجھ سے آدھ گھنٹہ بھی باتیں نہ کیں۔ تو اس کا جواب کیا دوگے۔ بس سچا جواب تو یہ ہوگا۔ کہ یوں کہدو کہ ہم کو (معاذ اللہ) خدا سے محبت نہیں۔ اگر یہ کہدو تو پھر ہم آپ سے خطاب ہی نہ کریں۔ لیکن آپ یہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ آپ کو خدا تعالیٰ سے محبت ہے۔ اس لئے کہ آپ مومن ہیں۔ اور مومن کی شان یہ ہے۔ والذین اٰمنوا اشد حبًا للّٰہ۔ کہ جو لوگ ایماندار ہیں ان کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے۔ پس آپ کو اللہ تعالیٰ سے ضرور محبت ہے اور ایسی محبت ہے کہ کسی سے بھی اتنی محبت نہیں۔ بعض لوگوں کو شاید اس میں یہ خلجان ہو کہ ہمکو تو بظاہر اپنی اولاد اور بیوی کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں اولاد اور بیوی کے ساتھ طبعی محبت ہے عقلی محبت نہیں۔ اور طبعی محبت تو جانوروں کو بھی اپنی اولاد وغیرہ سے ہوتی ہے۔ یہ کچھ کمال نہیں اور نہ خدا رسول کے ساتھ ایسی محبت مامور بہا ہے۔ بلکہ محبت عقلیہ مامور بہا ہے جس کا منشا محبوب کا کمال ہوتا ہے۔ سو یہ محبت اللہ ورسول کے ساتھ زیادہ ہے۔ اور کسی کے ساتھ اُن کے برابر نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے برابر صاحب کمال کوئی نہیں۔ اور خدا تعالیٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی صاحب کمال نہیں۔ اس لئے آپ کے ساتھ بھی یقیناً بہ نسبت سب کے زیادہ محبت ہے۔ مگر عقلی ہے۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے۔ تو طبعی محبت بھی مسلمانوں کو اللہ ورسول ہی سے زیادہ ہے۔ اور کسی کے ساتھ اتنی محبت نہیں۔ مگر اس کا ظہور کسی محرک کے وقت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک قصہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ ہمارے اطراف میں ایک بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

گذرے ہیں۔ جو تقوی کے اندر ہمارے اکابر میں مسلم و ممتاز تھے۔ وہ ایک بار موضع
گڑھی بخیتہ میں تشریف لیگئے وہاں کے رئیس نے مولانا سے سوال کیا کہ حدیث میں
آیا ہے۔ لا یومن احدکم حتی یکون اللہ و رسولہ احب الیہ من نفسہ و مالہ
لہ لا ولدہ اجمعین۔ کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہو گا۔ جبتک اللہ و
رسول اُسکی جان و مال و اولاد وغیرہ سب سے زیادہ اس کو محبوب نہو جائیں۔ مگر میں دیکھتا
ہوں کہ مجھے اپنے والد صاحب سے محبت زیادہ ہے۔ مولانا نے اُس وقت تو اس کا ایک
مناسب جوابدے دیا۔ پھر یہ چاہا کہ اُن کے اس شبہ کو عملی طور پر دفع کر دیا جائے۔ تو
زیادہ اطمینان کا باعث ہو گا۔ چنانچہ آپ نے عملی طور پر اس کا جواب اس طرح دیا۔ کہ
تھوڑی دیر میں باتوں باتوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا حضور کا
ذکر ایسا ہی۔ جس میں ہر مسلمان کو لطف آتا ہے سب لوگ شوق سے سُننے لگے۔ اور وہ
رئیس بھی بہت مزے لیلے کر سُن رہے تھے۔ جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب کو حضور
کے تذکرہ میں بہت مزہ آرہا ہے۔ تو درمیان میں حضور کا ذکر قطع کر کے فرمانے لگے۔ کہ
اچھا خانصاحب اس ذکر کو تو رہنے دیجیے۔ اب میں کچھ آپ کے والد ماجد کے کمالات
و مناقب بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے اچھے آدمی تھے۔ وہ رئیس بولے حضرت
توبہ توبہ آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تذکرے میں میرے والد صاحب کا
تذکرہ کہاں سے ٹھونس دیا۔ نہیں نہیں آپ حضور ہی کا تذکرہ کیجیے۔ میرے والد
صاحب کے کمالات کو حضور سے کیا نسبت۔ جو آپ درمیان میں خواہ مخواہ اُن کا
ذکر کرنے لگے۔ میرے قلب کو اس سے بہت گرانی ہوئی۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا۔
کیوں خانصاحب تم تو یہ کہتے تھے کہ مجھے اپنے والد کے ساتھ محبت زیادہ معلوم
ہوتی ہے۔ پھر حضور کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ گراں کیوں ہوا۔ خانصاحب
سمجھ گئے کہ مولانا نے میرے شبہ کا عملی جواب دیا ہے۔ کہنے لگے مولانا جزاک اللہ
اب میرا شبہ جاتا رہا۔ اور معلوم ہو گیا کہ الحمد للہ مجھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم
کیساتھ ایسی محبت ہے کہ والد کی محبت کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی	مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

تو صاحبو! موازنہ کیوقت معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اللہ و رسول کے برابر مسلمان کو کسی سے بھی محبت نہیں۔ اور موازنہ ہوتا ہے۔ کسی محرک کے پائے جانے پر مثلاً۔ فرض کرو کہ ایک شخص تمہارے ماں باپ کو گالی دے۔ اور ایک شخص اللہ و رسول کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی کرے۔ تو بتلاؤ تم کو کس پر غصہ زیادہ آئیگا۔ یقیناً جس نے اللہ و رسول کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اس پر زیادہ غصہ آئیگا۔ اور تم آپے سے باہر ہو کر۔ اس کی زبان نکالنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔ جب ہر مسلمان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی ذلت اور ماں باپ کی ذلت کو گوارا کر سکتا ہے۔ مگر اللہ و رسول کی شان میں ذرا سی گستاخی کا تحمل نہیں کر سکتا۔ تو اب مطمئن رہو کہ بحمد اللہ تم کو طبعی محبت بھی اللہ و رسول ہی سے زیادہ ہے۔ مگر اس کا ظہور کسی محرک کے پائے جانے پر ہوتا ہے۔ اور جب آپ کو اللہ و رسول سے محبت زیادہ ہے۔ تو اب اسکے کیا معنی کہ بدون سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ۔ صاحبو! اگر کوئی محبوب ایک مہمل زبان تصنیف کرے۔ عاشق سے اس میں باتیں کرے۔ تو عاشق اگر سچا عاشق ہے تو یقیناً اس کی قدر کریگا۔ اور وہ مہمل زبان ہی اس کی نظر میں فصیح زبان سے زیادہ پیاری ہوگی۔ کیونکہ محبوب کی زبان ہے اور قرآن تو مہمل بھی نہیں۔ بلکہ نہایت فصیح و بلیغ عجیب و غریب شیریں زبان ہے جو لوگ سمجھتے ہیں وہ تو اس کی فصاحت اور بلاغت اور شیرینی کو سمجھتے ہی ہیں۔ مگر جو نہیں سمجھتے ان کو بھی اس میں بہت مزہ آتا ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اور جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں۔ وہ اس کا خوب تجربہ کئے ہوئے ہیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو ذرا اس سے قرآن سنکر دیکھ لو کہ بدون معنی سمجھے تم کو مزہ آتا ہے یا نہیں۔ واللہ بعض دفعہ نہ سمجھنے والوں کو بھی ایسا مزہ آتا ہے کہ دل پھٹ جاتا ہے بس قرآن کی یہ حالت ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد	برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنی را

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن

پڑھنا گویا اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ آپ عاشق ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ محبت وہ چیز ہے۔ کہ عاشق طرح طرح سے اس کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے۔ کہ محبوب سے باتیں کرنیکا موقع ملے۔ حضرت سید موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال ہوا تھا۔ وما تلک بیمینک یاموسیٰ۔ اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے۔ اس کے جواب میں صرف اتنا کافی تھا۔ کہ عصا کہدیتے۔ مگر نہیں۔ چونکہ ان کو محبت تھی۔ تو اس وقت کو غنیمت سمجھا کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔ ھی عصای اتوکا علیھا واھش بھا علی غنمی۔ کہ یہ میری لاٹھی ہے۔ میں اس پر سہارا لگالیتا ہوں۔ اور اس سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں۔ کتنی تطویل کی کہ ھی بڑھایا اوّل میں اور یائے متکلم کا اضافہ کیا۔ آخر میں پھر اس لاٹھی کے منافع دو جملوں میں بیان کئے۔ اور اسکے بعد فرمایا۔ ولی فیھا مارب اخری کہ اس میں میرے اور بھی مقاصد ہیں۔ یہ اسواسطے بڑھایا تاکہ آئندہ بھی کلام کی گنجایش رہے۔ کہ شاید حضرت حق دریافت فرماویں۔ کہ ہاں صاحب وہ اور مقاصد کیا ہیں۔ ذرا وہ بھی بیان کیجئے۔ تو پھر اور باتیں کرونگا۔ یا خود ہی عرض کریں کہ حضور اُس وقت اس کی شرح نہ ہوئی تھی۔ میں اب عرض کرنا چاہتا ہوں۔ غرض آئندہ باتیں کرنے کی گنجایش رکھ لی۔ یہ بات ابھی ذہن میں آئی۔ غرض عشاق کو محبوب سی باتیں کرنے میں عجیب مزہ آتا ہے۔ اور یہ دولت مسلمانوں کو گھر بیٹھے ہر وقت نصیب ہے۔ کہ وہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرلیں یعنی قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔ پھر حیرت ہے کہ قرآن کے بدون سمجھے پڑھنے کو بے فائدہ بتلایا جائے۔ کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے۔ صاحبو! یہ بڑی دولت ہے۔ مگر اس کی قدر و محبت والے جانتے ہیں۔ بس محبت کی ضرورت ہے عشاق کی تو یہ حالت ہی۔ کہ محبوب کا نام سُننے میں بھی انکو مزہ آتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر	ولا تسقنی سرا متی امکن الجھر

کہ مجکو شراب پلا اور زبان سے یہ بھی کہتا رہ کہ شراب ہے۔ شراب ہی۔ آخر شراب منہ سے لگ جانے کے بعد اس کی کیا ضرورت ہی کہ نام بھی لیا جائے۔ اس کا یہی راز ہی کہ

محبوب کا نام سُننے میں بھی مزہ آتا ہے۔ پھر غضب ہے کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کا نام سُننے میں مزہ نہ آئے۔ اور قرآن سے زیادہ خدا کا نام کس کتاب میں ہوگا۔ ہر آیت میں قریب قریب بار بار خدا کا نام آتا ہے۔ اور جا بجا خدا کی حمد و ثنا اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی کر نہیں سکتا۔ اور گو ذکر اللہ کے اور طریقے بھی ہیں۔ مگر نماز اور تلاوت سے زیادہ کوئی طریقہ بہتر نہیں۔ حدیث سے یہ بات تصریح کے ساتھ ثابت ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے الفاظ کا اس قدر عشق تھا۔ کہ آپ خود تلاوت کرتے ہی تھے۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ علیہما سے فرمایا کہ مجھے قرآن سُناؤ۔ اُنہوں نے عرض کیا۔ اعلیک اقرأ و علیک انزل (او کما قال) کیا حضور کو میں سناؤں۔ حالانکہ آپ ہی پر تو قرآن اُترا ہے۔ فرمایا ہاں میں دوسرے کی زبان سے سُننا چاہتا ہوں۔ آخر حضور نے صحابہ سے یہ درخواست کیوں کی حالانکہ سارا قرآن آپ کو حفظ تھا۔ اور اس کے معانی بھی آپ کے ذہن میں حاضر تھے۔ صرف اسی لئے کہ قرآن کے الفاظ سے آپکو عشق تھا اور دوسرے کی زبان سے سُننے میں بوجہ یکسوئی کے مزہ زیادہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ صرف الفاظ قرآن بھی۔ بدون لحاظ معنی کے مطلوب و مقصود ہیں۔ صاحبو! اس سے بڑھکر الفاظ قرآن کا نفع اور کیا ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی قرأت کی طرف بہت توجہ فرماتے اور نہایت توجہ سے سُنتے ہیں۔ اب غور کر لیجئے کہ اگر کسی عاشق کو کسی مخبر سے یہ معلوم ہو جائے۔ کہ محبوب تیرا گانا سُن رہی ہے۔ تو بتلائیے وہ کیسے مزے لے لیکر گائیگا۔ اور کس طرح بنا سنوار کر پڑھیگا۔ پس حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل اور اصدق کون مخبر ہوگا۔ سو حضور نے ہمکو خبر دی ہے۔ کہ حق تعالیٰ قرآن پڑھنے والے پر بہت متوجہ ہوتے اور نہایت توجہ سے اس کی قرأت سُنتے ہیں۔ اس سے بھی الفاظ کا مقصود ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ قرأت اور استماع الفاظ ہی کے متعلق ہے۔ نہ کہ معانی کے۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ ہم کو قرآن پڑھتے ہوئے اس امر کا استحضار کرنا چاہیے

کہ حق تعالیٰ ہماری قرأت کو سُن رہے ہیں۔ اس مراقبہ کا اثر ہوگا کہ نہایت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ صحت کا لحاظ کر کے قرأت کی جائیگی۔ اور بے پروائی کے ساتھ نہ پڑھا جاویگا۔ دوسرے اچھا میں نے مانا کہ معانی ہی اصل مقصود ہیں۔ مگر یہ کبھی نہ مانوں گا کہ معانی ہر وقت مقصود ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک وقت ایسا بھی ضرور ہونا چاہیے جس میں صرف الفاظ ہی مدنظر ہوں۔ اور معانی پر التفات نہو۔ جیسا کہ ریاضی میں پہاڑے یاد کئے جاتے ہیں۔ اُس وقت مقصود پر اصلا نظر نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف الفاظ ہی کو رٹا جاتا ہے۔ اور جیسے کھانا کھانے سے مقصود قوت ہے۔ مگر کھانے کیوقت لذت پر بھی نظر ہوتی ہے۔ صورت پر بھی نظر ہوتی ہے۔ کہ روٹی جلی ہوئی سیاہ نہو۔ سالن میں نمک مرچ بہت تیز یا کم نہو۔ اُس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ مقصود تو قوت ہے۔ صورت اور لذت پر نظر کرنا بے فائدہ ہے۔ افسوس دنیا کی چیزوں میں تو صورت اور لذت پر نظر ہو اور قرآن میں یہ امور بے فائدہ ہو جائیں۔ حیرت ہے۔ اور تلاوت قرآن میں لذت اُسی وقت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ تلاوت کے وقت معانی توجہ نہو۔ صرف الفاظ ہی پر توجہ ہو۔ کیونکہ وہ مراقبہ جو ابھی بیان ہوا ہے۔ کہ تلاوت کے وقت اپنے کو پڑھنے والا سمجھے اور حق تعالیٰ کو متکلم سمجھے۔ اور اپنے کو مثل شجرۂ طور کے حاکی اور ناقل سمجھے۔ یہ مراقبہ صرف الفاظ ہی پر توجہ کرنے میں حاصل ہو سکتا ہے۔ معانی پر توجہ کے ساتھ یہ مراقبہ نہیں ہو سکتا۔ چاہے تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اسی طرح یہ مراقبہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ہماری تلاوت کو سُن رہے ہیں صرف توجہ علے الالفاظ سے حاصل ہوتا ہے۔ بدون اس کے نہیں ہو سکتا۔ پھر الفاظ بدون فہم معانی کے بیکار کیوں ہوئے۔ صاحبو! دریا کی سطح کی سیر میں جو لذت ہے وہ سیر عمق میں نہیں ہے۔ گو سیر عمق سے موتی ہاتھ لگتے ہیں جو سطح کی سیر سے حاصل نہیں ہوتے۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سطح دریا کی سیر بیکار ہے ہرگز نہیں۔ اطبار سے پوچھو وہ سطح دریا کی سیر کو فرحت بخش بتلاتے اور کہتے ہیں۔ کہ اس سے دل و دماغ کو سرور اور نگاہ کو تازگی و نور حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مدقوق کے لئے سیر دریا اسی واسطے تجویز کی جاتی ہے۔ کہ اس کو فرحت ہو۔ اور فرحت سے طبیعت کو قوت حاصل ہو۔ جس سے

مرض کو وہ از خود دفع کر دے۔ تو کیا سطح دریا کی سیر کو تو بیکار نہ کہا جاوے۔ اور سطح قرآن
کی سیر کو بیکار کہا جاوے۔ کتنا بڑا ستم ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ اصل مقصود تمام طاعات
سے قرب حق ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں سے اولاً الفاظ آئے ہیں اور معانی اُن کے
تابع ہو کر آئے ہیں۔ پس الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہوا۔ اگر یہ الفاظ قرآن بے
معنی بھی ہوتے تو عاشق کیلئے یہی کافی تھے۔ کیونکہ محبوب اگر عاشق کو کوئی چیز دے
تو وہاں دو لذتیں ہیں۔ ایک لذت محبوب کے ہاتھ سے ملنے کی۔ دوسری لذت اُس
چیز کے کھانے کی اور ظاہر ہے کہ عاشق کے رقص کیلئے تو یہی لذت کافی ہے
کہ اس کو محبوب کے ہاتھ سے یہ چیز ملی ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ اُس چیز کو صرف بھی
نہیں کیا جاتا۔ بلکہ محبوب کی یادگار سمجھ کر بطور تبرک کے رکھ لیا جاتا ہے۔ جیسے حضور
صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ایک قیراط زیادہ دیا تھا۔ اُنہوں نے اسکو
خرچ نہیں کیا۔ بلکہ اس کو ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا۔ پس عشاق کیلئے تو الفاظ قرآن ہی
رقص کے واسطے کافی تھے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً و بالذات ہمکو ملے ہیں گو
ان میں معانی بھی نہوتے۔ مگر معانی کے ساتھ دو لذتیں جمع ہو گئیں۔ تو اب یہ کیونکر
ہو سکتا ہے۔ کہ لذت معانی سے لذت الفاظ کو چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ دونوں لذتیں قابل
لحاظ ہیں اور الفاظ کی لذت اس جہت سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی
طرف سے اولاً آئے ہیں۔ گویا باعتبار قصد کے معانی اصل ہیں اور الفاظ اُن کے تابع
غرض بعض جہات سے ان الفاظ کو زیادہ قرب ہے اور بعض جہات سے معانی کو زیادہ قرب
ہے۔ اور کوئی ایک دوسرے سے مغنی نہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہدیا۔ کہ کہیں حفاظ
خوش نہوں کہ ہم سب سے افضل ہو گئے۔ کیونکہ الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہے۔
تو وہ ایک طرفہ فیصلہ کر کے خوش نہوں۔ میں ایک طرفہ فیصلہ کر کے ڈگری نہیں دیتا۔ بلکہ
دونوں جماعتوں کیلئے فیصلہ کرتا ہوں کہ بعض جہات سے اہل الفاظ افضل ہیں اور بعض جہات سے
اہل معانی اور قرآن کی دونوں چیزیں قابل اہتمام ہیں صورت بھی اور معنی بھی کیونکہ ہر چیز کی طرف
صورت و معنی دونوں ہی کیوجہ سے رغبت ہوتی ہے صورت کو کوئی بیکار نہیں کہہ سکتا دیکھئے کاپی کی

مصری شیر بنی میں تو یہاں کی بجری کے برابر ہے۔ مگر صورت اور صفائی کی وجہ سے لوگ اس کو منگاتے ہیں۔ کیونکہ صورت خوش دیکھ کر کسی چیز کا کھانا عجیب لطف دیتا ہے۔ اسی طرح کپڑوں میں ایک صورت ہے۔ ایک معنی مقصود تو ستر عورت ہے اور گرمی و سردی سے بچنا۔ اس میں ہر قسم کا کپڑا یکساں ہے۔ اور ایک صورت ہے۔ یعنی کپڑے کی باریکی۔ تراش اور نقش و نگار وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ صورت محض بیکار نہیں بلکہ اس کے لئے بھی بڑی کوشش کی جاتی ہے اور دیکھئے عورت کی ایک صورت ہے ایک معنی۔ معنی تو ہمبستری اور خانہ داری کا کام لینا ہے۔ اس مقصود کیلئے ہر عاقل بالغ عورت کافی ہے۔ اور ایک صورت ہے کہ رنگ بھی اُجلا ہو۔ ناک نقشہ بھی خوبصورت ہو۔ خاندان کی بھی بڑی ہو۔ مگر صورت بیکار ہے۔ تو یہاں صورت پر کیوں مرتے ہو۔ اور کیوں اس کے لئے خاک چھانی جاتی ہے۔ اسی طرح ادویہ میں بہت چیزیں ایسی ہیں۔ جو باہم یکساں خاصیت رکھتی ہیں۔ مگر بعض دفعہ ادویہ کو صورت نوعیہ کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ دوائیں بعض مؤثر بالخاصہ بھی ہوتی ہیں۔ جیسے تعلیق کہربا خفقان کو نافع ہے۔ تو ایسی ادویہ صورت نوعیہ کی وجہ سے مؤثر ہوتی ہیں۔ یہاں صورت کا لحاظ کیوں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ باہم متحد المعانی ہوتے ہیں مگر صورت کی وجہ سے ان میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض الفاظ القاب و آداب میں اپنی صورت کی وجہ سے مطلوب ہوتے ہیں۔ اگر اُن کی جگہ دوسرے الفاظ ان ہی کے ہم معنے بولے جائیں۔ تو سخت حماقت قرار دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی باپ کو برخوردار نور چشم لکھے۔ تو پاگل شمار ہو گا۔ حالانکہ اس کے معنی کچھ بھی بُرے نہیں۔ برخوردار معنی دام ظلہم کے ہے۔ کہ ہمیشہ دنیا سے پھل کھاتے رہیں۔ یا صاحب نصیب ہوں۔ اور نور چشم کے معنے ہیں آنکھ کی روشنی تو باپ تو آنکھ اور کان سب ہی کا وسیلہ ہے۔ یہ آنکھ کی روشنی بھی اولاد کو باپ ہی سے ملی ہے۔ تو معنی تو بُرے نہیں مگر الفاظ کی صورت کی وجہ سے کاتب کو احمق اور پاگل بنایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ معنے ہی ہمیشہ مطلوب ہوتے ہیں۔ اور الفاظ مطلوب نہیں ہوتے۔ اس سے بڑھ کر اور سنئے۔ انسان کی ایک صورت ہے

اور ایک معنی - چنانچہ معنی انسان روح انسانی ہے - جس کی بدولت آدمی گدھے کیوں سے ممتاز ہے - تو اگر یہ دعویٰ مان لیا جائے - کہ صورت محض بیکار ہے - تو ان مدعیوں کو چاہیئے کہ اپنی اولاد کا گلا گھونٹ دیا کریں - کیونکہ یہ تو محض صورت ہی - اس کی کیا ضرورت ہے - بلکہ مقصود تو معنی ہیں یعنی روح اور وہ گلا گھونٹنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے - کیونکہ موت سے ارواح فنا نہیں ہوتیں - تو کیا اس کو کوئی عاقل گوارا کر سکتا ہی ہرگز نہیں معلوم ہوا - کہ معنی کی طرح صورت بھی مطلوب ہی - پھر قرآن ہی میں اس کے خلاف یہ نیا قاعدہ کیوں جاری کیا جاتا ہے - کہ اس کی صورت یعنی الفاظ بدون معنی کے بیکار ہے - الحمد للہ میں نے مختلف وجوہ سے مسئلہ کو ثابت کر دیا - کہ الفاظ قرآن بدون فہم معنی کے بھی مطلوب ہیں - اور ان کا پڑھنا ہرگز بیکار نہیں - اب یہ دعویٰ بالکل باطل ہو گیا کہ بدون معنی کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ (الفاظ القرآن ص۱۱۱ تا ص۱۲۴ ملخصاً) اب میں حروف مقطعات کا نکتہ بیان کرتا ہوں - جو ان آیات کے شروع میں وارد ہیں اور میں ان سے بھی اپنا مدعا ثابت کرونگا - جیسا کہ میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا - حروف مقطعات میں بہت سے نکات ہیں - ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ اسرار ہیں - درمیان اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور ان کے معانی سے واقف تھے - مگر دوسروں پر آپ نے انکے معانی ظاہر نہیں فرمائے - کیونکہ ان کا تعلق محکمہ شرائع عالیہ سے نہیں - بلکہ دوسرے محکمہ سے ہی - ان اسرار کو اسی محکمہ کے آدمیوں پر ظاہر کیا جاتا ہے - تو ممکن ہے کہ ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو اُن سے واقف کیا گیا ہو - چونکہ امت کو اس محکمہ سے تعلق نہیں - اس لئے ہم لوگوں کو ان اسرار پر مطلع نہیں کیا گیا - ایک مرتبہ میں نے درس میں یہی تقریر کی تھی - اور اُس وقت ایک کورٹ انسپکٹر موجود تھے وہ لگے کہنے - آپ سچ کہتے ہیں - واقعی ہر محکمہ کے خاص اسرار ہوتے ہیں - جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا - میں نے کہا - آپ تو ایسی تصدیق کر رہے ہیں - جیسے آپ پر یہ بات گذری ہو - کہنے لگے جی ہاں مجھے آجکل ہی یہ بات پیش آئی ہے - میں ایک دن سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی پر گیا ہوا تھا - اُن کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی - میں اُس کو

دیکھنے لگا۔ تو صاحب نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے لیلی۔ اور کہا یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے۔ اس میں محکمہ خفیہ پولیس کے اسرار ہیں۔ جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا۔ اور وہ اسرار کچھ اصطلاحات ہیں کہ سی۔ آئی۔ ڈی والے ان اصطلاحات میں ایک دوسرے کو تار کے ذریعہ سے خبریں دیتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ ان اخبار پر مطلع نہیں ہوتے۔ اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا۔ کہ حسیات میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ دوسرا نکتہ اس میں ابھی میرے ذہن میں آیا ہے۔ وہ یہ کہ ممکن ہے کہ اس میں اس مضمون پر تنبیہ مقصود ہو کہ قرآن سے محض معانی مقصود نہیں۔ بلکہ الفاظ بھی مقصود ہیں۔ کیونکہ بعض الفاظ قرآن میں غیر معلوم المعنی ہیں۔ اگر صرف معانی مقصود ہوتے۔ تو قرآن میں ایسے الفاظ کیوں ہوتے۔ حالانکہ وہ جزو قرآن ہیں۔ جن کی قرآنیت کا انکار کفر ہے۔ ایک نکتہ اس میں یہ ہے۔ کہ حروف مقطعات میں احاد و عشرات و مآت کو جمع کیا گیا ہے۔ جس سے بعض اہل کشف نے بعض حوادث پر بطور پیشین گوئی کے استدلال کیا ہے جو ایک مستقل علم ہے۔ اسکے علاوہ اور بہت سے نکات ہیں۔ خلاصہ بیان کا یہ ہے۔ کہ نہ محض الفاظ کو مقصود سمجھو اور معانی کو بیکار۔ نہ محض معانی کو مقصود سمجھو اور الفاظ کو بیکار۔ بلکہ قرآن کے الفاظ و معانی دونوں مقصود ہیں۔ (الیضاً ص ۲)

(۷۳) اس شبہ کا جواب کہ فرشتوں سے اللہ تعالیٰ یہ کیوں پوچھتے ہیں۔ کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم نہیں ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق ایک بات کہدی تھی۔ جس سے ابتک اُن کا پیچھا نہیں چھٹا۔ سو ان سے پوچھ کر یہ جتلاتے ہیں کہ دیکھو یہ وہی تو ہیں۔ جن کے بارہ میں تم نے ایسا کہا تھا۔ فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ فرشتوں نے کہا تھا۔ اتجعل فیھا من یفسد فیھا۔ کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں۔ جو اس میں فساد کرے۔ من سے مراد عام تھا۔ کہ وہ سب ایسے ہی ہونگے سو وہ موجبہ کلیہ کے مدعی تھے۔ پس سالبہ جزئیہ اُن کے مقابلہ میں کافی ہو گیا یعنی

ایک ایسے شخص کا پیش کر دینا جو مطیع کامل ہو۔ ان کو موجبہ کلیہ توڑنے کیلئے کافی ہی یہ نہیں کہ سارے مطیع ہوں۔ تب ہی اُن کا جواب ہو سکے) سو فرشتے ایک دفعہ ہمیں اعتراض کرنے سے پکڑے گئے۔ آجتک ان کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ جب کوئی موقع ہوتا ہے۔ تو حق تعالیٰ جتلا دیتے ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کی بدلی ہوتی ہے۔ عصر اور صبح میں۔ جو فرشتے عصر کے وقت آئے تھے وہ صبح کے وقت رخصت ہوتے ہیں۔ اور ان کی بجائے دوسرے فرشتے آتے ہیں۔ پھر وہ عصر کے وقت چلے جاتے ہیں۔ اور دوسرے آجاتے ہیں۔ جب واپس ہو کر جاتے ہیں۔ تو اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے بندے کیا کر رہے تھے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ یا الٰہی جب ہم گئے تھے۔ جب بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ اور واپسی کے وقت بھی نماز پڑھتے چھوڑا۔ اللہ میاں دونوں وقت فرشتوں کو جتلا دیتے ہیں۔ اور بدلی بھی خاص اُس وقت میں کرتے ہیں۔ جو ہنر کا وقت ہے۔ اور اُسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں۔ کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو۔ حالانکہ فرشتے دیکھتے سب ہیں۔ جو کچھ بھی بندے کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی شان ہے۔ یعلمون ما تفعلون۔ مگر ان سے صرف اُسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں۔ اور بلا پوچھے خود وہ کہہ نہیں سکتے۔ (الصلوٰۃ ص ۴۵)

(۳۸) لوح محفوظ کی وسعت پر شبہ کا جواب

ایک دفعہ ایک منکر غیبیات نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ لوح محفوظ کتنی بڑی مان لیجئے۔ مگر کبھی تو ختم ہو جائیگی۔ ہزاروں لاکھوں برس ہو چکے۔ بیشمار چیزیں پیدا ہوئیں اور فنا ہوئیں۔ کہاں تک لوح محفوظ میں لکھا گیا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہارا ذہن ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس میں تم نے کتنی ہی چیزیں بھری ہوں گی مگر وہ ابھی تک خالی ہے۔ تو لوح محفوظ تو ذہن سے بہت بڑی ہے۔ ہاں واقعی اتنے سے ذہن میں کس قدر گنجائش ہے۔ کہ دلی کلکتہ۔ زمین و آسمان سب کچھ سمایا ہوا ہے۔ اگر حصول الاشیاء بانفسہا نہ مانیئے۔ باشباہہا کے قائل ہو جیئے۔ تب بھی شبح دلی کی دلی کم

برابر تو ہوگی۔ جیسا سوچنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اچھی ذہن پٹھانہ سہی۔ کہ اشیائے یا اشباح لطیف ہیں۔ تب بھی اتنا بڑا آسمان اتنی بڑی زمین۔ اتنی بڑی دلی۔ ذہن اتنا بڑا کہاں سے ہوگیا۔ تو لوح محفوظ میں تمام چیزوں کا سما جانا کیا مشکل ہے۔ تو ذہن محض اس وسعت میں تو سب کا مشابہ لوح محفوظ کے ہی۔ مگر علم صحیح سے خاص باعتبار علوم غائبہ کے بھی بالکل سچا نمونہ لوح محفوظ کا ہو جاتا ہے (روح الجوار ص ۳۹)

(۳۹) جواب اس شبہ کا کہ جب مرنے کے بعد روح جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو پھر عذاب قبر کس چیز پر ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ وہ روح ہے۔ جس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے۔ رہا یہ کہ روح مجرد ہے یا مادی ہے۔ بعض اہل کشف کا قول ہے کہ مجرد ہے۔ اور بعض متکلمین اس طرف گئے ہیں کہ مادی ہے۔ اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ تجرد خواص واجب سے ہی۔ لیکن یہ دعویٰ خود بے دلیل ہے۔ بلکہ خواص واجب سے قدم اور وجوب ہے۔ سو جو حکما، مجردات کے قائل ہوئے ہیں۔ وہ مجردات میں قدم بھی مانتے ہیں۔ یہ بے شک باطل ہے۔ باقی اگر روح کو مجرد کہا جائے۔ اور حادث بالذات و بالزمان بھی مانا جاوے۔ تو کونسی دلیل عقلی کے خلاف ہے۔ غرض بعض متکلمین تو سوائے واجب کے کسی چیز کے مجرد ہونیکے قائل نہیں۔ اور صوفیہ کرام کئی چیزوں کے تجرد کے قائل ہوئے۔ ان کو لطائف کہتے ہیں۔ جیسے روح قلب سر۔ خفی۔ اخفی۔ اور کہتے ہیں۔ کہ انسان جس طرح عناصر سے مرکب ہے۔ اسی طرح ان اجزائے مجردہ سے بھی ہے۔ اور اس پر یہ دلیل بیان کرتے ہیں۔ کہ ہم نے خلوات اور مراقبات میں مجردات کا مشاہدہ کیا ہی۔ سو جبتک قرآن و حدیث کیخلاف نہ ہو۔ کیونکر اس کا انکار کر سکتے ہیں۔ تو اگر روح مجرد ہے۔ تو اس پر البتہ بیٹھنا صادق نہیں آتا مگر صوفیہ اسکے قائل ہوئے ہیں۔ کہ دوسرا بدن جو مشابہ اسی بدن عنصری کے ہوتا ہے عالم برزخ میں دیا جاتا ہے۔ تو جس طرح یہ حی تھا۔ وہ بھی حی ہی۔ سب عذاب و ثواب اس پر ہوتا ہے۔ اور اس بدن کی طرح اُسے بھی حس ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ حس ہوتی ہی

کیونکہ اس کا مادہ لطیف ہوتا ہے (روح البحج والثلج ص۱۳)

(۴۰) اہل ریاضی کی تقلید سے بارہ بروج کا ثبوت قرآن مجید سے دینا صحیح نہیں

فرمایا منجمین حکمار نہیں۔ کسی شخص نے ان کو زمرۂ حکمار میں نہیں شمار کیا۔ حکمار وہ لوگ ہیں جنہوں نے حقائق و اصول اشیار معلوم کر کے دلائل عقلی و براہین قطعی سے ثبوت دیا۔ اور اہلِ نجوم محض تخمینیات و توہمات و خرافات سے کام لیتے ہیں کسی دعوے پر دلیل قائم نہیں کر سکتے۔ محض واہیات خرافات سے کام لیتے ہیں۔ دلائل تو دلائل دعاوی بھی نورٌ علیٰ نورٍ ہیں۔ اور ہمارے بعض مفسرین نے غضب ہی کیا ہے۔ کہ بعض آیات کی تفسیر اُن کے اقوال پر مبنی کردی۔ بعض اصطلاحات ایسے مشہور و معروف ہو جاتے ہیں کہ اُن سے اصاغر و اکابر کوئی نہیں بچتا۔ اِلّا ما شار اللہ۔ چنانچہ بعض مفسرین نے تو قرآن شریف میں بروج سے بارہ بروج اہل ریاضی کے مراد لئے ہیں۔ حالانکہ وہ خود اجزار تحلیلیہ ہیں۔ موجود حقیقی نہیں۔ اور متبادر قرآن سے اُن کا وجود حقیقی ہے۔ پس بحیثیت تحلیل تفسیر صحیح نہیں۔ سیدھی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بروج سے مراد کواکب عظام ہیں۔ نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کو چھوڑ کر اہل ریاضی کی تقلید قرآن مجید میں کی۔ خود قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے۔ ولو کنتم فی بروج مشیدۃ۔ اس سے صریح تائید ابن عباس رضی اللہ کی ہوتی ہے اور بعض نے ہئیت و نجوم دونوں کو مخلوط کر دیا ہے۔ یعنی ان بروج کے ساتھ خاص خاص کواکب کو مختص بھی کر دیا ہے جس کی بنار محض خرافات نجومیہ ہیں۔ ورنہ اہلِ ہیئت بعض کواکب کو بعض بروج سے مختص نہیں سمجھتے بلکہ ہر کوکب ہر برج میں گردش کرتا ہے۔ البتہ اہل نجوم کہتے ہیں۔ کہ بعض کواکب بعض بروج کے ساتھ مختص ہیں۔ اور دلیل وہ بجز پوچ کہ ناگفتہ بہ۔ کہتے ہیں کہ مثلاً ایک برج ہے جس میں کچھ کواکب ثابت جمع ہو کر شکل اسد موہوم ہو گئے اس وجہ سے کہ اپنے خیال میں سوچا اس کا نام اصطلاحاً اسد رکھدیا

تھا۔ ان عقل کے دشمنوں نے یہ گھڑا کہ اسد حار المزاج ہوتا ہے۔ اسوجہ سے کواکب جاگ کو کہ شمس ہے اس سے مناسبت ہے۔ بھلا کیا محض نام سے اس برج میں حرارت آگئی۔ اُن کی عقل کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ اس دلیل سے اسد کے ساتھ شمس کو مختص کہدیا (ملفوظات ہفت اختر ملفوظ نمبر ۱۰۲)

(۱۴۱) آیات کی تفسیر قواعد ہیئت پر کرنا محض غیر موجہ ہے

فرمایا علمائے اسلام کے کلام میں جو بعض نصوص متعلقہ کو ان کی قواعد ہیئت پر تطبیق پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعضے اقوال مشہورہ ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ان الفاظ کے سنتے ہی تبادر ذہن کا ان معانی مصطلحہ کی جانب ہوتا ہے۔ گو وہ لغۃً مراد نہوں۔ اس سے عام قلوب میں ان امور غیر ثابت بالدلیل کی وقعت ہو جاتی ہے۔ پس نصوص کو بھی ان پر منطبق کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اُنکے دعاوی کی خود اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ کتب ہیئت میں مصرح ہے کہ شمس کو سمار رابع پر مانا جاتا ہے۔ لیکن خود ہمارے پاس اس کی کوئی حجت نہیں۔ اسی طرح بعض نے ثوابت کو ہر ایک کو ایک ایک آسمان میں مانا ہے۔ ان احتمالات کے ہوتے ہوئے ان پر تفسیر قرآن کو مبنی کرنا محض غیر موجہ ہے۔ بلکہ ان سب کے خلاف ان نصوص کی تفسیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب کواکب و ثوابت و سیارہ و شمس و قمر سماء دنیا میں ہیں اور سب متحرک بالذات ہیں اور ہر ایک کی حرکت علیحدہ ہے اور ثوابت کی حرکت خواہ ذاتیہ اور متشابہ ہو یا آسمان دنیا کے اندر کوئی جز و ایسا ہو۔ جو ان سب کو لیکر حرکت کرتا ہو۔ اور سماء خواہ متحرک ہو یا نہ ہو۔ البتہ جن کواکب کی چند حرکتیں محسوس ہوتی ہیں ان میں سے کسی ایک حرکت کو بالعرض کہدینگے۔ قرآن شریف سے ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کواکب سمار دنیا پر ہیں۔ اور یہ متحرک بالذات نہیں۔ ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وقولہ تعالیٰ وھو الذی خلق اللیل والنھار والشمس والقمر کل فی فلک یسبحون۔ اور کل فی فلک سے یہ شبہ نہ کیا جاوے۔ کہ ہر کوکب جُدا آسمان میں ہے۔ کیونکہ فلک اور سمار مترادف

نہیں ہیں۔ فلک کہتے ہیں دائرہ کو اور بھی معلوم ہوتا ہے کہ کواکب کی حرکت سے دائرہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ خواہ تحقیقی یا تقریبی۔ اور شریعت سے حرکت سمار ثابت نہیں بلکہ آسمان میں کواکب کی حرکت مثل مچھلیوں کی حرکت کے پانی میں ہے۔ اور حکمار نے جو فلک کو بہت سخت وصلب مان کر امتناع خرق والتیام کا حکم کیا ہے محض اپنے خیال سے گھڑ گھڑا کر باوجود عدم ثبوت مقدمات کے پھر حکم جازم کر دیا۔ چنانچہ متکلمین نے کتب کلامیہ میں ان مقدمات کا جواب دیا ہے۔ (ایضاً ملفوظ نمبر ۱۰۵)

(۱۴۲) اس شبہ کا جواب کہ قرآن وحدیث کا یہ مطلب ہی نہیں۔ جو علمار بیان کرتے ہیں

اس شبہ کے اُٹھانے کیلئے میں دوسری نظیر دیتا ہوں۔ کہ قانون وہ ہے جو کہ پارلیمنٹ نے تجویز کیا ہے اور اس کے معنے وہ ہیں جو کہ جج سمجھتے ہیں۔ کیونکہ آپ سے براہ راست تو خط وکتابت ہی نہیں جو وہ خود آپ سے اس کے معنی بیان کرتے۔ بس جن لوگوں کو انہوں نے قانون فہمی کا اہل سمجھ کر عہدہ دیا ہے۔ وہ جو معنی قانون کے بیان کریں اُس کو ماننا پڑیگا کہ قانون کے درحقیقت یہی معنی ہیں۔ دیکھئے جب ایک ہائی کورٹ کا جج ایک فیصلہ دیتا ہی تو کیا اُس وقت آپ کا یہ کہنا سماعت ہوگا کہ قانون کے یہ معنے نہیں جو تمنے سمجھے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے۔ کہ اس کے ساتھ گلخپ ہو۔ اور حکم نہ مانے تو اس کو قانون کی مخالفت قرار دیا جاویگا۔ اور اُس کیلئے سزائے جیل تجویز ہوگی۔ اگر اس وقت آپ یہ کہیں کہ صاحب آپ حکم ہی نہیں سمجھے قانون کے یہی معنی ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ تو کیا آپ کے اس کہنے کی سماعت ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ جواب ملیگا۔ کہ تم اپیل کرو۔ سو دیکھئے کہ ہائیکورٹ کے جج قانون کے سمجھنے والے تسلیم کرلئے گئے ہیں۔ اور جو وہ قانون کے معنی بیان کریں اس کی مخالفت قانون ہی کی مخالفت قرار دی گئی ہے۔ کیونکہ پارلیمنٹ کے حکام ہر مقدمہ کا فیصلہ خود تو کرتے نہیں۔ بلکہ وہ اُصول کلیہ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے قانون کے سمجھنے والے ہائیکورٹ کے جج قرار دیے گئے ہیں۔ تو ہرچند کہ ہائیکورٹ کی مخالفت

کرنے والا کہہ سکتا ہے۔ کہ میں پارلیمنٹ کا خلاف نہیں کرتا۔ بلکہ جو یہ اس قانون کے معنی بیان کرتے ہیں۔ اس کا خلاف کرتا ہوں۔ مگر اس کا یہ عذر نہیں سُنا جائیگا۔ اور اس کو پارلیمنٹ ہی کا مخالف سمجھا جائیگا۔ بس ایسے ہی حضرات آئمہ مجتہدین چونکہ قرآن وحدیث کے سمجھنے والے مان لئے گئے ہیں۔ اس لئے ان کی مخالفت خدا اور رسول کی مخالفت ہے۔ گو حدیثیں کسی شخص کو اُن سے زیادہ معلوم ہوں۔ مگر کثرت معلومات سے مجتہد نہیں ہو سکتا ۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد ۔ بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

مجتہدین کو حق تعالےٰ نے ایک خاص شان عطا فرمائی ہے۔ اب کوئی اللہ میاں سے لڑے کہ اُن کے اندر یہ قابلیت کیوں رکھی۔ اور ہمارے اندر کیوں نہیں رکھی۔ تو یہ بات ہم سے پوچھنے کی نہیں۔ خدا تعالیٰ سے پوچھئے۔ لیکن پھر یہ بھی پوچھ لینا۔ کہ انبیار کو نبوت دی مجھے کیوں نہیں دی۔ ایک وہ نظم ہے۔ کہ فلاں کو دی پیغمبری۔ میری بار کیوں دیر اتنی کری۔ اوّل نظم سے اخیر تک خدا کی شکایت ہے۔ تو اگر ایسی ترقی ہے۔ تو خدا خیر کرے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ۔

آنکس کہ تو نگرت نمے گرداند ۔ او مصلحت تو از تو بہتر داند

غرض یہ کہ خدا تعالیٰ نے مجتہدین میں ایک کمال پیدا کیا ہے۔ جو ہم لوگوں میں نہیں ہے۔ اور اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس وقت سے قرآن سے تم چند ایسی جزئیات استنباط کرو۔ جن کا حکم فقہا کے کلام میں نہ دیکھا ہو۔ پھر اوّل معاملات میں فقہا کا قول دیکھو اور اپنے استنباط کو اُن کے استنباط کے ساتھ موازنہ کرو۔ تب معلوم ہوگا کہ فقہا اور مجتہدین کی شان کیا ہے۔ مگر اس کے لئے بھی ضرورت ہے علم کی۔ سو ایسا کرنے پر بہت آسانی سے فیصلہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں اور آئمہ مجتہدین میں کتنا فرق ہے بس اس تفاوت کی وجہ سے عوام کی تو ایسی مثال ہے۔ جیسے عام رعیت اور علمار کی ایسی مثال ہے جیسے وکلا اور آئمہ مجتہدین۔ جیسے ہائیکورٹ کے جج۔ بس جب ایک رعیت کو ہائیکورٹ کے جج بلکہ ایک معمولی جج کی مخالفت جائز نہیں تو عوام کو علمار کی مخالفت کب جائز

ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں سے غلطی نہیں ہوتی۔ بلکہ غلطی ہوجاتی ہے۔ مگر اسکا
پکڑنا عوام کا کام نہیں ہے۔ بلکہ علمار ہی کا کام ہے۔ اور جبتک کہ ایک متدین عالم
کا فتویٰ بلا تعارض موجود ہے۔ عامی کے ذمے واجب ہی کہ اس کا اتباع کرے
تو اب اسکے کہنے کی کہاں گنجایش رہی۔ کہ میں تو علمار کی مخالفت کرتا ہوں خدا اور
رسول کی مخالفت نہیں کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ علمار کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں حتی
کہ اگر آپ کے سامنے ترجمہ حدیث کا موجود ہو۔ جب بھی آپ کو علمار کی مخالفت جائز
نہیں۔ کیونکہ ترجمہ سمجھنے کیلئے بھی علم کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ قانون کا ترجمہ ہوگیا ہی
مگر پھر بھی کوئی شخص جج کی مخالفت میں اپنی رائے نہیں پیش کرسکتا۔ گو وہ کسی کتاب کے
پیش کرنیکے ساتھ ہو۔ اور اگر کرے تو اب بھی اس کا وہی حال ہوگا جو قانون کا ترجمہ ہونیکی
حالت میں ہوتا۔ یعنی قانون کا مخالف قرار دیا جاویگا۔ تو اسی طرح۔ اگرچہ حدیث کا ترجمہ
ہوگیا ہے۔ مگر پھر بھی آپ کو اجتہاد کرنا۔ اور علمار سے مزاحمت کرنا جائز نہیں۔ اور جس
طرح حکام کی مخالفت کرنے والا واقع میں گورنمنٹ کی مخالفت کرنیوالا ہے۔ اسی طرح
علمار کی مخالفت کرنا حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے مخالفت کرنا ہے۔ اور علمار کی مخالفت
کرکے یہ عذر کرنا کہ ہم خدا اور رسول کے خلاف نہیں کرتے۔ نہایت نازیبا اور لچر عذر ہے
الحمدللہ یہ امر بہت خوبی کے ساتھ طے ہوگیا۔ اور آپکو معلوم ہوگیا۔ کہ آپ کو سوائے
اسکے کوئی چارہ نہیں کہ علمار کا اتباع کریں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو علم دین سے اتنی
بھی مناسبت نہیں جتنی کہ ہر شخص کو طب کے ساتھ ہوتی ہے۔ چونکہ طب سے تو
ہر ایک شخص کو کم وبیش مناسبت ہوتی ہے اور تجربہ بھی ہوتا ہے۔ برخلاف علم دین کے
کہ وہاں کسی کا تجربہ کام نہیں دیتا۔ تو جتنی طب کے ساتھ مناسبت ہے اتنی بھی
دینیات کے ساتھ نہیں۔ مگر باوجود اسکے کتنا ہی بڑا کوئی شخص ہو۔ مگر جب بیمار ہوگا طبیب
ہی سے رائے لیگا۔ کبھی طب کی کتابیں دیکھکر مسہل نہ لیگا۔ اگر یہ بھی معلوم ہوجاوے
کہ صفرار کا فساد ہے۔ جب بھی اپنی رائے سے علاج نہیں کریگا۔ کیا کسی نے ایسا کیا
ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی یہ رائے دے بھی۔ کہ طبیب کی

کیا ضرورت ہے۔ تو کہیں گے کہ بغیر طبیب کے علاج نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنی عقل اور رائے سے خدا جانے کیا خرابی پیدا ہو۔ اسکے راز سے طبیب ہی واقف ہیں۔ پس طب میں تو باوجود مناسبت ہونیکے اپنی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ مگر علم دین میں باوجود مناسبت نہ ہونے کے ہر شخص اجتہاد کرنے لگتا ہے۔ تو گویا شریعت کوئی راز ہی نہیں ہے۔ اور وہ ایسی پامال اور معمولی شے ہے۔ کہ اس کیلئے علم کی ضرورت ہی نہیں۔ کہ ہر شخص خود اس کو سمجھ سکتا ہے۔ حالانکہ جیسے وہاں کوئی کیسا ہی عاقل سے عاقل ہوگا۔ مگر بدون اتباع طبیب کے چارہ نہیں۔ اسی طرح امور شریعت میں سوائے اتباع علماء دین کے چارہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ غیر ماہر کو ماہر کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ پس عقلی طور پر ثابت ہوگیا کہ علماء کا اتباع آپ کو ضروری ہی۔ اور وہ جو احکام تبلاتے ہیں وہ درحقیقت خدا اور رسول کے احکام ہیں۔ پس جب یہ خدا اور رسول کے احکام ہیں۔ تو ہر مسلمان کو ان کا اتباع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا اور رسول کا اتباع کرنا ضروری ہے (اتباع المنیب) صـ ۱۴

(۳۴) اس شبہ کا جواب کہ طاعون ہوا بگڑنے سے ہوتا ہی۔ اعمال کی خرابی کو اس میں دخل نہیں

آجکل تو اس مذاق ہی کے لوگ کم ہیں۔ جو ان مصائب کو اعمال کی خرابی کیطرف منسوب کریں۔ بلکہ بہت لوگ ان کو اسباب مادیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کہ ہوا بگڑ گئی۔ اس سے طاعون ہوگیا۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا۔ کہ طاعون میں ہوا بگڑنے کو دخل نہیں۔ ممکن ہے کہ اس کو بھی دخل ہو۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ شریعت کے تبلائے ہوئے سبب کا کیوں انکار کرتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز کے متعدد اسباب ہوں۔ ایک سبب قریب ہو۔ ایک سبب بعید۔ ایک سبب ظاہری ہو۔ ایک سبب حقیقی ہو۔ آپ کہتے ہیں کہ ہوا بگڑنے سے طاعون ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ظاہری سبب ہے۔ حقیقی سبب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گناہوں کی کثرت کی۔ اس کا انکار آپ کس دلیل سے کرتے ہیں

میں اس مقصود کے واضح کرنے کیلئے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اس سے آپ کی سمجھ میں آجائیگا۔ کہ ظاہری سبب اور حقیقی سبب میں کیا فرق ہے۔ مثلاً ایک شخص کو پھانسی ہو گئی اور وہ مر گیا۔ اب دو شخصوں میں گفتگو ہوئی کہ اسکی پھانسی کا سبب کیا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ صرف اسکا سبب یہ ہے۔ کہ وہ کسی طرح سے تختہ کے اوپر پہنچ گیا۔ اور ریشمی پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا۔ پھر کسی طرح سے تختہ اس کے نیچے سے الگ ہو گیا۔ تو اس کا گلا گھٹ گیا اور مر گیا۔ ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اس کی پھانسی کا سبب یہ ہے۔ کہ اس نے ایک جرم کیا تھا۔ اس وجہ سے اس پر حاکم نے ناراض ہو کر پھانسی دلوا دی۔ تو کیا اسپر وہ پہلا شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے۔ کہ تم سائنس کے منکر ہو کہ اسکی موت کا سبب تو اختناق (یعنی گلا گھٹ جانا) ہے۔ اور تم جرم کو اس کا سبب بتلاتے ہو۔ کیا اس جرم نے آکر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ اعتراض کبھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی احمق یہ اعتراض کرے بھی تو تمام مخلوق اسکو پاگل بنائے گی۔ اور یہ کہے گی کہ تیرا یہ کہنا صحیح ہے۔ کہ موت کا سبب اختناق ہے۔ مگر اس کا اصلی سبب تو حاکم کا حکم ہے۔ اور اس حکم کا سبب اس کا جرم ہے۔ غرض اس اختلاف میں ہر عاقل یہی کہیگا۔ کہ وہ شخص سچا حق پر ہے۔ جو یہ کہتا ہے۔ کہ اس سبب طبعی کا سبب خود اس کا فعل ہے۔ ورنہ پھانسی تو پہلے سے بھی موجود تھی۔ پہلے سے وہ کیوں نہ مر گیا۔ اور اب بھی موجود ہے۔ پھر اس سے روزانہ موتیں کیوں نہیں ہوتیں۔ تو صاحبو غضب کی بات ہے کہ اس شخص کو تو محقق سمجھا جاوے اور علماء کو جو کہ طاعون کا سبب آپ کے گناہوں اور افعال کی خرابی کو بتلاتے ہیں۔ غیر محقق کہا جاوے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہ جس کو کوتاہ نظر کہا جاتا ہے۔ اسی کی نظر کو دوسری جگہ عالی نظر کہا جاتا ہے۔ غضب ہے کہ دین ہی کے موقع پر سب لوگ بیہوش ہو جاتے ہیں اس پر مجھے اپنے ایک دوست کی بیان کی ہوئی۔ ایک حکایت یاد آتی ہے۔ کہ اُنھوں نے لاہور کے پاگل خانہ میں ایک مجنوں کو دیکھا کہ وہ سب باتیں ٹھکانے کی کرتا تھا جس سے کسی کو بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پاگل ہے۔ مگر جہاں اس کا نام اسکے سامنے لیا گیا اور اس پر جنوں سوار ہوا۔ یہی حالت آجکل ہمارے بھائیوں کی ہے۔ کہ جبتک اُن کے سامنے دین

نام نہ لو۔ تو عاقل بھی سمجھ دار بھی سب کچھ ہیں۔ مگر جہاں دین کا نام کسی نے لیا۔ اور وہ کوتاہ نظر ہوا۔ صاحبو! آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ جو شخص پھانسی کا سبب ڈکیتی کو بتلاتا ہے۔ اُس کو تو تم عاقل کہتے ہو۔ اور اسی کا نظیر وہ عالم شریعت ہے۔ جو طاعون کا سبب آپ کی بدعملی کو بتاتا ہے۔ یہ شخص عالی نظر کیوں نہیں۔ چونکہ یہ دین کا معاملہ ہے۔ اسلیئے اس میں علماء کو تو کوتاہ نظر سمجھا جاتا ہے۔ اور اس شخص کو عالی نظر سمجھا جاتا ہے۔ جو جراثیم کو طاعون کا سبب بتلاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا ہمنے مانا۔ کہ طاعون کا سبب آب و ہوا کا خراب ہونا ہی سہی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ رداءت آب و ہوا کا کیا سبب ہے۔ اگر اس کا بھی کوئی سبب ہے۔ تو پھر اس کا کیا سبب ہے۔ کیونکہ ہر حادث کی انتہا ایک قدیم پر ضروری ہے تو اس کی انتہا بھی قدیم پر ہوگی اور اگر قدیم پر انتہا نہ مانو۔ تو تسلسل لازم آئیگا۔ کیونکہ ہر حادث علت اور سبب کا محتاج ہوتا ہے۔ اور تسلسل محال ہے۔ تو منتہا ہونا ضروری ہے۔ اور منتہا ہونیکے قابل سوائے مشیت الٰہی کے اور کوئی چیز نہیں۔ تو جس طرح حاکم نے پھانسی کا حکم دیا تھا جس سے مجرم ہلاک ہوا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے کارکنان قضاء و قدر کو حکم دیا کہ آب و ہوا کو خراب کردو اُنہوں نے آب و ہوا خراب کردی جس سے چوہے مرنے لگے۔ اور طاعون پھیل گیا۔ اب جیسا کہ وہاں ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے، جو یہ بتلادے۔ کہ چونکہ اس شخص نے جرم کیا تھا۔ اس وجہ سے حاکم نے پھانسی کا حکم دیا۔ اسی طرح یہاں بھی ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے۔ جو یہ بتلادے کہ گناہونکی وجہ سے یہ بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ تو سنو وہ سچا مخبر قرآن ہے۔ جس میں حق تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفو عن کثیر کہ تمکو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے۔ تمہارے ہاتھوں کی کرتوت سے پہنچتی ہے اور حق تعالیٰ بہت سے گناہوں سے درگذر بھی کرجاتے ہیں۔ پس یہ کیوں نہ کہا جاوے۔ کہ سبب اس طاعون کا ہماری بدعملی۔ اور سیہ کاری ہے۔

(الاسراف ص۲)

(۴) اس شبہ کا جواب کہ مصیبت اگر گناہوں کی وجہ سے آتی ہے تو کفار پر آنی چاہیئے۔ حالانکہ مسلمانوں پر زیادہ مصائب آتے ہیں

مصیبت کا سبب جیسا کہ گناہ ہے۔ اسی طرح رفع درجات بھی اس کا سبب ہے۔ بعض دفعہ امتحان اور آزمائش کیلئے اور درجات بلند کرنے کیلئے بھی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ سنیئے حق تعالےٰ فرماتے ہیں ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم البأساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متٰی نصر اللہ الا ان نصر اللہ قریب ۵ (ترجمہ) کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ جنت میں ویسے ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمکو وہ حالت پیش نہیں آئی جو پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہے۔ کہ ان کو لڑائی اور تکلیف پہنچی اور وہ یہانتک جھڑ جھڑا گئے۔ کہ رسول اور اُن کے ساتھ والے مسلمان کہنے لگے۔ کہ دیکھیئے اللہ کی مدد کب آتی ہے۔ سُن لو اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا جاء ھم نصرنا فنجی من نشاء ولا یرد بأسنا عن القوم المجرمین (ترجمہ) یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہوگئے اور کفار نے گمان کیا کہ اُن سے جھوٹ بولا گیا۔ اُس وقت ہماری مدد آئی۔ سو جسکو ہمنے چاہا اُن کو نجات دی گئی (اور باقی لوگ ہلاک کیئے گئے) اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ٹل نہیں سکتا۔ ان آیتوں سے حاصل مشترک اتنا ثابت ہوا کہ پہلے زمانہ میں حضرات مقبولین پر اور اُن سے بڑھ کر رسولوں کا طبقہ ہے جن میں معصیت کا احتمال ہی نہیں۔ ان پر ایسے ایسے مصائب آئے کہ رسول گھبرا کر کہنے لگے۔ متی نصر اللہ کہ خدا کی امداد کب آئیگی حتی اذا استیئس الرسل ای من ایمان قومھم یہاں تک کہ رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی یہ حالت نہ تھی کہ ایک وعظ کہکر جو دیکھا کہ لوگ جنید بغدادی نہیں ہوئے تو ان کی اصلاح سے ناامید ہو جائیں بلکہ حالت یہ تھی کہ ایک مدت مدید تک وعظ کہکر بھی ناامید نہ ہوسے تیے۔ نوح علیہ السلام نے

ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو نصیحت کی۔ اور نا اُمید نہوے۔ جب اتنی مدت میں
بھی ان پر کچھ اثر نہوا۔ تب اُنکے ایمان سے مایوس ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا
ہے کہ انبیاء علیہم السلام کتنی مدت دراز تک اپنی قوم سے مایوس نہوتے تھے۔ تو اتنی طویل
مدت کے بعد نصرت خداوندی نازل ہوتی تھی۔ اور اس وقت تک انبیاء اور مؤمنین مصیبتیں
ہی جھیلتے تھے۔ وظنوا انہم قد کذبوا کی تفسیر میں بہت اقوال ہیں۔ اور بعضے سخت
اور مشکل ہیں۔ مگر سہل یہ ہے۔ کہ ظنوا کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ کفار
نے یہ کہا کہ ہم مکذوب ہیں۔ یعنی رسولوں نے جو ہم کو عذاب کی دھمکی دی ہے۔ وہ جھوٹ
بات ہے۔ اگر سچی ہوتی تو اس مدت دراز میں عذاب کے کچھ تو آثار معلوم ہوتے غرض
ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور پہلے مقبولین ایک مدت تک
مستہم الباساء والضراء کی حالت میں اور ایسی بڑی بڑی مصیبتوں میں رہے۔ کہ ایسی
مصیبتیں ہم لوگونکو کبھی پیش بھی نہیں آئیں۔ مگر آج ترکوں کی ذراسی حالت میں لوگوں کو خدا
تعالیٰ سے بدگمانی ہونے لگی۔ یاد رکھو خدا تعالیٰ پر کبھی کسی کو بدگمانی کا حق نہیں۔ ان کی
حکمتوں کے راز کسی کو کیا معلوم۔ آپ اپنے خانگی معاملات کے راز اپنے نوکروں کو نہیں
بتلاتے۔ حالانکہ آپ میں اور ان میں بہت تقارب ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی اپنا بھید آپ
نوکرونکو نہیں تبلاتے۔ تو خدا کیوں آپ کو اپنے معاملات کے راز بتلاویں۔ آپ میں اور
خدا میں تو کچھ بھی مناسبت نہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اسی کو حافظ فرماتے ہیں ؎

حدیث مطرب ومی گو و راز دہر کمتر جو	کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا

بہر حال حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں جن کی وجہ سے مقبولین پر بھی وہ مصائب نازل
کرتے ہیں ؎

جہان صدیقان ازیں حسرت بر بخت	کاسمان بر فرق ایشان خاک بیخت
زاں بلاہا کانبیاء برداشتند	سر بچرخ ہفتمیں افراشتند

ف

ف جس زمانہ میں یہ وعظ ہوا تھا۔ اُس زمانہ میں ترکی جنگ کفار سے جاری تھی۔ بعض دفعہ بہت
متوحش خبریں آتی تھیں کہ ترک مغلوب ہوگئے۔ علی محمد۔

یہ گویا رفع درجات ہے۔ ان بلاؤں سے مقبولین کے درجے بلند ہوتے ہیں۔ نیز اس میں مجاہدہ اضطراریہ بھی ہے۔ کہ مصائب سے اخلاق درست ہو جاتے ہیں نفس کی اصلاح بہت کچھ ہو جاتی ہے۔ جب ہم لوگوں کو اپنے نفس کی اصلاح اور درستی اخلاق کی خود فکر نہیں ہوتی تو حق تعالیٰ مجاہدہ اضطراریہ سے ہماری اصلاح فرماتے ہیں۔ آپ ان شکستوں کی خبروں سے یہ سمجھتے ہیں کہ ترک مغلوب ہو گئے۔ مگر آپ کو کیا معلوم ہے کہ اس سے جوان کے نفس کی اصلاح ہوئی ہو گی وہ کتنی فتوحات کا پیش خیمہ ہو گی۔ یہی حال طاعون میں سمجھنا چاہیئے۔ کہ مسلمانوں میں طاعون کا زیادہ پھیلنا۔ اس کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کہ معاذ اللہ مسلمان خدا تعالیٰ کے نزدیک ان کافروں سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ کبھی مسلمانوں کے درجے بلند کرنے اور ان کو شہادت کے مرتبے دینے منظور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں طاعون زیادہ پھیلتا ہے۔ حدیث میں صاف تصریح ہے۔ کہ الطاعون شھید۔ یعنی طاعون میں مرنے والا شہید ہے۔ اسی لئے جو لوگ اس راز کو سمجھتے ہیں۔ وہ ہر بلا سے خوش ہوتے ہیں۔ نہ وہ شکست و ہزیمت سے گھبراتے ہیں۔ نہ طاعون سے پریشان ہوتے ہیں اور یوں کہتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من	دل فدائے یار دل رنجانِ من

اور دوسروں کو بھی اسی کی وصیت کرتے ہیں کہ محبوب حقیقی سے راحت میں اور رنج میں غرض ہر حال میں خوش رہنا چاہیئے ؎

بس زبون وسوسہ باشی دلا	گر طرب را باز دانی از بلا

یعنی دونوں حالتوں میں کچھ فرق نہ ہونا چاہیئے۔ یہ سمجھ کر کہ ہر حالت محبوب ہی کی طرف سے ہے۔ دونوں پر راضی رہنا چاہیئے۔ تو خواہ کلفت ظاہری ہو یا باطنی وہ ہر ایک پر راضی رہتے ہیں۔ اور باطنی کلفت پر راضی رہنا۔ یہ بہت بڑا صبر ہے کیونکہ ظاہری کلفت میں صرف جسم کو تکلیف ہوتی ہے۔ روح کو بشاشت رہتی ہے۔ اور باطنی کلفت میں یہ وہم ہو جاتا ہے کہ میں مردود ہو گیا۔ جیسا کہ حالت قبض میں ایسا ہوتا ہے۔ اور یہ خیال سالک کیلئے سخت سوہان روح ہے۔ مگر وہ اس پر بھی راضی

رہتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش	بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال	مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

آگے اسی کی تتمیم کیلئے کہتے ہیں ؎

تکیہ بر تقوی و دانش در طریقت کافریست	راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

یہ اسی لئے کہا ہے کہ کبھی ذاکر کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ میں اتنا کام کرتا ہوں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں۔ پھر یہ پریشانی کیوں ہے۔ تو کہتے ہیں ع۔

راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش۔ (الاسراف ص۱۱۱،۱۴۸)

خلاصہ یہ کہ مقبولین پر بھی کلفتیں آتی ہیں۔ ظاہر پرستوں کو اس سے شبہ ہو جاتا ہے کہ اگر گناہوں کی وجہ سے مصیبتیں آتی ہیں۔ تو انہوں نے کیا گناہ کیا تھا۔ بلکہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ کہ نیک بندے اور مقبولین کو فقر و فاقہ وغیرہ کی تکلیف زیادہ رہتی ہے اور رند۔ بازاری لوگ ہر طرح عیش اور مزے میں زندگی گذارتے ہیں۔ یعنی ظاہری عیش ان کو زیادہ ہوتا ہے۔ کھانے پینے میں تنگی نہیں ہوتی۔ مگر یہ شبہ بالکل لغو ہے۔ کیونکہ دنیا میں عادۃ اللہ یہ ہے کہ سب نعمتیں ایک شخص کو نہیں دی جاتیں۔ کسی کو ظاہری عیش نصیب ہوتا ہے۔ کسی کو باطنی عیش عطا فرماتے ہیں۔ ایسے بندے بہت کم ہیں جن کو دونوں عیش نصیب ہوں۔ اسی کو ایک محقق کہتے ہیں

کم عاقل عاقل اعیت مذاہبہ	وجاہل جاہل تلقاہ مرزوقا
ھذا الذی ترک الاوہام حائرۃ	وصیر العالم النحریر زندیقا

یعنی دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض عاقل کامل تنگی میں ہیں۔ کہ انکو کوئی ذریعہ معاش کا میسر نہیں۔ اور جاہل کامل صاحب نصیب اور وسعت رزق سے مالا مال ہے۔ اس بات نے عقلوں کو حیران کر دیا۔ اور بعضے متبحر عالم اس سے زندیق ہو گئے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ سو یہ مسئلہ ایسا باریک ہے کہ اس سے ہزاروں عالم بددین ہو گئے مگر جس کو خدا بچائے وہ بچ سکتا ہے۔ اس بچنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ کہ ایک

درویش تھے۔ وہ چلے جارہے تھے۔ ایک شہر میں پہنچے تو وہاں پھاٹک بند دیکھا۔ پوچھا
بھائی پھاٹک کیوں بند ہے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کا باز چھوٹ گیا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے۔ کہ
شہر پناہ کے دروازے بند کردیے جاویں۔ تاکہ باز باہر نہ چلا جاوے۔ درویش کو
بادشاہ کی حماقت پر بہت تعجب ہوا۔ یہ ناز میں آکر کہنے لگے۔ کہ واہ اللہ میاں اچھے
کو بادشاہی دے رکھی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پاؤں میں جوتیاں تک سالم نہیں۔ بعض
اہل اللہ پر ناز کی شان غالب ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوا۔ کیا تم اس پر راضی
ہو کہ اس کی سلطنت معہ اس کی حماقت کے تم کو دیدیں۔ اور تمہاری صلاحیت اور
عقل معہ تمہارے فقر و فاقہ کے اس کو دیدیں۔ درویش ڈر گیا اور کانپ گیا۔ کہ کہیں
ساری عمر کی کمائی سلب نہ ہو جاوے۔ کہنے لگا کہ اے اللہ میں اس پر راضی نہیں ہوں
میں اپنی حماقت سے توبہ کرتا ہوں۔ سو واقعی عقل وہ دولت ہے۔ جس کے سامنے ہفت
اقلیم کی سلطنت گرد ہے۔ اگر ایک عاقل تنگ دست ہو اور ایک بیوقوف مالدار ہو
تو عاقل کو غور کرنا چاہیئے کہ میرے پاس عقل کی کتنی بڑی دولت ہے (ایضاً ص ۱۱۵،۱۱۶)
الغرض ان درویش کو یہ کہا گیا تھا۔ کہ کیا تم راضی ہو کہ تمہارا فقر و فاقہ اور صلاحیت
اور علم بادشاہ کو دیدیا جاوے۔ اور اسکی سلطنت اور حماقت تم کو دیدی جاوے۔
اسی طرح جو لوگ کفار کی ثروت اور عیش کو دیکھ کر اور اپنی مصیبت و تکلیف پر نظر کر کے
للچاتے اور خدا تعالےٰ کی شکایتیں کرتے ہیں۔ ان کو سمجھنا چاہیئے۔ کہ اگر حق تعالےٰ
کفار کا کفر اور ثروت و عیش ان کو دیدیں اور ان کا فقر و فاقہ اور ایمان ان کو دیدیں
تو کیا یہ اس پر راضی ہوں گے۔ اگر اس پر راضی نہیں ہو سکتے۔ اور یقیناً کوئی مسلمان
اس پر راضی نہوگا۔ تو ان کو خدا تعالیٰ کی شکایت کرتے ہوئے ڈرنا چاہیئے۔ اور اپنے
ایمان کی دولت پر خدا کا شکر کرنا چاہیئے۔ علامہ غزالی لکھتے ہیں کہ جس عالم کو یہ تمنا ہوتی
ہے۔ کہ مجھے مال کیوں نہیں ملا۔ تو گویا وہ یہ کہتا ہے۔ کہ بادشاہ نے مجھے گھوڑا تو دیدیا
گدھا کیوں نہیں دیا۔ گدھا بھی مجھے دو۔ تو اس کا یہ کہنا غلط ہے۔ بلکہ جب تمکو
گھوڑا مل گیا۔ تو گدھا کسی دوسرے کو دیدیا جاویگا۔ اسی طرح یہ استدلال ہے کہ ہمیں

علم ملا - تدبیر ملی - تو ہمیں مال بھی ملنا چاہیئے - سواس کو جاننا چاہیئے کہ یہ اسکی غلطی ہے جب تم کو علم دیا گیا ہے - تو مال کسی دوسرے کو ملیگا - پس جو لوگ اس راز کو سمجھ گئے وہ ایسی تمنا سے بچ گئے ورنہ زندیق ہونے میں کوئی تعجب ہی نہیں - غرض یہ شبہ اس لئے واقع ہوا تھا - کہ آپنے یہ سمجھ لیا تھا کہ مصیبت ہمیشہ گناہ ہی سے آتی ہے حالانکہ کبھی رفع درجات کیلئے بھی بلائیں آتی ہیں - ممکن ہے کہ اس کو - کوئی تاویل سمجھے - تو بات یہ ہے - کہ محبت میں سب باتیں ظاہر ہیں - ورنہ کچھ بھی نہیں - اگر خدا تعالیٰ سے تعلق اور لگاؤ ہو تو ہر مسئلہ میں انسان کی تسلی ہو سکتی ہے - طبیعت خود بخود تسلی کی راہ نکال لیتی ہے - اور اگر تعلق نہ ہو - تو سچی بات بھی تاویل معلوم ہوتی ہے - اگر اس تقریر سے کسی کی تسلی نہ ہوئی ہو - تو وہ یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ حکیم ہیں - اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں اور حکمت کا مقتضا یہ ہے - کہ اس عالم میں ہر چیز کسی سبب اور علت کے ساتھ وابستہ ہے - پس لامحالہ مصائب اور تکالیف کا بھی کوئی سبب ہونا چاہیئے - مگر کبھی تو ایسا ہوتا ہے - کہ ایک مسبب کیلئے ایک ہی سبب ہوتا ہے - اور کبھی ایک مسبب کیلئے کئی سبب ہوتے ہیں - جیسے چلنا کہ اس کے کئی سبب ہوتے ہیں کبھی نماز کے لئے چلتے ہیں - کبھی قضاحاجت کیلئے - کبھی کسی پر ظلم کرنے کیلئے - اور جیسے غصہ کہ کبھی دشمن پر آتا ہے - جس کا سبب عداوت ہے - اور کبھی کسی وجہ سے دوست پر بھی آتا ہے - غرض ایک مسبب کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں - اب بعض دفعہ ان اسباب میں سے ایک سبب ظاہر ہوتا ہے اور بقیہ اسباب راخفی ہوتے ہیں - تو کوتاہ نظر آدمی اسی ظاہری سبب کو سبب سمجھ لیتا ہے - اور باطنی اسباب پر اسکی نظر نہیں ہوتی تو اس لئے وہاں ضرورت ہوتی ہے جمیع اسباب کے احاطے کی - لیجئے میں اس کی ایک اور مثال بیان کرتا ہوں - کہ مسبب واحد کیلئے کئی اسباب بھی ہوتے ہیں - مثلاً آپ کو ایک شخص نے بڑے زور سے دبایا - اور ایسا دبایا کہ آپکی ہڈی پسلی ٹوٹنے لگی - تو دیکھئے دبانیکے اسباب جُدا جُدا ہیں - ایک تو یہ کہ راستہ میں آپ کا کوئی دشمن ملا - اُس نے آپ کو کوئی تکلیف پہنچانے کیلئے دبایا - ایک تو یہ صورت ہے - کہ آپ کو کوئی ایسا شخص ملا جس کے

دیکھنے کو آپ ترستے تھے۔ اور یہ اُمید بھی نہ تھی کہ آپ کو وہ ہاتھ بھی لگائیگا۔ دفعۃً وہ شخص بیخبری میں آپ کو آکر دبالے۔ اور بہت زور سے دبوچے۔ ممکن ہے کہ جبتک آپ کو یہ علم نہیں کہ دبانے والا کون ہے۔ اُس وقت تک آپکو تکلیف اور پریشانی رہے۔ مگر جب یہ معلوم ہو جائے کہ دبانے والا کون ہے۔ اُس وقت آپ کیا کہیں گے۔ یقیناً یہی کہیں گے ؎

اسیرت نخواہد رہائی زبند	شکارت نجوید خلاص از کمند

اگر وہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی جان پر ترس کھا کر خود چھوڑنا بھی چاہے۔ کہ مبادا کہیں آپ مر نہ جائیں۔ تو آپ یہ کہیں گے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت	سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہ کہیں گے ؎

نکلجائے دم تیرے قدموں کے نیچے	یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہی

تو دیکھیے مسبب واحد ہے اور سبب مختلف۔ مگر ہر ایک کا اثر جدا ہے۔ جو دباؤ عداوت کی وجہ سے پڑا اس کا دوسرا اثر ہے۔ اور جو محبت کی وجہ سے ہی اس کا دوسرا اثر ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ایک سبب کیلئے مختلف اسباب بھی ہوا کرتے ہیں۔ تو اب سُنئے کہ آپ نے ابتک صرف ایک سبب کو سنا ہے۔ مآ اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم کہ جو مصیبت آتی ہے وہ انسان کی بداعمالی کی وجہ سے آتی ہے۔ دوسرا سبب بھی تو سُنئے۔ حدیث میں ہے۔ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل کہ سب سے زیادہ سخت بلاء انبیاء علیہم السلام پر آتی ہے۔ پھر ان لوگوں پر جو اُن کے بعد دوسروں سے افضل ہوں۔ وعلیٰ ہذا معلوم ہوا کہ کلفت کا سبب فقط ایک ہی نہیں۔ کیونکہ انبیاء علیہ السلام یقیناً گناہوں سے معصوم ہیں۔ تو ان پر گناہوں کی وجہ سے کلفت و رنج کا آنا ممکن نہیں۔ لامحالہ یہی کہنا پڑیگا کہ کبھی رفع درجات کیلئے بھی کلفت پیش آتی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت سے تو معلوم ہوتا ہی کہ مصیبت گناہ ہی کی وجہ سے آتی ہے۔ کیونکہ مآ اصابکم من

مصیبۃ سے عموم مستفاد ہوتا ہے۔ اور فیما کسبت ایدیکم سے ظاہراً حصر معلوم
ہوتا ہے۔ اب اس آیت کو اس حدیث سے تعارض ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
بلا رفع درجات کے لئے بھی آتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حدیث و قرآن میں تعارض کے
وقت قرآن ہی کو ترجیح ہوگی۔ پس یہی ثابت ہوا کہ گناہ ہی کی وجہ سے مصیبت آتی
ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اور اس شبہ تعارض کا جواب خود اس آیت میں
موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ما اصابکم من مصیبۃ۔ کہ جو کچھ تم کو مصیبت پہنچی ہے
وہ تمہارے کرتوت سے آتی ہے۔ تو یہاں مصیبت کا لفظ ہے۔ اور حدیث میں مصیبت
کا لفظ نہیں ہے۔ وہاں بلاء کا لفظ ہے۔ پس آیت کا حصر بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ
مصیبت مذنبین ہی کو آتی ہے۔ اور اہلِ مصیبت گنہگار ہی لوگ ہیں۔ ان پر جب مصیبت
آتی ہے۔ گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ اور مقبولین اہل مصیبت نہیں ہیں وہ اہلِ
بلاء ہیں۔ ان پر جب بلا آتی ہے۔ رفع درجات اور ازدیاد محبت کیلئے آتی ہے۔
اور مصیبت اور بلاء میں صورۃً فرق کم ہوتا ہے۔ ظاہر میں دونوں ایک ہی معلوم ہوتی
ہیں۔ مگر آثار میں دونوں کے بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں
کی حقیقت ہی الگ الگ ہے۔ پس مصیبت کی حقیقت ہے سزا اور انتقام اور
بلاء کی حقیقت ہے محبوبانہ چھیڑ چھاڑ اور امتحان۔ محبوب کے دبانے اور بھینچنے کو مصیبت
کوئی نہیں کہا کرتا۔ پس انبیاء اور مقبولین پر بلاء آیا کرتی ہے۔ مصیبت نہیں آیا کرتی
اور بلاء کے معنی لغت عربی میں آزمایش اور امتحان کے ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں کہ مجھے دو شخصوں کے برابر بخار آتا ہے آخر اسکی کیا وجہ کیا نعوذ باللہ حضور سے
گناہ صادر ہوتے تھے۔ ہرگز نہیں۔ آپ گناہوں سے بالکل معصوم تھے۔ اور اگر
کوئی لغزش اپنے درجہ کے مناسب ہو بھی گئی۔ تو پہلے ہی سے اگلی پچھلی سب خطائیں
معاف ہو جانیکی خوشخبری آچکی تھی۔ اس لئے آپ میں تو یہ احتمال کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا
پس وجہ وہی ہے کہ بیماری میں ذرا انسان پر عجز و انکسار اور آہ کرنا۔ کراہنا غالب ہوتا
ہے اور یہ ادا حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ اس ادا کے دیکھنے کے لئے مقبولین پر بلا بھیجتے ہیں

اور کبھی صبر کا امتحان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تو جب یہ بات ہے کہ کلفت کے اسباب مختلف ہیں۔ تو لازمی طور پر آثار بھی مختلف ہونگے۔ اہل مصیبت یعنی اہل معصیت ذرا سی تکلیف سے بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگ طاعون سے بھاگتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص طاعون کی جگہ سے آیا ہو۔ اُس سے بھی بھاگتے ہیں۔ کہ یہ طاعون کی جگہ سے آیا ہے۔ شاید اس کو طاعون لپٹ رہا ہو۔ اور اسکے پاس جانے سے ہمارے اوپر بھی اثر ہو جاوے۔ بھلا اس وہم کا بھی کچھ ٹھکانا ہے۔ بات یہ ہے کہ معاصی کا یہ خاصہ ہے کہ اس سے دل کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لئے اہل معصیت کا دل بہت کمزور ہوتا ہے۔ ایک شخص طاعون سے بھاگ کر ایک گاؤں میں۔ ایک شخص کے مکان پر ٹھیرا اور نتھا نمازی مسجد میں نماز کیلئے جاتا۔ تو اس مسجد میں بعض پُرانے نمازیوں نے نماز کیلئے آنا چھوڑ دیا۔ اس شخص کی کتنی بڑی ذلت ہے۔ تو بات یہ ہے کہ طاعون سے بھاگنے والے کی کسی جگہ جا کر عزت نہیں ہوتی۔ جس میں راز یہ ہے کہ یہ شخص خدا تعالیٰ سے بھاگتا ہے۔ اس پر مجھے یہ شعر یاد آیا کرتا ہے ؎

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت	بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اور جو لوگ کہ اپنے گھر میں پڑے رہتے ہیں اُن کی آخرت میں تو عزت ہوتی ہی ہے کہ طاعون کی جگہ ایمان اور ثواب کی نیت سے جمع رہنے پر شہادت کا ثواب ملتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ مگر اسکے علاوہ ان لوگوں کی دنیا میں بھی عزت ہوتی ہے کہ لوگ ان کو قوی القلب اور مستقل مزاج سمجھتے ہیں۔ بہر حال اہلِ ذنوب کو پریشانی ہوتی ہے۔ اور جہاں کلفت کا سبب رفع درجات ہوتا ہے۔ وہاں آثار بھی دوسرے ہوتے ہیں۔ کہ نہ وہ پریشان ہوتے ہیں نہ گھبراتے ہیں۔ چاہے اُن کے جسم میں تکلیف ہو۔ مگر روح خوش رہتی ہے۔ روح کیلئے ایک عید ہوتی ہے کیونکہ از محبت تلخہا شیریں شود اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ وہ اس مسرت کو بیساختہ ظاہر کر دیتے ہیں۔ ورنہ روح کو تکلیف ہونیکی حالت میں مسرت کب ظاہر ہوتی ہے۔ پھر سب سے بڑی مصیبت جس کو ام المصائب کہنا چاہیے موت ہے۔ کہ اس پر کوئی راضی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر کسی سے یہ کہا جاوے

کہ تمہارے لئے دو صورتیں ہیں۔ یا تو اسی وقت مر جاؤ یا ایک برس تک بیمار رہو۔ ان دونوں میں سے جس کو چاہو اختیار کر لو۔ تو غالباً ہر شخص اتنی مدت مدید تک مریض رہنے پر راضی ہو جائیگا۔ مگر موت پر ہرگز راضی نہو گا۔ مگر اہل اللہ کی یہ حالت ہے۔ کہ وہ خود موت کے بھی مشتاق رہتے ہیں۔ وہ حضرات یوں کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم	راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بردم
نذر کردم گر آید بسر ایں غم روزے	تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بردم

وہ تو موت کے وقت کیلئے نذریں مانتے ہیں۔ اس پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ حجرہ میں بیٹھ کر ایسا کہدیا ہو گا۔ مگر جب نزع کا وقت آیا ہو گا۔ اُس وقت ساری حقیقت معلوم ہو گئی ہو گی۔ اُس وقت یہ سب باتیں بھول گئے ہونگے۔ تو حضرت یہ بات نہیں واقعات سے ان حضرات کی حالت سچی معلوم ہوتی ہے۔ اور یقیناً وہ موت کیوقت بھی ایسے ہی خوش تھے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کی تعلیم کرتے آئے ہیں۔ کہ زندگی ایسی اختیار کرو کہ مرنیکے وقت سب لوگ تمہاری فرقت میں رو رہے ہوں اور تم وصال خداوندی کے سرور میں ہنس رہے ہو۔ چنانچہ ایک قطعہ اس مضمون کا مجھے یاد آیا۔ فرماتے ہیں ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو	ہمہ خنداں بدند تو گریاں

یعنی پیدائش کے وقت تم روتے ہوئے آئے تھے۔ اور اعزہ و اقارب ہنس رہے تھے۔ خوشیاں منا رہے تھے ؎

آنچناں زی کہ وقت مردن تو	ہمہ گریاں شوند تو خنداں

زندگی ایسی اختیار کرو کہ مرنیکے وقت اور تو سب روئیں اور تم ہنستے ہو جاؤ چنانچہ ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ بعض اہل اللہ مرنے کے وقت بالکل شاد و خرم نظر آتے ہیں۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ اُن کے نزع کے وقت سب تو رو رہے تھے۔ اور اُن کی یہ حالت تھی کہ وہ بیساختہ یہ اشعار پڑھ رہے تھے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم	جسم بگذارم سراسر جاں شوم

اب وہ وقت آگیا کہ میں قید جسم سے آزاد ہوجاؤنگا۔ بدن کو چھوڑ کر سر تا پا روح بنکر وصال حق سے سرفراز ہوں گا۔ تو صاحبو! نزع کے وقت یہ مستی بناوٹ سے نہیں ہو سکتی اور اگر ہو سکتی ہے تو کوئی کر کے دکھلاوے اور فرماتے تھے ؎

چیست توحید آنکہ از غیر خدا	فرد آئی در خلا و در بلا

یہ تو آپنے موت کیوقت کا حال سُنا اور اس سے بھی زیادہ سخت وقت موت کے بعد کا ہے کہ وہی وقت ہے مصیبت کا جو کچھ ثواب و عذاب ہوگا موت کے بعد ہی تو ہوگا۔ مگر اہل اللہ کی حالت اُس وقت بھی عجیب ہوتی ہے۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وہ اور بھی زیادہ خوش رہتے ہیں۔ حضرت سلطان الاولیا کی حکایت ہے کہ جب اُنکا جنازہ چلا تو اُن کے ایک مُرید پر حالت طاری تھی۔ کیونکہ شیخ کے انتقال کا صدمہ مُریدوں سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ غرض جنازہ جارہا تھا کہ اس مُرید نے جنازہ کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا ؎

سرو سیمینا بصحرا مے روی اے تماشاگاہ عالم روئے تو	سخت بے مہر کہ بے ما میروی تو کجا بہر تماشا می روی

تاریخ میں لکھا ہے کہ کفن میں سے آپکا ہاتھ اونچا ہو گیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو چپ رہو۔ اور اس واقعہ سے کچھ تعجب کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مرنیکے بعد انسان کو دوسری حیات عطا ہوتی ہے۔ جس کیوجہ سے وہ سب کچھ احساس کر سکتا ہے۔ اور یہ حیات اولیا میں عوام سے زیادہ ہوتی ہے۔ تو کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ کہ اس حیات کا اثر بطور کرامت کے جسم پر بھی ظاہر ہو جاوے۔ مگر یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ غرض خدا نے ظاہر کر دیا۔ کہ اب یہ لوگ اسقدر مطمئن ہیں۔ کہ ان کو مرنیکے بعد بھی وجد آتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ تو صاحبو! ان حضرات کو مصیبت کہاں ہوئی۔ جن باتوں کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں۔ ان میں تو ان کو لذت آتی ہے (الرضا صفحہ ۱۷ تا ۲۳)

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں آجکل افلاس ہے۔ اس لئے اُن کی حالت

خراب ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ صاحبو! افلاس کا ڈر نہیں۔ اصل میں اس خرابی کا سبب بد دینی ہی ہے۔ آپ یورپ کو دولتمند سمجھتے ہیں۔ مگر کیا ان میں سب ہی دولتمند ہیں۔ ہرگز نہیں ان میں بھی گنتی ہی کے آدمی سردی سے مرجاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی قوم کی حالت اچھی ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ ان میں ہر شخص دولتمند ہو۔ بلکہ حالت درست ہوتی ہے افعال حسنہ اور اخلاق حمیدہ سے۔ جس قوم میں یہ باتیں ہونگی۔ اس کی حالت درست ہوگی۔ چاہے وہ کیسی ہی مفلس قوم ہو۔ شاید آپ یہ کہیں کہ اہلِ یورپ تو کافر ہیں۔ وہ تو دیندار نہیں ہیں۔ پھر ان کی حالت ترقی پر کیوں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ چونکہ وہ کافر ہیں۔ خدا کے دشمن ہیں۔ اسلیئے اگر وہ تھوڑے سے کام بھی اچھے کرینگے۔ تو ان کی حالت دنیوی درست ہو جائیگی۔ ان میں اتفاق اور اتحاد اور قومی ہمدردی بہت زیادہ ہے۔ دوسرے ان میں ہر کام کا ایک انتظام اور قاعدہ ہے۔ اور یہ باتیں فی نفسہ اصلاح حال میں موثر ہیں۔ جو اصل میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیئیں تھیں۔ کیونکہ ان کو مذہبًا اس کی بہت تاکید کے ساتھ تعلیم کی گئی ہے۔ مگر مسلمانوں نے ان باتوں کو چھوڑ دیا۔ دوسری قوموں نے اُن سے فائدہ اُٹھایا۔ مگر یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کی حالت صرف اتفاق و اتحاد سے درست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان کو پوری طرح احکام اسلام کی پابندی اور وقعت کرنا لازم ہے کیونکہ یہ حق تعالیٰ کے خاص بندے ہیں۔ اگر یہ تھوڑی سی بھی نافرمانی کرینگے۔ تو ان پر غصہ زیادہ ہوگا تو صاحبو! اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو۔ تو دینداری اختیار کرو۔ ابھی تک مسلمانوں میں اتنی فلاکت کسی میں نہیں ہوئی۔ کہ تباہ ہو جاوے۔ اور اگر ان میں اتفاق ہو۔ تو ایک کی امارت سے دس آدمی کھا سکتے ہیں۔ مگر آج ہمدردی تو کیا ہوتی۔ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ غریبی کو جرم قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ غریبی اور امیری کسی کے اختیار میں نہیں آج ایک شخص امیر ہے۔ کل کو غریب ہو جاتا ہے۔ آج ایک آدمی غریب ہے۔ چند روز میں حق تعالیٰ اس کو غنی کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا ہے۔ کہ وہ چھ پیسے روز کی کنڈے اُٹھانے کی مزدوری کماتے تھے۔ پھر وہ لاکھوں روپے

کے آدمی ہو گئے۔ اب بھلا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ تدبیر سے اس درجہ کو پہنچ گئے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ محض مشیت الٰہی کی وجہ سے ہوا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ تدبیر پر مرتے ہیں۔ وہ ایک آدمی کو بجائے چھ پیسے روز کے تین آنے روز دیں اور وہ تمام تدبیریں بتلا دیں۔ جن سے بظاہر پہلے شخص کو ترقی ہوئی پھر ہم دیکھیں کہ دوسرا شخص ان تدبیروں سے کتنی ترقی کرتا ہے۔ اگر اس طرح ترقی ہوا کرتی۔ تو ہر شخص دوسرے کی تدبیروں کو دیکھ کر امیر ہو جایا کرتا۔ مگر درحقیقت فراخی اور تنگی کا مدار ان اسباب پر نہیں ہے مشیت الٰہی پر ہے۔ دوسرے کسی قوم میں افلاس اتنا عام نہیں ہوتا۔ کہ کبھی مفلس ہوں۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر قوم میں کچھ غنی ہوتے ہیں۔ کچھ مفلس ہوتے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں ہی کی حالت خراب ہے۔ سو بات یہ ہے کہ ان میں افعال حسنہ اور اخلاق حمیدہ کی کمی ہے پس اصل شکایت ان کی بددینی ہے (ایضاً صفحہ ۲۴ تا ۲۵)

تو ان حضرات پر اگر مصیبت آوے گی۔ تو یہ کوئی مصیبت ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہاں مصیبت کی صورت ہے۔ حقیقت میں وہ ہرگز مصیبت نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اگر کوئی شخص مٹھائی کا کریلا بنا دے۔ اور اُس کے متعلق دو شخصوں میں اختلاف ہو ایک تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ کریلا ہے۔ اور دوسرا سمجھتا ہے کہ یہ مٹھائی ہے۔ اب دوسرے نے اس کو توڑ کر کھانا شروع کیا۔ تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ یہ کریلا کھا رہا ہے۔ ہرگز نہیں درحقیقت وہ مٹھائی کھا رہا ہے۔ ہاں صورت کریلہ کی ہے جس سے نادان کو شبہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ کڑوا ہو گیا ہو گا۔ مگر اس کھانے والے سے کوئی اُس کے مزے کو پوچھے۔ پس یہی مثال اہل اللہ کی مصیبت اور عوام کی مصیبت کی ہے اہل اللہ پر جو مصیبت آتی ہے وہ کریلے کی صورت میں مٹھائی ہے جس سے اُن کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور عوام کی مصیبت حقیقت میں کریلا ہے جس سے اُن کو تلخی اور پریشانی حاصل ہوتی ہے۔ میں نے اس مثال میں ایک باریک مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا۔ آپ رات دن دیکھتے ہیں کہ مٹھائی کے کھلونے اور مختلف

پھل بنائے جاتے ہیں۔ مگر وہ محض صورت ہی صورت ہوتی ہے۔ حقیقت میں وہ خالص شکر ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ محمود آباد میں ایک باورچی نے مٹھائی کا انار بنایا تھا۔ جو ڈیڑھ سو روپے میں تیار ہوا تھا جس کے اندر زرد جھلی اور دانوں میں سُرخ شربت تک تھا۔ اور یہ تو میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ کہ ایک دعوت میں باورچیوں نے مٹھائی کا پان بنایا تھا۔ تو کسی شخص نے اگر ایسا ہی کریلا بنایا ہو۔ اور ایک شخص اسکو کھانے لگے۔ اور دوسرا اس پر رحم کرنے لگے۔ تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں۔ یقیناً حماقت ہے۔ تو جس طرح کریلے کی دو قسمیں ہیں۔ اسی طرح مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک صورۃً ایک حقیقۃً۔ اور نعمت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک صورۃً اور ایک حقیقۃً۔ کفار کو جو دولت دنیوی اور عیش و آرام دیا گیا ہے۔ یہ ظاہری نعمت ہے۔ حقیقت میں یہ سب وبال جان ہے۔ اور مسلمانوں کو جو مصیبت پیش آتی ہے۔ وہ ظاہری مصیبت ہے۔ حقیقت میں وہ بڑی نعمت ہے۔ صاحبو! اس کو وہ سمجھے گا۔ جو اس مزہ کو پہلے چکھ چکا ہو۔ اور جس نے باطنی دولت کا مزہ نہیں چکھا وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا ہے

پرسید یکے کہ عاشقی چیست	گفتم کہ چو ما شوی بدانی

کیا آپ نے ختنہ کے وقت یا فصد کراتے وقت بچوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سو بچہ کے دل سے پوچھئے وہ اسکو کیا سمجھتا ہے۔ وہ تو اس کو سخت مصیبت کہیگا۔ مگر آپ کے نزدیک وہ مصیبت نہیں۔ راحت ہے

طفل مے لرزد زنیش احتجام	مادر مشفق ازاں غم شاد کام

کیا آپ نے کبھی اپنے یا اپنے کسی عزیز کے نشتر نہیں دلوایا اور کیا پھر نشتر دینے والے کو انعام نہیں دیا۔ ضرور دیا ہے۔ تو کیا نشتر دینے کے وقت کی تکلیف دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے انعام کا کام نہیں کیا۔ ہر گز نہیں۔ آپ کا دل جانتا ہے کہ اُس نے بڑا احسان کیا۔ اور بہت راحت پہنچائی کہ آیندہ کی تکلیف سے نجات دیدی اگر نشتر دینے کے وقت آپ کے آنسو بھی نکلے ہوں گے۔

تب بھی دل اندر سے راضی ہو گا۔ معلوم ہوا کہ بعض مصائب ایسے بھی ہیں جو صورت میں مصیبت ہیں۔ اور حقیقت میں راحت معلوم ہوتے ہیں۔ پس اہل اللہ کے مصائب کو بھی ایسا ہی سمجھئے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان تکالیف کی وجہ سے ہماری آخرت درست ہو رہی ہے۔ جتنی ہم کو یہاں کلفت ہوتی ہے۔ اُسی قدر عذاب جہنم سے ہم کو نجات نصیب ہوتی ہے۔ تو وہ ان تکالیف کو بالکل ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ نشتر کی تکلیف کو سمجھتے ہیں۔ آپ نشتر کی کلفت پر دل سے راضی ہیں۔ وہ فقر و فاقہ اور طاعون وغیرہ کی تکلیف سے دل سے راضی ہیں۔ اب یہ شبہ زائل ہو گیا۔ کہ انبیاء و اولیاء تو گناہوں سے معصوم اور محفوظ ہوتے ہیں۔ ان پر یہ مصیبتیں کیوں آتی ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ ان حضرات پر واقع میں مصیبت ہی نہیں۔ اور جو واقع میں مصیبت ہے وہ بداعمالیوں ہی سے آتی ہے۔ (ایضاً ص ۳۱ تا ۳۳)

(۴۵) جدید رنگ میں رنگے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی کئے ہوئے ہیں

جو طبائع زمانہ کے جدید رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان میں تو یہ کوتاہی شاہد ہے کہ وہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں کہ دوسرے اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کی گفتگو کے موقع پر آپ کی سوانح عمری میں سے یا آپ کے بعض اقوال یا افعال کی حکمتوں میں سے (خواہ اُن کی حقیقت تک اُنکے ذہن کی رسائی ہو یا نہ ہوئی ہو) صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے۔ محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں۔ کہ آپ کی عظمت اور آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہو جاوے۔ اور اسی کو اسلام کی خدمت اور آپکے ادائے حقوق کیلئے کافی سمجھتے ہیں باقی نہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں۔ نہ محبت کا کوئی اثر پایا جاتا ہے۔ بلکہ اتباع کو تعصب اور محبت کو وحشت سمجھتے ہیں۔ اور سبب خفی اس کا یہ ہے۔ کہ اس زمانہ میں سب سے بڑا مقصد جاہ و عزت کو قرار دیا گیا ہے۔ جس کے مطلوب ہونیکا ہم کو بھی انکار نہیں

مگر کلام اس میں ہے کہ آیا وہ مطلوب بالعرض ہے۔ یا خود مطلوب بالذات ہے بہر حال چونکہ اُس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے حضور اقدس صلے اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے لاتعد ولاتحصیٰ کمالات حقیقت عظیمۃ الشان میں سے اُنکی نظر اسی کا انتخاب کرتی ہے۔ اور دوسرے کمالات کا مثل محبت الٰہی و خشیت و زہد و صبر و تربیت روحانی و مجاہدہ و شغل بحق و دیگر فضایل علمیہ و عملیہ کا کبھی اُن کی زبان پر نام بھی نہیں آتا۔ جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے۔ کہ گویا آپ خاص اسی غرض کیلئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ کہ ایک جماعت کو قوم بنا کر اس کو دنیوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرماویں تاکہ وہ دوسری قوموں پر سابق و فائق رہکر دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ کیا قرآن مجید و حدیث شریف میں گہری نظر کرنے والا آپکی تعلیم کا یہ خلاصہ نکال سکتا ہے۔ ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کے لیئے اس کی سخت ضرورت ہے۔ کہ علماء محققین و عرفاء متحققین کی طول صحبت و ملازمت کا التزام کریں۔ اور ان کی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کرکے رہیں۔ خود اُن کے اقوال متفرقہ و ارشادات مختلفہ سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہو جاویگی۔ اس کے بعد جو شبہات رہ جاویں ان کو ادب کے ساتھ اُن کے حضور میں پیش کریں۔ اور توجہ و انصاف کیساتھ جواب سنیں۔ ان کو اس زمانہ سکوت میں جو اُصول و قواعد مسلّمہ اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ اُصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معیّن ہونگے۔ اور اطمینان و شفائے کلی میسر ہوگی۔ اس طریق اصلاح کو جو حکمی مجرب ہے سرسری خیال نہ فرماویں اور نیز حدیث میں کتاب الرقاق و ابواب الزہد کا بار بار مطالعہ فرماویں۔ (التشذور فی حقوق بدر البدور۔ ص۳ تا ۴)

ایسے لوگ درحقیقت حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق میں تقصیر کیئے ہوئے ہیں۔ متابعت و محبت کا موجود نہ ہونا تو ظاہر ہے۔ اور اوپر اسکو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ البتہ اُن کے اس عمل سے کہ اُن کی زبان

زبان یا قلم سے بعض ایسے مضامین صادر ہوتے ہیں کہ ان سے آپکی عظمت یا آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ شاید وہ آپ کا حق عظمت ادا کرتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جاوے۔ تو ثابت ہو جاوے کہ یہ احتمال بھی واقعیت نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے وہ وہ عظمت ہے جس کے ساتھ آپ حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف ہیں۔ اور ان لوگوں کی تحریر و تقریر میں نظر کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے قلوب میں آپ کی جو عظمت ہے۔ وہ اس حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک حکیم تمدن ہونے کی حیثیت سے ہی۔ کیونکہ ان دونوں عظمتوں کے آثار کا موجود نہ ہونا۔ ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔ چنانچہ اعتقاد عظمت نبوی کے آثار یہ ہیں۔ کہ آپکے احکام سُنتے ہی یہ معلوم ہو۔ کہ گویا حق تعالیٰ نے ہم سے خود فرمادیا ہے۔ اور یہ کہ اس حکم کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت سمجھنے کا ہرگز انتظار نہو۔ بلکہ اگر بادی النظر میں کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہو۔ تب بھی اُسی خوشی سے قبول کرے۔ جیسا حکمت معلوم ہونیکے وقت کرتا۔ اور نہ بدون حکمت سمجھے ہی اس حکم کی وقعت میں کچھ کمی ہو۔ بلکہ جس طرح ادنی خدمتگار شاہی حکم سُن کر مغلوب و والہ ہو کر دیوانہ وار اس کی بجا آوری کے لئے دوڑتا ہے۔ اسی طرح اسکی کیفیت ہو جاوے۔ اور یہ کہ اس حکم کے خلاف کا مستحسن ہونا خیال میں بھی نہ آوے بلکہ اجمالاً یوں سمجھے۔ کہ بس تمام خیر و برکت اور حکمت و مصلحت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے۔ خواہ ہمارا ذہن کوتاہ اس کی تفصیل تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ بقول حضرت عارف گنجوی رحمۃ اللہ ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو	نینگیختن علت از کار تو

اور صرف حکیم تمدن ہونے کے لحاظ سے جو اعتقاد و عظمت ہوتا ہے۔ اُس کے آثار یہ ہیں۔ کہ حکم سُن کر اتنا ہی اثر ہو۔ جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے کو سُنکر ہوتا ہے اور یہ کہ اس کے قبول کرنے میں یا اس کو نظر وقعت دیکھنے میں

اس کا بھی انتظار رہو۔ کہ اس میں عقلی (اور عقلی بھی دنیوی) مصلحت کیا ہے۔ جب تک مصلحت معلوم نہ ہو۔ اُس میں سخت تردد و خلجان رہے۔ اور ہرگز اس پر عمل کرنے میں شرح صدر نہو۔ خود بھی ایک قسم کی تنگی اور جبر و تحکم کا سا اثر رہے۔ اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا دعویٰ کرتے ہوئے ایک گونہ خجلت اور بے وقعتی کی سی کیفیت رہے۔ اور بار بار اس حکم کی جانب مخالف کی ترجیح کا ہجوم اور اس کی تمنا کا قلب پر غلبہ رہے۔ اور ہرگز اسکے صحیح ہونے کا دل کھول کر حکم نہ کر سکے۔ بلکہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہو۔ اور جب اور کچھ نہ ہو سکے۔ تو بعض تاویلات سے اس حکم کے شرعی ہونیکا انکار کر دے۔ کبھی اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے۔ بلکہ اس کو راویوں کی نقل کی غلطی یا اُن کی رائے کی آمیزش کا اثر بتلاوے۔ اور کبھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کر کے خود آپکی نسبت کسی ضرورت و مصلحت وقت کے اتباع کا دعویٰ کرے۔ اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہیں رہی۔ لہذا اس حکم کو بھی موجود نہ سمجھے غرض ہزاروں حیلے نکالے مگر اس حکم کو نہ مانے (اور یہ ان میں سب سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال ہے) اور یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش کفر سے سب ملے ہوئے ہیں۔ کوئی صریح کفر کوئی خفی کفر ہے۔ کوئی کفر بننے کو ہے۔ کما لا یخفی علی المتفطن السلیم۔ جب دونوں اعتقادوں کے آثار جدا جدا معلوم ہو گئے۔ آگے ہر شخص کو مشاہدہ سے اپنے اندر بھی اور غیر کے اندر بھی ان آثار کا وجود و عدم وجود معلوم ہو سکتا ہی۔ اور اس سے ہمارے دعوئی سابقہ کا صدق بخوبی واضح ہو جاویگا (اس مضمون کی شرح زیادہ تحقیق کے ساتھ مطلوب ہو تو مضمون عظمت وحی رقمزدہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دامت فیوضہم جو القاسم کے نمونہ میں شائع ہوا ہے ملاحظہ فرما لیا جاوے) ہماری اس تقریر کے یہ معنے نہ سمجھے جائیں کہ احکام شرعیہ حکمت سے خالی اور عاری ہیں۔ حاشا وکلا۔ بلکہ مقصود یہ ہے۔ کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہم حکمت پر موقوف نہونا

چاہیئے۔ ہاں وہ خود ایک مستقل علم ہے۔ کہ اس کو اسرار شریعت کا لقب دیا جاتا ہے مگر اس کے اہل خواص عارفین ہیں۔ عوام الناس کو اس سے بجائے نفع کے ضرر کا احتمال غالب ہی کئی وجہ سے۔

ایک اس لئے کہ ان میں سب تو منصوص ہیں نہیں۔ اجتہادی بکثرت ہیں جن میں احتمال خطا کا بھی۔ سو اگر کبھی اس کا غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا۔ اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت یقینی تھی۔ تو اس کے صحیح نہ ہونے سے اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھیگا (بخلاف خواص کے کہ وہ اس کو یقینی علت اور مبنی حکم کا نہ سمجھیں گے اس لئے حکم میں ان کو کبھی کوئی خدشہ ہوگا)۔

دوم اس لئے کہ کبھی کوئی مبنی اور حکمت صحیح معلوم ہوگی۔ لیکن بعض اوقات وہ وجہ اور حکمت اس عامی کی نظر میں باوقعت نہیں ہوگی۔ تو اس حکم کو بھی بے وقعت سمجھنے لگے گا۔

سوم اس لئے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عامی اس کو علت اور اصلی سبب سمجھ کر کسی موقع میں اس کے موجود نہ ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے گا۔

چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھ کر کسی محل و موقع میں حکمت کے حاصل ہو جانے کو کافی سمجھ کر تحصیل حکم کی ضرورت نہ سمجھے گا۔ اور ان دونوں صورتوں (سوم وچہارم) میں اجتہاد باطل کا باب وسیع ہو جاویگا۔ مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم لگا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ علت نہیں۔ حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت بھی نہ ہو تب بھی قصر ہے۔ اور اسی طرح وضو مشروع ہوا ہی۔ حکمت نظافت وطہارت ہے لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضو سے استغنا نہ ہوگا۔

پنجم یہ کہ عامی مخالف دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کریگا۔ اور اگر وہ یقینی نہیں تو اس میں مخالف نے اگر خدشہ نکالدیا۔ تو یہ مغلوب ہو جاویگا۔ اور اس میں اسلام کو

اور حق کو صدمہ پہنچیگا مثلاً کسی نے کباب ملنے کی ممانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ اس میں صفت سبعیت کی ہوتی ہے۔ تو اگر کسی نے اس میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ تعلیم کے بعد سبعیت نہیں رہتی۔ پھر کیوں ممنوع ہے۔ تو یہ شخص بزبان حال اس حکم کو بے بنیاد کہیگا۔ بخلاف راسخ فی العلم کے کہ وہ بجائے حکمت کے یہ کہیگا۔ ہمارے آقائے عظیم الشان کا یہ حکم ہے ہم نہیں جانتے کیا مصلحت ہے۔ تو اس شخص پر کوئی خدشہ ہی نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً ص۸ تا ۹)۔

(۱۰۴) جدید الطبائع کی ترقی مطلوبہ کی شریعت نے تعلیم نہیں فرمائی

ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے۔ لیکن اس وقت اس کا حاصل محض طول امل و حرص ہے۔ جس کی شریعت مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے۔ صحابہ کرام جو کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے سچے نمونے تھے اُنہوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی ہرگز نہیں دی۔ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی حضور کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدون ہے۔ اس کو دیکھ جائیے ابتدا سے انتہا تک کہیں بھی آپ کو یہ تعلیم نہ ملے گی۔ رہے تاریخی واقعات۔ سو ان کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ احادیث کے مطابق ہوں۔ تو قابل اخذ ہیں۔ ورنہ ہیچ محض (تجارت آخرت۔ ص۲)

غرض حدیث کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا۔ کہ آپ کا طرز زندگی کیا تھا۔ اور وہی طرز بعینہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ تو صحابہ کے یہاں طول حرص اور طول امل کا نشان بھی نہیں تھا۔ اُن کی ترقی ترقی دین تھی۔ اگرچہ اس کے تابع ہو کر ان حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ لیکن مطمح نظر صرف ترقی دین تھی۔ چنانچہ ان حضرات کی اسی شان کو خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیدیں

تو یہ لوگ اُس وقت بھی نمازیں قائم کریں۔ اور زکواۃ دیں۔ اچھی باتوں کی ترغیب دیں۔ اور بُری باتوں سے روکیں۔ یہ ہے اُن کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اب ان کو یاد رکھئے اور پھر اُن کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھیے۔ اور انطباق کیجئے۔ واللہ ایسا دشوار انطباق ہے۔ جیسے خط مستقیم پر خط منحنی کو منطبق کرنے لگیں۔ کہ جبتک اس میں استقامت اور استغنار باقی رہیگا۔ کبھی انطباق ممکن ہی نہیں۔ تو ہمارے خیالات خط منحنی کی طرح ہیں۔ اور ان حضرات کے خیالات کی مثال خط مستقیم ہے۔ بحمداللہ یہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی۔ کیونکہ خط منحنی کے انطباق علی المستقیم کی شان یہ ہوتی ہے۔ کہ اس کے بعض اجزار تو خط مستقیم پر سے گذرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور بعض اجزا اس سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی حالت ان خیالات مخترعہ کی ہے۔ کہ ان میں اگر ایک قدم تو شریعت پر ہے۔ تو دوسرا اس سے بالکل الگ۔ جس کا کسی تاویل سے بھی جادۂ شریعت پر انطباق نہیں ہو سکتا۔ پس ایسے حالات و خیالات کس طرح قابل مدح ہو سکتے ہیں۔ (الیضاًمت تا ۱۴)

(۷۴) محدثین پر اس اعتراض کا جواب کہ اُنھوں نے اپنی رایوں کو واقعات میں شامل کر دیا

بعض خود رو مصنفین پر افسوس ہے کہ وہ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اُنھوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے۔ لیکن جو شخص محدثین کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین علیہم الرحمۃ نے کس تدین سے کام لیا ہے البتہ یہ اعتراض مطابق واقع کے مؤرخین پر ضرور ہو سکتا ہے۔ صاحبو! محدثین کا تدین اس سے زیادہ اور کیا ہو گا۔ کہ اگر ایک باب کی حدیث سے ایک بات کو ثابت کرتے ہیں۔ تو اس کے بعد ہی دوسرا باب اس کا معارض صوری بیان کرتے ہیں۔ اور اس میں بھی حدیث پیش کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا۔ کہ ان حضرات

کا مقصود محض نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات کا جمع کرنا ہے۔ نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا یا اس پر زور دینا۔ کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو اس پہلی سے صورۃً معارض ہے۔ موجود ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اس محدث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی۔ تو بصورت ایراد معارض کوئی خاص رائے کیونکر مقصود ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنی اغراض کی تائید مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے۔ کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں۔ ہاں تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک موَرخ نے اپنے خیال کے موئید واقعات کو لیا۔ اور دوسرے نے اپنے خیالات کے موئیدات کو۔ پس جب حدیث و تاریخ میں یہ تفاوت ہے تو حدیث قابل وثوق ہوئی۔ اور اس کے مقابل تاریخ قابل وثوق نہوئی۔ تو جو واقعات تاریخ میں حدیث کے خلاف ہونگے۔ اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی۔ تو وہ محض ہیچ ہیں۔ ہرگز قابل قبول نہیں (ایضاً ص۲)

(۸۴) لیڈران قوم خود ہی محتاج اصلاح ہیں۔ دوسرونکی اصلاح کیا کریں گے؟

آج دیکھ لیجئے کہ ان مدعیان طبابت اخلاق کا کیا برتاؤ قوم اور اُس کے ساتھ ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی ان کو ہمدردی نہیں۔ اور اپنے امراض کے علاج پر بھی توجہ نہیں۔ اور یہی سبب ہی قوم سے ہمدردی نہ کرنیکا۔ کیونکہ طبعاً اپنا خیر خواہ انسان زیادہ ہوتا ہی۔ بلکہ دوسرونکی جو خیر خواہی کرتا ہی۔ اس میں اپنی خیر خواہی مضمر ہوتی ہے۔ پس جو شخص اپنا ہمدرد نہو گا۔ وہ دوسرونکا کیسے ہمدرد ہو گا۔ یہ لوگ اول اپنی تو اصلاح کر لیں۔ پھر دوسروں کی اصلاح حقیقی کی فکر کریں۔ آج یہ حالت ہی کہ اظہار ہمدردی اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں انجمنیں قائم ہوتی ہیں۔ مگر نہ نماز کی فکر ہے۔ نہ روزہ کا خیال ہی۔ مال کی اتنی افراط

ہے۔ کہ دس آدمیوں کو اور بھی ساتھ لیجا سکیں۔ لیکن محبت اسلام کا یہ عالم ہے۔ کہ خود بھی حج کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ وضع کو دیکھئے تو سر سے پاؤں تک اسلام کے بالکل خلاف۔ گفتگو کو دیکھئے۔ وہ مذہب سے بالکل جدا۔ تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں۔ تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ ان کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کی ایک رسم ہوتی ہے کہ اہلِ زمانہ اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ آجکل یہ رسم ہے کہ ہر مشہور یا غیر مشہور تحصیل شہرت یا تکمیل شہرت کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ منجملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جلسے کئے جائیں۔ کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے۔ کوئی سکرٹری کوئی کچھ کوئی کچھ۔ اور اس سے عام و خاص میں ان کو ایک امتیاز ہو جائے۔ پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی۔ تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اس انطباق کی برکت سے ایک دن مبدل بحقیقت ہو سکتی تھی۔ اور جب ظاہری انطباق علی الشریعہ بھی نہ ہو تو سراسر مضر اور سم قاتل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حکمائے امت نے عوام الناس سے اسی قدر کو کافی سمجھا ہے۔ کہ وہ اپنی صورت ظاہری شریعت کیموافق بنالیں اور صورت عبادت کے پابند ہو جاویں۔ کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی انشاء اللہ ایک دن مبدل بحقیقت ہو جاویگی (تجارت آخرت ص۵ تا ۶)

خلاصہ یہ ہے کہ آجکل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلامعنی ہیں اور صورت بھی ٹھیک نہیں۔ اور لوگوں نے ان کو محض رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا۔ کہ یہ جب اپنا ہی دین برباد کر رہے تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں۔ اور اگر کہئے کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم کر رکھا ہے۔ اس لئے باوجود اپنے دین کے قائم کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں۔ تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیاوی منافع میں ہے دینی منافع میں نہیں یعنی اگر ہمارا کوئی دنیاوی نفع

فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جاوے۔ تو اس کو ایثار کہیں گے۔ اور اگر ہمارا دین تباہ ہو کر دوسروں کو نفع پہنچے۔ تو یہ ایثار نہیں کہلائیگا۔ ورنہ اگر دین کو تباہ کر کے بھی ایثار ہوتا۔ تو باغی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں۔ اور ان کو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہئے۔ کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی و ایثار ہے۔ کہ اُنہوں نے اپنی جان بھی دیدی۔ اور تمام منافع جو اطاعت سے ان کو پہنچے۔ وہ دوسری رعایا کے لئے چھوڑ دیئے۔ صاحبو! یہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا۔ دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی (ایضاً ص۸۹)

غرض جیسے فرعون کی ہمت تھی۔ ویسی ہی آجکل کے ایثار والوں کی ہمت بھی ہے اور اگر فرعون کی وہ ہمت ہمت کہلانے کے قابل نہیں۔ تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا۔ کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں۔ وہ دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں۔ تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کیلئے کر رہے ہیں (ایضاً ص۹۰)

(۹۴) جو لوگ علماء کی استیصال کی فکر میں ہیں وہ اسلام ہی کی استیصال کر رہے ہیں

آجکل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے۔ اور طرح طرح کی تدبیروں سے اُن کے اثر کے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بُرا بھلا بھی ان کو کہا جارہا ہے۔ مگر علماء اس بارہ میں خاموش ہیں۔ وہ بہت احتیاط کرتے ہیں۔ وہ کسی بلاضرورت بُرا نہیں کہتے۔ مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جاوے۔ جبکہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے۔ اور وہ ضرورت یہ ہے۔ کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہو رہے ہیں۔ یہ لیڈر دین کے احکام میں دخل دیتے۔ اور اپنی رائے سے جس طرح چاہتے ہیں۔ احکام میں تحریف کر دیتے ہیں۔ اور عوام ان کو مولوی مولانا سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں۔ مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے۔ کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر

اعتقاد ہو۔ اور رسول پر اعتقاد جب ہی ہوگا۔ جبکہ حاملان شریعت سے اعتقاد ہو کیونکہ عوام کو رسول کی معرفت علماء ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس نے علماء کو نہیں پہچانا۔ وہ رسول کو نہیں پہچان سکتا۔ پس جو لوگ علماء کے استیصال کی فکر میں ہیں۔ وہ خود مسلمانوں کی بلکہ عالم کے استیصال کی فکر میں ہیں (المرابطہ ص۱۳ و ۱۴)

بعض لوگ ان حجرہ نشینوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی میدان میں نکلو۔ حجرہ میں کیوں بیٹھے ہو۔ مگر ان سے کوئی پوچھے کہ حجرہ والوں کو میدان میں آنے کون دیتا ہے۔ ان سے کام کون لیتا ہے۔ اگر یہ میدان میں نکلیں گے تو شریعت کے اتباع کا حکم کریں گے جو آجکل لوگوں کے نزدیک تعصب اور تنگ خیالی ہے۔ پھر تم خود ہی یہ کہو گے۔ کہ یہ مولوی ہمارے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ ان کو حلال و حرام جائز و ناجائز ہی کی پڑی رہتی ہے۔ اب میدان میں نکل کر نہ ان سے میدان کا کام ہوگا۔ نہ خلوت کا دونوں سے گئے گذرے ہوئے۔ اس سے تو ان کا خلوت ہی میں رہنا اچھا۔ اور تم کو خبر بھی ہے جو لوگ میدان میں نکلے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ان حجرہ نشینوں ہی کی برکت سے کام کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ حجرہ والے ہر وقت مسلمانوں کی کامیابی اور صلاح و فلاح کی دعا کرتے رہتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہم بعون ہمت مردان رسید	ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید

صاحبو! دین کا سمجھنا ان لیڈروں کا کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ انہیں لوگوں کا کام ہے جنہوں نے حجرہ میں بیٹھکر چراغوں کا دھواں پھانکا ہے۔ اور پانی کی جگہ تیل پی لیا ہے۔ بعض طلباء کو ایسا پیش آیا ہے۔ کہ مذاق میں اُن کو کسی نے پانی کی جگہ تیل دیدیا اور وہ مطالعہ میں ایسے مصروف تھے کہ ان کو اصلاً اس کی خبر نہ ہوئی (ایضاً ص۲۳)۔

تو تدقیق اور تحقیق احکام ان علماء کا کام ہے۔ لیڈروں کا کام نہیں۔ غضب یہ کہ لیڈر علماء کا کلام بھی تو نقل نہیں کرتے۔ بلکہ اپنا کلام بیان کرتے ہیں۔ اور اپنے کلام سے علمائے کے کلام کو رد کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس بات کی بھی لیاقت نہیں رکھتے کہ علماء کے کلام کو سمجھ بھی سکیں۔ اس پر اُن کا حوصلہ یہ ہے کہ علماء کو میدان میں

نکلنے کی تاکید کرتے - اور ان کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا چاہتے ہیں - صاحبو! میرے نزدیک تو اس وقت میدان میں نکلنے کا وقت نہیں - کیونکہ حدیث میں ہے -
اذا رائیت شحا مطاعاً و دنیا موثرۃ وھوی متبعا و اعجاب کل ذی رائی برأیہ فعلیک بخاصۃ نفسک ودع عنک امر العامۃ اور میرے نزدیک آجکل سب علامات موجود ہیں - اسلئے آجکل گوشہ نشینی لازم ہے - مگر میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا - اگر کسی عالی ہمتی کے نزدیک ابھی ان علامات کے ظہور کا وقت نہ ہو تو بسم اللہ وہ میدان میں نکلیں - مگر اپاہجوں کو کیوں اپنے ساتھ کھینچتے ہیں - آخر ایک کام یہ بھی تو ہے - کہ خدا سے دعا کریں - تو ان کو اس کام کیواسطے رہنے دیں - ایک جماعت اسکے واسطے بھی تو ہونا چاہیئے - یہ تقسیم عمل اچھی ہے - مگر افسوس آجکل دعا کو لوگ عمل ہی نہیں سمجھتے (الیضاً ص ۲۳ تا ۲۴)

(۵۰) لیڈران قوم نے جو فلاح دنیا کے طریقے سوچے وہ غلط ہیں

آج کل لیڈروں نے فلاح دنیا کے طریقے کچھ اور سوچے ہیں - یہ وہ صورت اختیار کرتے ہیں - جو یوروپ نے اور غیر اقوام نے اختیار کی ہے - میں یہ نہیں کہتا - کہ وہ تدبیریں فلاح دنیا میں موثر نہیں - مگر یہ ضرور کہوں گا - کہ مسلمانوں کے واسطے مفید نہیں کیونکہ مسلمانوں میں ان تدابیر کی تاثیر سے ایک مانع موجود ہے - وہ کیا؟ معصیت خدا کی نافرمانی اور یہ مانع کفار میں نہیں ہی - کیونکہ وہ مکلف بالفروع نہیں - وہ تو صرف ایمان کے مکلف ہیں - ان کو کفر ہی کا عذاب ایسا سخت ہوگا - جس سے بڑھکر کوئی عذاب نہیں - بقیہ اعمال کی بابت نہ اُن سے باز پرس ہی - نہ ان پر کوئی سزا ہے - اور مسلمانوں سے کفر کا عذاب تو ہٹا ہوا ہے - کیونکہ بحمد اللہ وہ دولت ایمان سے مشرف ہیں - اس لئے اُن کے اعمال پر باز پرس و گرفت ہوتی ہی - جب یہ ایسے طریقے فلاح دنیا کے لئے اختیار کرتے ہیں - جو خدا کے حکم کیخلاف ہیں تو ان کو کامیابی نہیں ہوتی - اللہ تعالیٰ ان تدابیر کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں

تاکہ دنیا ہی میں مخالفت کی سزا بھگت لیں۔ پس ان کی اور کفار کی ایسی مثال ہے
جیسے ٹوپی اور جوتا۔ کہ ٹوپی میں نجاست لگ جائے تو فوراً پھینک دی جاتی ہے
اور اچھی طرح پاک کرنے کے بعد اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جوتے میں ناپاکی
لگ جائے۔ تو اس کو پھینکتے نہیں ہیں بلکہ رگڑ کر کام میں لے آتے ہیں۔ تو جس طرح
ہر چیز کے پاک کرنیکا طریقہ مختلف ہے۔ اسی طرح ہر قوم کی فلاح و ترقی کا طریقہ الگ ہے
یہ ضرور نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو نافع ہو۔ وہ سب ہی کو نافع ہو۔ اور اگر ہم مان
بھی لیں کہ یہ تدابیر ہمکو بھی نافع ہیں۔ تب بھی ہم کو تو احکام الٰہیہ کا اتباع لازم ہے
اور ان تدابیر غیر مشروعہ کا اختیار کرنا جائز نہیں۔ کیا شراب اور قمار و سود میں نفع
نہیں ضرور ہے۔ خود نص میں ارشاد ہے۔ قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس۔
مگر اس نفع کو لیکر کیا کریں۔ جس کے ساتھ خدا کا غضب بھی ملا ہوا ہے۔ اس لئے
مسلمانوں کو وہی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ جو شریعت کیموافق ہوں۔ اُس کی یہی
صورت ہے کہ عمل کا اہتمام کیا جاوے۔ اب لیڈر تدابیر تو خلاف شرع کرتے ہیں۔
اور علماء کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ ملکر کام نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں
کہ اعمال غیر مشروعہ میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتے۔ اگر یہ اعمال مشروعہ بھی ہوں تب
بھی اُن کی یہ شکایت صحیح نہ تھی۔ کیونکہ مل کر کام کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب کے
سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کام تقسیم کر دیے جائیں
جیسے لوہار۔ بڑھئی۔ معمار۔ مزدور سب ملکر مکان بناتے ہیں۔ اس کے یہ معنی تھوڑا ہی
ہیں کہ ہر اینٹ کو لوہار بھی ہاتھ لگائے۔ بڑھئی بھی ہاتھ لگائے۔ بلکہ اپنے اپنے کام
کو ہر ایک الگ کر رہا ہے۔ پھر نتیجہ مجموعہ پر مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح لیڈر اگر شریعت
کیموافق بھی تدابیر کریں۔ تب بھی علماء کا یہ کام نہیں کہ وہ ان تدابیر میں عملی حصہ لیں بلکہ یہ کام
عوام کا ہی یا لیڈروں کا۔ علماء کا کام یہ ہے کہ جو تدبیر کرنا چاہو اول علماء سے استفتاء کر لو کہ یہ جائز بھی
ہے یا نہیں اور وہ اسکے متعلق حکم شرعی بتلا دینگے۔ تم اسپر عمل کرو۔ تمام متمدن اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ انکے
یہاں علمی محکمہ الگ ہوتا ہے۔ علمی محکمہ الگ ہوتا ہی یہ نہیں کیا جاتا کہ ایک کام کیلئے طلبا و اساتذہ بھی اپنا پڑھنا

میں بدستور لگے رہتے ہیں۔ کام کرنیوالی جماعت دوسری ہوتی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہر قسم کی فلاح اطاعت وعمل ہی سے حاصل ہوگی دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ اب چونکہ مسلمانوں نے عمل صالح کو ترک کر رکھا ہے تو دیکھ لیجئے کیسی فلاح ہو رہی ہے۔ ہر روز پہلے سے بدتر ہے (المرابطہ ص۴۸ تا ۵۰)

(۵۱) غیر قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے

آجکل ترقی کی پکار بہت ہے۔ ہر شخص ترقی کا طالب ہے اور دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے۔ اور اُن کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے۔ مگر ابتک حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا۔ کسی نے کہا۔ کہ یہ لوگ سود لیتے ہیں۔ اسوجہ سے ترقی ہو رہی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اگر اس میں یہ خاصیت ہوتی۔ تو چاہیئے کہ جو مسلمان سود لیتے ہیں ان کو بھی ترقی ہوتی۔ حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ وہ بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ شریعت میں چونکہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اس لئے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ معاملات میں حدود شرعیہ کے پابند کتنے تاجر ہیں۔ ذرا مجھے تو بتلاؤ۔ انشاءاللہ دو چار کے سوا کوئی نہ ملے گا۔ پھر ان مسلمان تاجروں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی۔ یہ کون سے ناجائز معاملات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ غرض سب کی مشق اسلام پر ہے کہ مذہب ہی ترقی سے مانع ہے (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۴۴)

غیر قوموں کی جو باتیں ترقی میں دخیل ہیں۔ وہ دوسری ہیں وہ ان کی خاص صفات ہیں جو اُنہوں نے آپ ہی کے گھر سے لی ہیں۔ مثلاً منتظم ہونا مستقل مزاج ہونا۔ پابند وقت ہونا متحمل ہونا۔ انجام کو سوچ کر کام کرنا۔ صرف جوش سے نہ کام کرنا۔ ہوش سے کام لینا۔ آپس میں اتفاق واتحاد کرنا۔ ایک دوسرے کے راز کو چھپانا۔ اور یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور ان احکام

میں یہ خاصیت ہے کہ اُن کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے۔ خواہ کوئی بھی اختیار کرے۔ اب مسلمانوں نے توان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ نہ ان میں اتحاد واتفاق ہے۔ نہ رازداری کا مادہ ہے نہ انتظام ہے۔ نہ وقت کی پابندی ہے نہ انجام بینی ہے۔ جو کام کرتے ہیں جوش سے کرتے ہیں۔ ہوش سے نہیں کرتے اس لئے ان کو تنزل ہے۔ اور غیر قوموں نے اُن کے گھر سے چرا کران باتوں پر عمل شروع کر دیا۔ تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی۔ کہ ان کو ترقی ہونے لگی پھر یہ سرقہ ناقص ہے کیونکہ چور کو گھر کے اندر کی سب چیزیں معلوم نہیں ہوا کرتیں اس کو وہی چیزیں ہاتھ لگتی ہیں۔ جو ظاہر ہوں۔ دبا تالے کنجی میں ہوں) دبے ہوئے خزانے کی اطلاع اُسے نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے وہ پارس کی پتھری جو آپ کے گھر میں تھی۔ اسکی اُنہیں خبر نہیں ہوئی۔ یا خبر ہوئی۔ مگر اُنہوں نے بیکار سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ پارس کی پتھری دیکھنے میں تو پتھر ہی ہوتی ہے اس کی خاصیت جسے معلوم ہو۔ وہی اس کی قدر جان سکتا ہے۔ ناواقف کے نزدیک تو کانچ کا ٹکڑا۔ اور بلور کا پتھر برابر ہے۔ وہ پارس کی پتھری آپکے گھر میں کیا ہے۔ ایمان و توحید و اعتقاد ورسالت نماز روزہ وغیرہ افسوس آپ کو اپنے گھر کی قدر نہیں۔ اگر آپ میں وہ صفات ہوتیں۔ جو دوسری قوموں نے آپ سے لے لی ہیں۔ تو پارس کی پتھری کے ساتھ ملکر آپ کو وہ ترقی ہوتی جو غیر قوموں کے خواب میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی۔ آپ کو وہ عروج حاصل ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا۔ کہ کوئی اُن کے ساتھ آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ مگر آجکل مسلمانوں کو اس ارشاد الٰہی پر نظر نہیں۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا ط یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ط اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے۔ حالانکہ اس آیت میں ایمان وعمل صالح پر صاف صاف وعدہ ہے استخلاف فی الارض اور تمکین کا مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات

کہ نماز روزہ اور ایمان میں بھی کچھ قوت ہے راور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے افسوس
جس خزانہ کو چور نے ناواقف ہو کر یا بیکار سمجھ کر چھوڑا تھا۔ اس کی قیمت وقوت سے خود
گھر والے بھی آج ناواقف ہیں۔ یا بعض اعتبار سے یوں کہیے کہ بیکار ہی سمجھتے ہیں۔
مگر ایسوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہیے۔ یہ کہاں کے مسلمان جو نماز روزہ کو بیکار سمجھیں
مگر ایسے تو دو چار ہی نکلیں گے۔ زیادہ وہی ہیں۔ جو اپنے خزانے کی قیمت سے ناواقف
اور اس کی طاقت سے بےخبر ہیں۔ اسی لئے ان اعمال کی بے قدری کرتے ہیں۔ کوئی
مسلمانوں کی حالت کا تتبع کرے تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں
آتا۔ اور لاکھوں ایسے ملیں گے۔ جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے۔ اور
بہت سے وہ ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں۔ کبھی جی چاہا جمعہ
کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں۔ اور جو تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت
کی نمازوں کے پابند ہیں۔ ان میں بھی قاعدہ کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت
کم ہیں۔ کسی کا رکوع غلط ہے۔ کسی کا سجدہ کسی کا قومہ مفقود ہے۔ کسی کا جلسہ ایک گڑبڑ
کر رکھی ہے۔ تو اب آخر یہ کیا ہے۔ بیقدری ہے یا نہیں۔ اور بخدا یہ بیقدری اسی
واسطے ہے کہ نماز کو صرف ثواب کا کام سمجھ رکھا ہے۔ اس کے دنیوی منافع کی انکو
خبر نہیں۔ بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیوی ترقی سے مانع سمجھتے ہیں۔ اور اگر ان کو
حقیقت معلوم ہو جاتی اور یہ خبر ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکن فی الارض میں
بھی دخل ہے۔ تو پھر دیکھئے۔ کہ مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجالاتے۔ گو
اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں۔ خلوص کے خلاف ہے۔ طاعات سے ثمرات
دنیا کا قصد نہ ہونا چاہیے۔ وہ تو تابع ہیں۔ خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ الغرض
ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ اور آپ ہی کے گھر سے دوسروں
نے چرائے ہیں۔ اور آپ کی یہ حالت ہے۔ کہ دوسروں سے لیتے اور دربدر گدائی
کرتے پھرتے ہیں۔ بس وہ حال ہے ؎

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر	تو ہمی جوئی لب ناں دربدر

تا بزانوئی میانِ قعرِ آب		ذرعطش و زجوع گشتی خراب

روٹیوں کا ٹوکرا تو سر پر رکھا ہوا ہے۔ اور در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں
دریا کے اندر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور پیاس کے مارے بُرا حال ہی۔ اب دیکھئے
اسلام میں ایک تعلیم یہ ہے۔ کہ جو شخص خاص مجلس میں ہو مجلس عام میں نہ ہو
تو اس کے پاس بدون اجازت کے نہ جاؤ۔ اور اس میں زنانہ مکان ہی کی تخصیص
نہیں۔ بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو۔ اُس کے پاس
بھی بدون اجازت کے نہ جانا چاہیئے۔ اور زنانہ مکان میں جس طرح دوسرونکو
استیذان کا حکم ہے۔ خود گھر والے کو بھی حکم ہے کہ اپنے گھر میں بدون اطلاع
کے نہ جائے۔ ممکن ہے کہ کوئی پردہ دار عورت آئی ہوئی ہو۔ اگر تم بلا اطلاع
چلے جاؤ گے۔ اُس کا سامنا ہو جائیگا۔ یا ممکن ہے تمہاری ماں بہن ہی کسی
وجہ سے ننگی بیٹھی ہو۔ اپنے گھر میں کئی دفعہ عورتوں کو ایسا اتفاق پیش آتا ہی۔ اس
لئے مردوں کو حکم ہے کہ اپنے گھر میں بھی بدون اطلاع کئے نہ جائیں۔ پھر اس کے
ساتھ یہ بھی حکم ہے۔ کہ جب تم کسی کے پاس جانا چاہو۔ اور وہ اجازت نہ دے
بلکہ یہ کہدے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا۔ پھر کسی وقت ملوں گا۔ تو اس
بات کا بُرا نہ مانو۔ بلکہ لوٹ آؤ۔ فان قیل لکما رجعوا فارجعوا ھو ازکی لکم
اور اس میں حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف
رکھنے والا ہے۔ کیونکہ ایسے وقت میں شرما شرمائے اگر کسی نے بلا بھی لیا تو
انشراح و انبساط کے ساتھ وہ تم سے نہ ملیگا۔ اس لئے کہ دل تو ملنے کو چاہتا
ہی نہ تھا۔ تو یقیناً اُس کے قلب پر تمہاری ملاقات سے گرانی ہوگی۔ پھر ممکن
ہے کہ اس گرانی کا احساس تمکو بھی ہو جائے۔ تو اس سے تم کو بھی دل دل میں
شکایت ہوگی۔ کہ یہ کیسا روکھا آدمی ہے۔ کیسا بدخلق ہے۔ جس پر میرا آنا اتنا
گراں ہوا۔ اس لئے بہتر یہی ہے۔ کہ جب کوئی کہدے کہ اس وقت میں
نہیں مل سکتا۔ فوراً لوٹ آؤ۔ اب اس مسئلہ میں ہم لوگ کتنی کوتاہی کرتے ہیں

استیذان کا سبق ہم لوگوں نے بالکل بھلا ہی دیا۔ مگر دوسری قومیں اس پر عامل ہیں کوئی شخص کسی کے کمرہ میں بدون اجازت کے نہیں جا سکتا۔ سو دیکھ لیجئے جو قومیں اس پر عمل کر رہی ہیں ان میں باہم کیسا اتفاق ہی۔ آگے یہ اُن کے تکلفات ہیں کہ استیذان کے لئے اپنے پتہ کا کارڈ بھیجتے ہیں۔ ہمکو ان تکلفات کی ضرورت نہیں بس زبانی اجازت لینا کافی ہے۔ مگر ہماری تو یہ حالت ہی کہ چاہے کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو۔ چاہے کوئی سو ہی رہا ہو۔ مگر ان کا سلام اور مصافحہ قضا نہ ہو حالانکہ شریعت میں سونے والے کی اس قدر رعایت ہے کہ حدیث میں آتا ہے حضرت مقداد راوی ہیں۔ کہ ایک بار یہ اور چند شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان تھے۔ آپ جب رات کو ذرا دیر سے گھر میں تشریف لاتے اور یہ مہمان لیٹے ہوتے تو آپ بہت آہستہ آہستہ تشریف لاتے اور ایسی آواز سے سلام فرماتے۔ کہ جاگنے والا تو سُن لے۔ اور سونے والے کی نیند خراب نہو۔ حالانکہ یہ وہ ذات ہی۔ کہ اگر آپ قتل بھی کر دیتے۔ تو صحابہ کرام کو انکار نہ ہوتا۔ بلکہ آپ کے ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا اُن کے نزدیک فخر تھا۔ مگر پھر بھی آپ صحابہ کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے۔ مگر یہاں یہ حالت ہی۔ کہ ہر وقت سلام اور ہر وقت مصافحہ ہی۔ چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو۔ چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے۔ جس پر عنایت فرماؤں نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں ایک صاحب نے تو میرے مُنہ پر کہا۔ کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں۔ انگریزوں کا سا قانون ہر بات میں انتظام۔ ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں بس اسلام تو اُن کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا۔ ہر کام کا وقت مقرر ہی۔ نماز کا بھی روزہ کا بھی حج کا بھی۔ اور اتنا بڑا انتظام ہی۔ کہ ذرا ایک تاریخ سے حج مؤخر ہو جائے۔ تو پھر سال بھر سے ورے نہیں ہو سکتا۔ تو کیا اس کو بھی انگریزی قانون کہو گے۔ عیادت اور بیمار پرسی کیلئے یہ قانون ہے اذا عاد احدکم المریض فلیخفف الجلوس حدیث میں ہے

کہ جب بیمار کی عیادت کیا کرو۔ تو اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرو۔ کیونکہ بیمار کو زیادہ ہجوم سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضرات فقہاء نے اس حکم کی حقیقت کو سمجھا وہ فرماتے ہیں کہ جس چیز سے مریض کو توحش ہو وہ کام نہ کرو۔ جس میں یہ صورت بھی داخل ہے۔ کہ مثلاً کسی کو بدھ کے دن عیادت کرنے سے اعتقاد شر کا ہو۔ تو اُس دن عیادت نہ کرو۔ بلکہ دوسرے دن عیادت کرکے اس عقیدہ کی اصلاح کردو۔ کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا۔ کہ نہیں ایسے شخص کی عیادت بدھ ہی کے دن کرنی چاہیئے۔ تاکہ اس عقیدۂ باطلہ کی مخالفت ہو۔ تو اے صاحب پھر وہ عیادت ہی کیا ہوئی مناظرہ ہو گیا۔ عیادت سے مقصود تو مریض کی دلجوئی ہے آپ کی اس مخالفت سے یہ مقصود کہاں حاصل ہوا۔ بلکہ اس کو تو آپ کی صورت دیکھ کر دونی وحشت ہوگی۔ کہ یہ کمبخت بدھ کے دن کہاں آمرا۔ دیکھئے اس کا کیا منحوس اثر ہوتا ہے۔ تو وہ اس سے گھبراویگا۔ بات چیت کرنے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا ہے لا یتناجی اثنان دون الثالث حتی یاتی رابع (اوکما قال) یعنی جہاں تین آدمی بیٹھے ہوں وہاں دو شخص آہستہ آہستہ باتیں نہ کریں۔ اس سے تیسرے کی دلشکنی ہوگی کہ مجھکو غیر سمجھا یہاں تک کہ چوتھا آجاوے تو اب دو شخص باتیں کرسکتے ہیں۔ کیونکہ تیسرے کو باتوں کا شوق ہوگا۔ تو وہ چوتھے سے کرنے لگیگا۔ پھر اس کو وہ بدگمانی نہ ہوگی۔ احتمال ہوگا کہ شاید اس چوتھے سے اخفا مقصود ہو۔ اور اس چوتھے کو اس تیسرے پر یہی احتمال ہوگا۔ سبحان اللہ حضور نے کیسی ذرا ذرا سی باتوں کی رعایت فرمائی ہے۔ اور یہ معجزہ ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے پھر بھی آپ نے معاشرت کے دقیق سے دقیق امور کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ کیا بدون نبوت کے ایسا ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اسی جامعیت تعلیم کو دیکھ کر تو کفار کہا کرتے تھے حضرات صحابہ سے کہ تمہارے نبی نے تم کو ہر بات سکھلائی حتی کہ ہگنا موتنا بھی سکھلا دیا کفار نے تو یہ بات طعن سے کہی تھی۔ مگر صحابہ نے فرمایا کہ ہاں بیشک ہمکو حضور نے

سکھلایا ہے۔ کہ بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کریں۔ اور داہنے ہاتھ سے اپنے عضو کو نہ چھوئیں۔ اور تین ڈھیلوں سے کم استنجے کے واسطے نہ لیجائیں اور ہڈی اور کوئلہ سے استنجا نہ کریں۔ یہ تعلیم سُن کر کفار کی آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی بول و براز کے یہ آداب تو بدون تعلیم کے معلوم ہو ہی نہیں سکتے۔ بھلا کچھ ٹھکانہ ہے انتظام کا کہ پیشاب و پاخانہ کیلئے بھی آداب مقرر ہیں۔ پاکی اور صفائی کا یہ قانون ہے۔ کہ آپ فرماتے ہیں اذا استیقظ احدکم من منامہ فلا یغمسن یدہ فی انائہ فانہ لا یدری این باتت یدہ۔ جب کوئی سو کر اُٹھے۔ تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے کیا خبر تیرا ہاتھ کہاں کہاں پہنچا ہوگا۔ بھلا یہ انتظام ہی نہیں تو اور کیا ہے۔ نیز ارشاد ہے۔ نظفوا افنیتکم ولا تشبھوا بالیھود۔ اپنے گھر کے سامنے کا میدان صاف رکھا کرو۔ یہود کی طرح نہ ہو۔ وہ صفائی کا اہتمام نہیں کرتے۔ سبحان اللہ! جب فناء دار کا اتنا اہتمام ہے۔ تو خود گھر کی صفائی کا اہتمام کیا کچھ ہوگا۔ اور جب گھر کا اتنا اہتمام ہے۔ تو لباس کی صفائی کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا۔ پھر بدن اور روح کی نظافت کا امر تو کیسا کچھ ہوگا۔ ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔
اسی سے عاقل سمجھ سکتا ہے۔ کہ جب حضور کو ظاہر کی نظافت کا اتنا خیال ہے تو نظافت باطن کا تو کس درجہ اہتمام ہوگا۔ مگر آجکل مسلمان اپنے گھر کے اس سبق کو ایسا بھولے ہیں۔ کہ اگر کوئی اس زمانہ میں نظافت مکان و نظافت لباس و بدن کا اہتمام کرنے لگے تو اس کو عیسائی اور انگریز کہنے لگیں۔ چنانچہ مدراس میں ایک انگریز اسلام لایا۔ ایک روز وہ جامع مسجد میں گیا۔ تو حوض کی نالی میں اس قدر رینٹ جما ہوا تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا اُس نے ایک دو لوٹے پانی سے سب دھو دیا۔ اور لوگوں سے کہا کہ صاحبو! ذرا نالی میں سے کبھی کبھی رینٹ تو صاف کر دیا کرو۔ دیکھو کیسا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ تو لوگ کیا کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تجھ میں ابھی عیسائیت کا اثر باقی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بھلا یہ بھی کوئی حرکت ہے کہ نظافت اسلامی کو کوئی دوسری

قوم اختیار کرلے تو وہ اسلام ہی سے نکل جائے۔ اور انگریزوں کا کام ہوجائے میں کہاں تک گناؤں شریعت کے انتظام کو حضور نے تو یہاں تک انتظام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں۔ لا یقولن احد کم خبثت نفسی ولیقولن قلست نفسی (او کما قال) یعنی اگر جی متلائے۔ تو خبثت نفسی نہ کہو۔ کیونکہ مسلمان کا نفس خبیث نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ یوں کہو کہ میرا جی مالش کرتا ہے۔ متلاتا ہے۔ سبحان اللہ۔ آپ نے تو ہم کو بات کرنیکے بھی طریقے تبلائے ہیں۔ تو صاحب دوسری قوموں کی ترقی کا راز یہی ہے کہ اُنہوں نے آپ کے گھر سے یہ چند باتیں چرالی ہیں انتظام۔ پابندیٔ وقت۔ رازداری۔ اتحاد و اتفاق وغیرہ وغیرہ اور ان اعمال کی خاصیت ہے کہ جو ان کو اختیار کرتا ہے۔ اُسے ترقی ہوجاتی ہے۔ اس لئے دوسری قوموں کو ترقی ہورہی ہے۔ اور آپ نے ان اعمال کو ترک کردیا ہے۔ اس لئے آپ تنزل میں ہیں۔ پھر دوسری قوموں نے جو ان اعمال کو اختیار کیا ہے۔ وہ اختیار ناقص ہے۔ اگر اختیار کامل ہوتا۔ تو وہ نتیجہ ہوتا۔ جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا۔ ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند		صاف گر باشد ندانم چوں کند

ایک خاک آمیز گھونٹ نے تو نچا دیا ہے۔ اگر خالص جام پیتے تو نہ معلوم کہاں پہنچتے۔ (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۲۹ تا ص۳۵ ملخصًا)

(۵۲) ہندو مسلم اتحاد کی خرابی

آجکل اتحاد و اتفاق کا بہت جوش ہے۔ اسی جوش میں ایسے عالی مضامین اور باریک نکات سوجھتے ہیں۔ (کہ کیا کہنے) چنانچہ مظفر نگر میں ایک ہندو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جبتک ہم میں اتفاق نہو۔ کامیابی نہیں ہوسکتی۔ پھر کہا جانتے بھی ہو کہ ہم کے معنی کیا ہیں۔ ہم کے معنی ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ ہائے سے مراد ہندو اور میم سے مراد مسلمان۔ پھر کہا کہ ہمارے ہندو بھائی ناخوش نہ ہوں۔ کہ ہا تو ذرا سی

ہے۔ اور میم لمبا ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ ہندو تو ہندوستان ہی کے اندر رہیں۔
یہ کہیں باہر سے نہیں آئے۔ اور مسلمان عرب وایران وغیرہ بہت دور سے
آئے ہیں۔ تو ان کی مسافت بہت لمبی ہے۔ اس لئے ان کے واسطے میم اختیار
کیا گیا۔ اور اس کو لمبا لکھا گیا۔ مگر اس شخص نے مسلمانوں کی بابت یہ خیال نہ کیا
کہ شاید وہ یہ شبہ کرنے لگیں کہ ہا کو پہلے لکھا گیا۔ اور میم کو پیچھے۔ اور ہا کو میم کے
سر پر سوار کیا گیا۔ اس کی کیا وجہ۔ شاید اس کا یہ جواب دیا جائے۔ کہ ہندو یہاں
پہلے سے رہتے ہیں۔ اور مسلمان بعد میں آئے ہیں۔ اس لئے ہا کو پہلے اور میم
کو پیچھے لایا گیا۔ مگر یہ شبہ پھر بھی باقی رہا کہ ہا کو میم کے سر پر سوار کیوں کیا گیا۔
اس کو پہلے ہی لکھا ہوتا۔ مگر میم سے ہا الگ لکھا ہوتا۔ مگر شاید اتحاد و اتفاق ظاہر
کرنے کیلئے خلط کی ضرورت پڑی ہو۔ اس لئے ایسا کیا گیا۔ واہیات خرافات یہ
آجکل کے نکات ہیں۔ جن کے سر نہ پاؤں۔ مگر لوگ ہیں کہ ان مضامین پر لٹو ہیں۔
اور ستم یہ کہ مسلمان بھی اس تقریر کے مداح تھے۔ جن کے یہاں نکات و معارف
ایسے ایسے عالی ہیں۔ کہ دوسری قوموں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلامی علوم
و نکات کے ہوتے ہوئے۔ یہ واہیات باتیں اس قابل ہیں۔ کہ مسلمان ان کی
تعریف کریں۔ مگر ہماری قوم میں ایک مرض یہ بھی ہے۔ کہ یہ دوسری قوموں کے
افعال کی مدح کرتے ہیں اور اپنے گھر کی چیزوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک
زمانہ انگریزوں کی پرستش کا تھا۔ اس وقت تک اُن کے افعال اور معاشرت
کی مدح سرائی ہوتی تھی۔ اور مسلمانوں کے طرز معاشرت پر اُن کے طرز معاشرت
کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اب ہندوؤں کی پرستش کا دور ہے۔ اب ان کی باتوں کی
مدح و ثنا ہوتی ہے۔ غرض یہ ہمیشہ دوسروں ہی کی پرستش میں رہیں گے۔ ان میں
یہ حوصلہ نہیں رہا۔ کہ اپنی دولت کے سامنے کسی کی چیز کو بھی منہ نہ لگاویں۔ بلکہ
سب کو اسی کے سامنے جھکانے کی کوشش کریں۔ افسوس ایسے مسلمان
اب زمین کے اندر پہنچ گئے۔ بس اب تو ایسے مسلمان رہ گئے ہیں۔ کہ ایک

صاحب کا مقولہ اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی ۔ تو فلاں شخص (یعنی گاندھی) نبوت کا مستحق تھا۔ افسوس اس شخص کو مسلمانوں میں کوئی اس قابل نہ ملا تھا۔ ایک ہندو ہی اس قابل ملا تھا۔ اے صاحبو میں پوچھتا ہوں۔ کہ آخر یہ کونسا اسلام ہے جس میں نبی ہونیکے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت نہ کرو جس اتحاد کا یہ نتیجہ ہو۔ کہ مسلمان اس سے الحاد کی طرف جائیں۔ اس اتحاد پر صد نفرین ہے۔ پھر کوئی ان لیڈر صاحب سے پوچھے کہ جب تمہارے نزدیک ہندو بھی قابل نبوت ہو سکتا ہے تو تم نے اس قضیہ شرطیہ کو کیوں تکلیف دی۔ کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی۔ کیونکہ ایسی نبوت تو ختم نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ختم تو وہ چیز ہوتی ہے جو پہلے شروع بھی ہو چکی ہو۔ اور ایسی نبوت تو آجتک شروع ہی نہیں ہوئی جس میں اسلام و ایمان کی بھی قید نہو۔ جب وہ شروع ہی نہیں ہوئی۔ تو ختم بھی نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ تو تم نے نبوت کی قسم نکالی ہے۔ اس کیلئے یہ شرط بڑھانا۔ کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی محض حماقت ہے۔ تمکو یہ کہنا چاہئے تھا۔ کہ نبوت اسلام تو ختم ہو چکی۔ اب میں نبوت کی ایک دوسری قسم ایجاد کرتا ہوں۔ جس میں اسلام و ایمان کی بھی قید نہیں۔ اور اس قسم کا پہلا نبی فلاں شخص ہے۔ غرض عیب کرنیکے لئے بھی ہنر چاہیئے۔ کفریہ کلمہ بھی زبان سے نکالا اور وہ بھی بے تکا جس کے سر نہ پاؤں اور کمال یہ کہ ایسے کلمات کو کر بھی نہ سکے۔ یہ لوگ لیڈر اور مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں۔ کوئی عالم یا جاہل اس شخص کو متنبہ نہیں کرتا کہ ان کلمات ناشائستہ سے ایمان میں فرق آگیا۔ تو اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کرو۔ اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے۔ تب تو ظاہر ہے۔ اور اگر توبہ کرلے جب بھی یہ لوگ لیڈر اور مقتدا بننے کے قابل نہیں کیونکہ ایسے کلمات سے معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ اسلام کی تعلیم سے بالکل کورے اور نرے جاہل ہیں۔ سو توبہ کرکے گناہ تو معاف ہو جائیگا۔ مگر ایک منٹ کی توبہ سے علم تو حاصل نہ ہوگا۔ غرض مسلمانوں کے اندر یہ بڑا مرض پیدا ہو گیا

ہے۔ کہ ان کو دوسری قوموں کی زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہیں۔ اور اپنے علمار کو چھوڑ کر یہ دوسری قوموں کے افراد کی عظمت کرنے لگتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قومیت اسلامی کے حامی و محافظ ہیں۔ ڈلے پتھر کیا قومیت اسلامی کی یہی حمایت ہے کہ تم اسلامی تعلیم کو دوسرے مذاہب کی تعلیم کے آگے۔ اور اسلامی علمار کو دوسری قوموں کے افراد کے سامنے ذلیل و پست کر دو۔ واللہ یہی لوگ اسلام و مسلمانوں کو ذلیل کرتے ہیں۔ اور یہی قومیت اسلامی کو برباد کرتے ہیں۔ ان تحریکات سے خدا نوان کو مطلوب ہی نہیں۔ مگر جس قومیت کا یہ رات دن رونا روتے ہیں۔ اس کی بھی جڑیں اکھاڑ رہے ہیں۔ قومیت کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے۔ کہ اپنی قوم کو دوسروں سے مستغنی ثابت کرو۔ خود محتاج نہ بنو۔ دوسروں کو اپنا محتاج بناؤ۔ اپنی تعلیم کے مقابلہ میں کسی کی تعلیم کو ترجیح نہ دو۔ اور ثابت کر دکھاؤ۔ کہ اسلامی تعلیم سے بہتر کوئی تعلیم نہیں۔ نیز اپنے علمار کے سامنے دنیا بھر کے عقلار کو پست اور نیچا دکھا دو۔ اور اس کے لئے کچھ تم کو کرنا نہیں پڑے گا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ کہ الحمدللہ اسلام میں وہ لوگ موجود ہیں جن کے سامنے دنیا بھر کے سیاست دان طفل مکتب ہیں۔ قرآن و حدیث کے برابر سیاسی اور تمدنی تعلیم کونسی کتاب میں ہے۔ ذرا کوئی لاکر تو دکھائے۔ پھر جو لوگ قرآن و حدیث کے حقیقی طور پر سمجھنے والے ہیں۔ اُن کے برابر کوئی بھی عاقل یا سیاست دان ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بخدا ہرگز نہیں۔ مگر یہ ساری خرابی ان علمار کی ہے۔ جو ہر بات میں ان لیڈروں کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور لیڈروں کی طرح خود بھی کافروں کی سیاست دانی کے معتقد ہیں۔ اُن کی علانیہ مدح کرتے اور ممبر پر بیٹھ کر وعظوں میں تعظیم سے اُن کا نام لیتے ہیں۔ اور یہ وہ علمار ہیں۔ جنہوں نے کسی صاحب دل کی جوتیاں سیدھی نہیں کیں۔ محض کتاب پڑھکر عالم ہو گئے ہیں۔ مگر ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند		نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(محاسن اسلام صـ۳۴ تا ۳۷)

چنانچہ بعض نام نہاد علماء ہندوؤں کے ساتھ ان تحریکات میں شریک ہوئے ہیں۔ اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اپنی روش پر چلنے سے تو کچھ زیادہ قدر نہیں ہوتی۔ نہ زیادہ دولت ملتی ہے۔ لاؤ وہی طریقہ اختیار کریں جو ہندوؤں نے اختیار کیا ہے۔ شاید اس طرح کچھ زیادہ وقعت مل جائے۔ اور اگر اُنہوں نے سوراج لے لیا تو اس میں ہمارا بھی حصہ رہے گا۔ اگر ہم الگ رہے۔ تو بالکل محروم رہیں گے۔ افسوس! مسلمان ہو کر غیر پر نظر۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ ان لوگوں نے یہ نہ خیال کیا۔ کہ جو طریقہ کفار کیلئے حصول عزت کا ہے مسلمان کیلئے وہ طریقہ نہیں ہے۔ مسلمان کبھی دوسری قوموں کا اتباع کر کے ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ مسلمان ہے۔ مسلمان کی ساری عزت اسی میں ہے۔ کہ وہ اپنے طریقہ پر قایم رہے۔ اور کسی حال میں احکام شریعت سے تجاوز نہ کرے۔ اسی سے فلاح ہوتی ہے۔ گو سامان کم ہو اور اس کے خلاف میں فلاح نہیں۔ گو سامان زیادہ ہو دیکھئے اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوئی۔ مدینے میں پہنچکر اجازت ہوئی۔ اسکی کیا وجہ ہے۔ ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں۔ کہ قلت جماعت و قلت اسباب اس کا سبب تھا۔ یہ خلاف تحقیق ہے۔ کیونکہ مدینہ ہی میں پہنچکر کیا جماعت بڑھ گئی تھی کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی جماعت تمام عرب کے مقابلہ میں کیا چیز تھی۔ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلہ میں یہ اجازت ہوئی تھی۔ تب تو مدینہ کیا سارا عرب بھی قلیل تھا۔ اسی طرح مدینہ پہنچکر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی۔ کفار ہمیشہ نہایت ساز و سامان سے مقابلہ کرتے تھے۔ اور مسلمانان مدینہ کی یہ حالت تھی کہ بعض مواقع میں ایک ایک سواری میں سات آٹھ آدمی شریک ہوتے تھے۔ بعض دفعہ چند آدمیوں میں ایک ہتیار مشترک ہوتا تھا۔ پس یہ کہنا

بالکل واقع کے خلاف ہے۔ کہ مدینہ میں جاکر جماعت وسامان کی زیادت اس
اجازت کا سبب ہوئی۔ نصوص سے خود معلوم ہوتا ہی۔ کہ مسلمانوں کی جماعت
کفار کے مقابلہ میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی۔ کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا
تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وانزل جنودا لم تروھا۔ اور ارشاد ہے بلیٰ ان تصبروا
وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ آلاف من الملئکۃ
مسومین اور یہ صورت نزول ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی۔ مگر پھر بھی اس
صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی۔ تو اسکی کوئی اور وجہ بتلانی چاہیے
اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ
تھی کہ مکہ میں عام مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ۔ اخلاص وصبر وتقویٰ وغیرہ
کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے۔ اُس وقت اگر اجازت قتال کی ہو جاتی۔ تو سارا
مقابلہ جوش غضب وانتقام للنفس کیلیے ہوتا۔ محض اخلاق واعلاء کلمۃ اللہ کیلیے
نہ ہوتا۔ اور اس حالت میں وہ اس قابل نہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی
امداد کی جائے اور حمایت الٰہی اُن کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں بلیٰ
ان تصبروا وتتقوا کی شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الٰہی اُس وقت متوجہ ہوتی
ہے۔ جبکہ مسلمان صبر وتقویٰ میں راسخ ہوں۔ اور تقویٰ کے معنی ہیں احتراز عما
نھی اللہ عنہ۔ وامتثال ما امر بہ۔ جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء و
عن شائبۃ النفس بھی داخل ہے۔ اور مدینہ میں پہنچکر یہ اخلاق راسخ ہو گئے تھے
مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذار پر صبر کرنے سے نفس کی
مقاومت سہل ہو گئی۔ نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی
پھر ہجرت کے وقت جب اُنھوں نے اپنے وطن واہل وعیال ومال ودولت
سب پر خاک ڈالدی تو ان کی محبت الٰہی کامل ہو گئی۔ اور محبت دنیا اُن کے
قلب سے بالکل نکل گئی۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا
اُس سے اُن کے قلوب بھی محبت الٰہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک ہو گئے

تھے - چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک کرنا چاہا - بلکہ بعض صحابہ نے تو یہاں تک کیا کہ ایک مہاجر صحابی سے کہا کہ تم میرے بھائی ہو گئے ہو - اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تمام مال آدھوں آدھ تقسیم کر کے نصف خود لیلوں اور نصف تم کو دیدوں - اور میرے پاس دو بیبیاں ہیں - ان میں سے جونسی تم کو پسند ہو میں اُسے طلاق دیکر ابھی الگ کر دوں - عدت گذرنے کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا - مہاجر نے ان کو دعا دی کہ خدا تمہارے مال و عیال میں برکت دے - مجھے اسکی ضرورت نہیں - تم مجھے بازار کا رستہ بتادو میں تجارت کر کے اپنا گذر کرونگا - غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اُترے - اس کے بعد ان کو اجازت قتال دیگئی کہ اب جو کچھ کریں گے - محض خدا کے لئے کریں گے اُس وقت یہ اس قابل ہوں گے - کہ حمایت الٰہی اُن کا ساتھ دے - اور ملائکہ رحمت اُن کی مدد کریں - چنانچہ حضرات صحابہ کے واقعات اسپر شاہد ہیں - کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے - حتیٰ کہ مثنوی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کو معرکہ قتال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا - مرتا کیا نہ کرتا - اس کمبخت نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوکا - اب چاہیے تھا - کہ حضرت علی اسکو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے - مگر تھوکنے کے بعد آپ فوراً اسکے سینہ پر سے کھڑے ہو گئے اور فوراً اُسے چھوڑ دیا - وہ یہودی بڑا متعجب ہوا - کہ میری اس حرکت کے بعد تو ان کو چاہیئے تھا - کہ مجھے کسی طرح جیتا نہ چھوڑتے - مگر اُنہوں نے برعکس معاملہ کیا - آخر اس سے نہ رہا گیا - اور حضرت علی سے اس کی وجہ پوچھی کہ آپ نے اگر مجھکو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا - تو تھوکنے کے بعد کیوں رہا کر دیا - اس فعل سے نہ میرا کفر زائل ہوا - نہ عداوت سابقہ ختم ہوئی - بلکہ اور زیادہ ہو گئی تھی - حضرت علی نے فرمایا - کہ واقعی اس فعل کے بعد میرا رہا کر دینا بظاہر عجیب ہے - مگر بات یہ ہے کہ اوّل جب میں نے تجھپر حملہ کیا

تو اُس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا اور جب تو نے میرے اوپر تھوکا۔ تو مجھے غصہ اور جوش انتقام پیدا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہوگا۔ بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہوگی۔ اور میں نے نہ چاہا کہ نفس کیلئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کروں۔ اس لئے تجھے رہا کر دیا۔ وہ یہودی یہ سُنکر فوراً مسلمان ہوگیا۔ اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب حق ہے جس میں شرک سے اس درجہ نفرت دلائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کیلئے نہ کرو۔ بلکہ محض خدا کیلئے ہر کام کرو۔ دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے۔ اب ہماری حالت یہ ہے۔ کہ جو لوگ خدمت اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کیواسطے کام کرتے ہیں اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اُچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں۔ احکام الٰہی کی پروا نہیں کرتے۔ بس ان کا مقصود یہ ہے۔ کہ کام ہونا چاہیئے خواہ شریعت کیموافق ہو۔ یا مخالف۔ چندہ میں جائز و ناجائز کی پروا نہیں۔ صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں۔ پھر حمایت الٰہی اُن کے ساتھ کیونکر ہو۔ بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے۔ کہ میاں مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو۔ اس وقت تو کام کرنا چاہیئے۔ بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جاویں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے۔ نہ اُخروی اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے۔ جس کا یہاں صفر ہے ہمارے بزرگانِ دین جو بحمد اللہ اب بھی موجود ہیں۔ وہ محض خدا کے واسطے کام کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی کام میں شریعت سے ایک انچ بھی بڑھنا نہیں چاہتے۔ اسی طرح جو ان حضرات کے صحبت یافتہ ہیں۔ وہ بھی نفس کیلئے کام نہیں کرتے۔ (ایضاً صفحہ ۳۸ تا ۴۱)

اور جن کو خدا کے ساتھ یہ تعلق حاصل نہیں۔ اُن کی یہ حالت ہے کہ آج اُن کے کچھ فتوے ہیں۔ اور کل کو جہاں اغراض بدلیں۔ ساتھ کے ساتھ اُن کے فتوے بھی بدل گئے سارے یہ کیا قصہ ہے۔ یہ کیسا اسلام ہے۔ جو اغراض کے تابع ہے مسلمان کو

تو ایسا ہونا چاہیئے۔ ع یکے خوان و یکے دان و یکے گو۔ مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ اُس ذات کے ساتھ علاقہ رکھے۔ جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور اغراض فانیہ کی نفی کرنی چاہیئے۔ اور اُن کے متعلق لا احب الآفلین کہدینا چاہیئے۔

خلیل آسا در ملک یقین زن	صدائے لا احب الآفلیں زن

پہلے سب علمار کا فتویٰ تہا۔ کہ ریل میں بدون ٹکٹ کے سفر کرنا حرام ہے مگر اب یہ حالت ہی۔ کہ اس کو جائز کر دیا گیا۔ بہت لوگ جو علمار و طلبار کہلاتے ہیں بے ٹکٹ کے سفر کرنے لگے۔ میرے پاس ایک طالب علم کا خط آیا کہ میں بدون ٹکٹ کے ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتا ہوں۔ اور میرے باپ اس سے منع کرتے ہیں۔ اُنکے باپ انگریزی خواں دنیادار تھے۔ اللہ اکبر! کبھی وہ زمانہ تھا۔ کہ عربی خواں اس سے منع کرتے تہے اور انگریزی خواں جائز کہتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ عربی خواں جائز کہتا ہی اور انگریزی خواں منع کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ انگریزی دان کسی دانا (یعنی عارف) کا ذبح کیا ہوا تہا۔ (ایضاً صا۴۴)

اسی طرح اللہ کا ہو رہے۔ تب اسلام کامل ہوتا ہے۔ ورنہ وقت پر سب لکھا پڑھا غائب ہو جاتا ہے۔ صاحبو! بدون صحبت اہل اللہ کے توحید بھی کامل نہیں ہوتی۔ کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی سے خوف و طمع نہ ہو

موحد چہ بر پائے ریزی زرش	چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
اُمید و ہراسش نباشد ز کس	ہمین است بنیاد توحید و بس

مگر ہماری یہ حالت ہی۔ کہ ہم اسلام کے درجۂ ناقص پر کفایت کرتے ہیں۔ اس کی تکمیل کی فکر نہیں کرتے۔ نہ نماز کی فکر ہے۔ نہ روزہ کی۔ پس ہمکو تکمیل اسلام کی فکر کرنا چاہیئے۔ اسلام کامل یہ ہے۔ کہ انسان پورا اللہ والا ہو جاوے۔ جس کا ایک شعبہ یہ ہے۔ کہ دین کو دنیا اور اغراض کے تابع نہ بنایا جاوے۔ اس وقت

دین کی فہم حاصل ہو گی۔ اور جس کے اوپر اغراض نفسانی کا غلبہ ہو گا۔ اُسے دین کی سمجھ حاصل نہ ہو گی۔ ایسے ہی علماء کا یہ خیال ہے۔ کہ ذبیحہ گاؤ شعار اسلام نہیں۔ (ایضاً صـ۴۵)

آجکل ایسے بھی مسلمان ہیں۔ جو تبلیغ کے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑ دو۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد میں فرق آتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کے یہاں اب ہندوؤں سے اتحاد ہی چلا جا رہا ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ اتحاد تو جانبین سے ہوا کرتا ہے۔ مگر ان کا اتحاد یک طرفی ہے۔ کہ ہندو تو اُن کی ذرا سی بھی رعایت نہیں کرتے۔ جہاں ان کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کو مرتد کر لیتے ہیں۔ آبرو ریزی یا جان و مال کے درپے ہو جاتے ہیں۔ مگر ان حضرت کا اتحاد اب بھی باقی ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے۔ کہ جب مسلمانوں کو ہندو مرتد بنا رہے ہیں۔ تو کیا مسلمانوں کو مرتد ہونے دیا جائے۔ ان کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی جائے اگر اُن کی یہی رائے ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ چاہے ایمان جاتا رہے۔ مگر اتحاد نہ جاوے۔ تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے۔ جس کے واسطے ایمان و اسلام کی بھی پروا نہ رہے۔ جن صاحبوں کی یہ رائے ہو۔ وہ خود تبلیغ نہ کریں۔ مگر جو لوگ یہ کام کرنا چاہتے ہیں اُن کو یہ کس لئے روکتے ہیں (ایضاً صـ۵۵)

اور تماشا یہ ہے کہ آجکل جو یہ تحریک انسداد فتنۂ ارتداد چل رہی ہے۔ اسکے متعلق ایسے بعض علماء نے ایک اشتہار میں شائع کیا ہے۔ کہ یہ تحریک چونکہ خالص مذہبی تحریک ہے۔ اس لئے اس میں ہر طبقہ کو شریک ہونا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں۔ اس میں غیر مذہب کا بھی دخل تھا۔ دل میں تو ان تحریکات کی حقیقت کو سمجھ ہی رہے تھے۔ مگر الحمد للہ برسوں کے بعد اب زبان سے بھی اقرار کر لیا کہ یہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں۔ پھر نہ معلوم ان میں شرکت نہ کرنیوالوں کو کافر و فاسق کیوں بنایا گیا۔ یقیناً جو امر مذہب و غیر مذہب سے مرکب ہو گا وہ فرض واجب کبھی نہیں ہو سکتا۔

مگر ستم ہی کہ ان لوگوں نے تحریکات سابقہ کی شرکت کو فرض وواجب بنا رکھا تھا۔ صاحبو! مذہب میں بھی سیاسیات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر وہ سب مذہب کے تابع ہے۔ اور وہ سیاسیات خالص مذہبی سیاسیات ہیں۔ انہیں غیر مذہب کا دخل ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اگر ان حضرات کے نزدیک پہلی تحریکات مذہبی سیاسیات میں داخل نہیں۔ تو اُن کے اس قول کا کیا مطلب ہی۔ کہ تحریک انسداد ارتداد خالص مذہبی تحریک ہے۔ اس میں سب کو شریک ہونا چاہیے اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں۔ تو پھر وہ مذہبی سیاسیات میں داخل نہ تھیں۔ (ایضاً صـ ۶۴)

(۵۳) سلطنت خود مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصود رضاء حق ہے

آجکل جو عوام حکومت کے مقابلہ میں بہادر بنے ہوئے ہیں۔ اس کا راز یہ ہی کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کو پوچھتا کون ہے۔ ہاں جو لوگ مشہور ہیں ان کا حکومت سے مقابلہ کرنا بیشک بہادری ہے۔ کیونکہ ان کو ہر وقت اپنے اوپر خطرہ ہے گو اس سے بحث نہیں کہ یہ بہادری جائز ہے یا حرام۔ اور یہ دینی شجاعت ہے۔ یا نفسانی تہور۔ اس کو علماء سے پوچھو۔ مگر صاف بات یہ ہے۔ کہ علماء بھی سب نہیں ہیں۔ بلکہ علماء حقیقت میں صرف وہ ہیں۔ جو لیڈروں کے تابع نہوں۔ حکم شرعی کے تابع ہوں۔ اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہیں اُنکی حالت یہ ہے۔ کہ واللہ اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں۔ تو یہ علماء بھی اُدھر ہی ہو جائیں۔ مگر ہیں عقلمند کہ فوراً اپنے فتوے کو نہ بدلیں گے۔ کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہو جائیگا۔ کہ اُن کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستہ پر آجائیں گے۔ آجکل علماء لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں یا تو اس لئے کہ اُن سے علیحدگی میں زوال جاہ کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ

مشاہدہ ہے۔ کہ جو علماء اُن کے ساتھ نہیں ہیں۔ ان کو عوام نے کیسا بدنام کیا اور کتنا بُرا بھلا کہا۔ یا روپے کی طمع سے اُن کے ساتھ ہیں۔ کہ اگر ہمنے ان تحریکات میں شرکت نہ کی تو مدرسہ کا چندہ بند ہو جائے گا۔ کوئی مدرسہ کی اعانت نہ کرے گا۔ ایک عالم نے مجھے لکھا تھا۔ کہ ان تحریکات سے علحدگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ ہونا کافی ہے اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ لعنت ہے ایسے مال وجاہ پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو۔ مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہیئے۔ کہ رضائے الٰہی کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہ ہو۔ اگر مخلوق اس کو پاگل بنا کر چھوڑ دے۔ مگر خدا راضی ہو۔ تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے۔ اگر وہ پاگل بھی ہے۔ تو کس کا پاگل ہے۔ ؎

ما اگر قلاشں و گر دیوانہ ایم	مست آں ساقی و آن پیمانہ ایم

اُس کے نزدیک جو خدا کا دیوانہ نہو وہ خود دیوانہ ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد	مرعسس را دید و در خانہ نشد

مگر ان کی دیوانگی بے عقل کی دیوانگی .... نہیں۔ بلکہ مستی عقل سے ان پر ایک نشہ سوار ہے۔ یہ وہ دیوانگی ہے جس پر ہزار عقلیں قربان ہیں ؎

او گل سرخ ست تو خوش مخواں	مست عقل ست او تو مجنونش مخواں

کوئی تو اس لئے نیند میں پڑا سو رہا ہے کہ روٹی نہیں ملی۔ فاقہ گذر رہا ہے۔ اور یہ اس لئے نیند میں ہے کہ کھا بہت گیا ہے۔ بہت کھانے سے بھی نیند آیا کرتی ہے۔ اسی طرح کوئی تو اس لئے مجنوں ہے کہ اس کے پاس عقل نہیں اور کوئی اس لئے مجنوں ہے کہ غلبۂ عقل سے مست ہو گیا ہے۔ یہ لوگ مصالح کو مصالحہ کی طرح پیس ڈالتے ہیں۔ اُن کی بڑی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ ایک کو راضی کر لیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار	بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

یاد رکھو سلطنت مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے۔ اگر ہم سے خدا راضی نہو۔ تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں۔ اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی۔ تو فرعون و ہامان و نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں۔ حالانکہ وہ مردود ہیں۔ معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو۔ اور جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو۔ وہ وبال جان ہے۔ اگر ہم سے خدا راضی ہو۔ تو ہم پاخانہ اُٹھانے پر بھی راضی ہیں۔ اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادہم کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے۔ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی۔ پھر کیوں چھوڑی۔ محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں۔ بلکہ مقصود دوسری چیز ہے۔ کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے۔ تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم ہر فن کے امام ہیں۔ حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں۔ اور فقہاء میں فقیہ۔ اور صوفیہ میں تو امام ہیں۔ ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا۔ جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔ پھر دیکھ تو اُنہوں نے کیا کیا۔ جب رضائے حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا۔ تو بادشاہت پر لات مار کر الگ ہوگئے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی۔ تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کیلئے مضر مقصود تھی تو اُن کیلئے حکم ہے لاتلین مال یتیم ولا تقضین بین اثنین۔ اس سے صاف معلوم ہوا۔ کہ سلطنت خود مقصود نہیں۔ بلکہ مقصود رضائے حق ہے۔ اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو۔ تو اس وقت اس سے منع کیا جائیگا۔ حضرت ابوذر تو اتباع احکام کا ارادہ بھی کرتے تھے۔ ان کو جب بھی قضا رد

حکومت کی اجازت نہ دی گئی۔ اور تم تو اتباع احکام کا بھی قصد نہیں کرتے۔
اس حال میں تم کو کیونکر اجازت دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ جو لوگ ابھی
تھوڑا زمانہ ہوا۔ پنچایت میں مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اُن کے کتنے فیصلے
شریعت کیموافق ہوتے تھے۔ اور وہ خود اتباع احکام کتنا کرتے تھے۔ حالت
یہ تھی کہ خود لوگوں کے حقوق دبائے ہوئے ہیں۔ اور پنچایت میں فیصلے کر رہے
ہیں۔ جن میں اکثر فیصلے خلاف شریعت ہوتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو سلطنت
مل جاتی۔ تو مخلوق کو کچا کھا جاتے۔ تو کیا تم یہ چاہتے ہو۔ کہ خدا تعالیٰ اس ظلم کی
حالت میں تم کو سلطنت دیدیں گے۔ ارے اگر تم بادشاہ بن جاتے۔ تو نہ معلوم
مخلوق کا کیا حال ہوتا۔ بڑی خیر ہوئی کہ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہ دیئے۔ اتنا
ہی فرق دیکھ لو۔ اپنے میں اور ان لوگوں میں جن کو خدا نے سلطنت دے رکھی ہے
کہ تم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ اور اہل سلطنت نے تمہارے
ساتھ باوجود تمہاری اس مخالفت کے کیا برتاؤ کیا۔ اگر تم بادشاہ ہوتے۔ اور
اس وقت تمہارے ساتھ کوئی اس طرح مقابلہ سے پیش آتا۔ جیسا تم اس وقت
سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو۔ تو نہ معلوم تم کتنوں کو پھانسی پر لٹکاتے
اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ تم صرف سلطنت کو مقصود سمجھتے ہو۔ رضائے
حق کو مقصود نہیں سمجھتے ہو۔ اس لئے تم کو خلاف شرع اقوال و افعال سے
ذرا باک نہیں۔ (تقلیل الاختلاط۔ مع الانام ص۶۲ تا ۶۳)

(۵۴) تشبہ بالکفار امور مذہبیہ میں حرام ہے

میں ایجادات یورپ سے انتفاع کو منع نہیں کرتا۔ ہاں تشبہ اور کورانہ تقلید
سے منع کرتا ہوں۔ اور تشبہ بالکفار جو شریعت میں حرام ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے
کہ تشبہ بالکفار امور مذہبیہ میں تو حرام ہے اور شعار قومی میں مکروہ تحریمی ہے باقی
ایجادات و انتظامات میں جائز ہے۔ وہ درحقیقت تشبہ ہی نہیں بعض لوگ ان

احکام کو شریعت سے خارج سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس مضمون کو بیان کر دیا۔ اور بتلا دیا کہ شعار قومی میں بھی تشبہ حرام ہے۔ گو قسم اوّل کے درجے میں نہ ہو۔ مگر پیشاب و پاخانہ میں فرق ہونیسے کیا کوئی پیشاب پینا گوارا کر لیگا۔ ہرگز نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمنے کوٹ پتلون پہنکر ٹوپی تو اسلامی پہن لی ہے۔ اب تشبہ کہاں رہا۔ میں کہتا ہوں۔ تشبہ کامل نہ سہی ناقص تو ہوا۔ اگر آپ ایسا کر سکیں۔ کہ سارا لباس زنانہ پہنکر اوپر سے مردانہ ٹوپی پہن لیں اور اسی حلیہ سے محفل میں جا سکیں۔ تو ہم آپ کو اسلامی ٹوپی اور کفری پاجامہ کی بھی اجازت دیدیں گے۔ صاحبو! مشتبہ صورت بھی ممنوع ہے۔ ہمارے یہاں ایک طالب علم کنوئیں کے پاس پاجامہ دھو رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ پاجامہ پاک ہے یا ناپاک۔ کہا مشتبہ ہے۔ میں نے کہا پھر تم اس کو کنوئیں کے پاس دھوتے ہو۔ اور یہی ہاتھ ڈول رسی کو لگاتے ہو۔ جس سے سارا کنواں مشتبہ ہو جائیگا تم خانقاہ سے نکلو۔ تم کو ہدایہ پڑھ کر بھی پاکی ناپاکی کا خیال نہیں۔ کہنے لگے مجھے عقل نہیں۔ میں نے کہا۔ اس جواب سے جرم کی تو نفی ہو گئی۔ مگر ضرورت اخراج کی نفی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اخراج کیلئے یہ ضرور نہیں۔ کہ جرم ہی پر اخراج ہو۔ بلکہ کم عقلی بھی موجب اخراج ہی۔ غرض ان کو خانقاہ سے نکال دیا گیا۔ تو آپ نے دیکھا کہ مشتبہ پاجامہ کو ناپاک ہی کا حکم دیا گیا۔ جیسے ناپاک کپڑوں کا دھونا کنوئیں کے پاس جرم ہی۔ ایسے ہی مشتبہ کپڑے کا دھونا بھی جرم ہے۔ اس طرح آپ اس کو سمجھ لیجئے۔ کہ اسلامی ٹوپی اور کفری پاجامہ پہننے سے گو آپ بالکل ناپاک تو نہ ہونگے مگر مشتبہ تو ہو جاویں گے۔ اور اسلام نے مشتبہ صورت سے بھی منع کیا ہے۔ صاحبو! کیا یہ حیرت نہیں ہی۔ کہ ایک برطانوی جرنیل کو تو یہ حق ہو کہ وہ جرمنی وردی کو جرم قرار دیدے۔ کیونکہ وہ برطانیہ کا دشمن ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق نہو کہ آپ دشمنانِ خدا کی وضع کو جرم قرار دیں۔ مگر اسلام میں تعصب نہیں۔ چنانچہ تشبہ بالکفار کے مسئلہ میں شریعت نے تفصیل کی ہے۔ کہ جو چیز

کفار ہی کے پاس ہو۔ اور مسلمانوں کے یہاں اُس کا بدل نہو۔ اور وہ شے کفا کی شعار قومی یا امر مذہبی نہ ہو۔ تو اس کا اختیار کرنا جائز ہے۔ جیسے بندوق۔ توپ ہوائی جہاز۔ موٹر وغیرہ۔ چنانچہ ایک بزرگ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے دست مبارک میں بندوق ہی اور آپ اسکی طرف اشارہ کر کے فرمارہے ہیں۔ نعم السلاح کہ یہ بہت اچھا ہتیار ہی۔ میں اس خواب سے استدلال نہیں کرتا۔ صرف تائیداً بیان کردیا۔ ورنہ اصل استدلال قواعد فقہیہ سے ہی۔ اور اس قاعدہ کی بنا پر نہ ہم ایجادات سے منع کرتے ہیں۔ اور نہ ایجادات یورپ کے استعمال سے منع کرتے ہیں۔ گو اسلام میں ایجادات کی تعلیم بھی نہیں ہی۔ اور یہ اسلام کا کمال ہے۔ کہ اس میں صرف مقاصد کی تعلیم ہے۔ غیر مقاصد کی تعلیم نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہی جیسے بی۔ اے کے اسکول میں جوتہ بنانے کی تعلیم نہیں ہوتی۔ اور یہ اس کیلئے نقص نہیں۔ بلکہ کمال ہے۔ اور اگر اسکول میں بی۔ اے کیساتھ جوتہ سینے اور پاخانہ کمانے کی بھی تعلیم دی جاتی ہو۔ تو یہ اُس کے لئے نقص ہوگا۔ کمال نہ ہوگا۔ حکیم محمود خاں کا یہ کمال تھا کہ وہ جوتہ بنانے کی ترکیب نہیں سکھلاتے تھے۔ ہاں یہ بتلاتے تھے کہ جوتہ اس طرح مت سلواؤ کہ اس کی منجیں اُبھری ہوئی ہوں۔ جس سے پیر زخمی ہو جاوے۔ اسی طرح اسلام ایجادات نہیں سکھلاتا۔ ہاں یہ سکھلاتا ہے کہ کسی ایجاد کو اس طرح نہ اختیار کرو جس سے دین میں خلل ہو۔ یا جان کا خطرہ ہو۔ اسی طرح یہ تبلاتا ہی۔ کہ بے ضرورت ایجادات کے درپے ہو کر ضروری کاموں کو ضائع نہ کرو۔ اور ضروری ایجادات میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ موہوم منفعت کیلئے خطرہ توبہ کا تحمل نہ کرو۔ غرض اصول تو ہر ایجاد کے متعلق تبلا دیے ہیں۔ مگر ان کی ترکیب نہیں تبلائی۔ کیونکہ یہ مقصود اسلام سے الگ ہیں۔ اور کمال اسی کا نام ہے کہ مقصود سے تجاوز نہ کیا جاوے۔ یہ تو ایجادات کا حکم تھا جن کا بدل مسلمانوں کے یہاں نہیں ہے۔ اور جو ایجاد ایسی ہو جس کا بدل مسلمانوں کے یہاں بھی موجود ہے اس میں تشبہ مکروہ ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فارسی کمان کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ کہ اس کا بدل مسلمانوں کے پاس عربی کمان موجود تھی۔ اور دونوں کی منفعت برابر تھی۔ صرف ساخت کا فرق تھا۔ غرض اسلام میں تعصب نہیں۔ جیسا کہ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ ہاں اسلام میں غیرت ہے۔ کہ جو چیز مسلمانوں کے پاس بھی ہے۔ اور کفار کے پاس بھی ہے صرف وضع قطع کا فرق ہی۔ اس میں اسلام نے تشبہ بالکفار سے منع کیا ہے۔ کہ اسمیں علاوہ گناہ کے ایک بے غیرتی بھی تو ہے کہ بلاوجہ اپنے کو دوسری قوموں کا محتاج ظاہر کیا جاوے۔ مگر آجکل مسلمانوں میں غیرت نہیں رہی۔ کہ یہ اپنے گھر سے بیخبر ہو کر بلکہ یوں کہئے۔ کہ اپنے گھر کو آگ لگا کر دوسروں کی عادات و معاشرت کا اتباع کرنے لگے۔ بس ان کی مثال ایسی ہے۔ جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎ یک سبد پر نان ترا بر فرق سر + تو ہمی جوئی لب ناں در بدر + تا بزانوئی میان قعر آب + وز عطش وز جوع گشتی خراب چنانچہ آجکل بے پردگی میں بھی مسلمان یوروپ کی تقلید کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ یوروپ والے عورتوں کی آزادی سے خود بہت گھبرا گئے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات دینا چاہتے ہیں۔ یہ سبق بھی یوروپ ہی سے سیکھا ہے۔ اور یوروپ والے اس سے بھی گھبرا گئے ہیں۔ کیونکہ عورتوں نے ناطقہ بند کر دیا ہے اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہو گا۔ کہ اہل یوروپ کو عورتوں نے کیسا پریشان کر رکھا ہے۔

صاحبو! اسلام کی تعلیم کی قدر کرو۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے۔ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ ط یعنی حقوق میں تو عورتیں مردوں کے مساوی ہیں۔ مگر درجہ میں مرد بڑھے ہوئے ہیں۔ جس کو دوسرے مقام پر صاف طور سے بیان فرما دیا ہے۔ الرجال قوامون علی النسا بما فضل اللہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم۔ کہ مرد عورتوں پر سردار ہیں۔ کیونکہ خدا نے ان کو فضیلت دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی امام نہیں بن سکتیں نہ ان پر حکومت کر سکتی ہیں۔ وللرجال علیھن درجۃ کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔ واللہ عزیز حکیم۔ کہ اللہ زبردست ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو مرد و عورت دونوں کو برابر کر دیتے۔

مگروہ حکیم بھی ہیں۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے۔ کہ برابر نہوں۔ اگر عورتوں کو آزادی دے دیجائے۔ تو پھر اُن کی آزادی کی روک تھام بہت دشوار ہوگی۔ جیسا کہ اہل یورپ کو دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ کیونکہ اوّل تو آزادی کی روک تھام عقل سے ہوتی ہے۔ اور عورتوں میں عقل نہیں۔ ان کا ناقص العقل ہونا مشاہد ہے۔ دوسرے طبعی قاعدہ ہے کہ جو قوت ایک زمانہ تک بند رہی ہو۔ جب اس کو آزادی ملتی ہے۔ تو ایک دم سے اُبل پڑتی ہے۔ جیسے امریکہ والے ایک عرصہ تک جاہل رہے ہے۔ جب ان کو تعلیم حاصل ہوئی۔ تو ایک دم سے ایسے اُبل پڑے کہ اپنے اُستاد سے بھی آگے بڑھ گئے اس قاعدے کی بناء پر ہندوستان کی عورتوں کو بلکہ مسلمانوں کی عورتوں کو تو ہرگز آزادی دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ ابتک تو وہ قید میں رہیں۔ اگر ان کو آزادی مل گئی تو یقیناً ایک دم سے اُبل پڑیں گی۔ غرض اسلام میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات تو نہیں ہے۔ مگر حقوق کی اس قدر رعایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ مسابقت کی ہے (الحدود و القیود ص ۱۹ تا ۲۲

(۵۵) آجکل مسلمانوں کی دوسری قوموں کا مال و متاع دیکھکر رال ٹپکتی ہی

آجکل مسلمانوں کی رال ٹپکتی ہے دوسری قوموں کے سامان عیش دیکھ کر۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے۔ کہ خیر اور سلامتی اسی میں ہے۔ کہ ان کو دنیا زیادہ نہ ملے۔ اگر ہمکو زیادہ مال دیا جاتا تو رات دن دنیا ہی کی فکر میں رہتے۔ آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔ کانپور میں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سا ڈھیلا رومال سے ڈھک کر بیٹھے اور رات بھر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ اس کو سونا بنا دے۔ وعظ میں کسی مولوی سے سن گئے تھے کہ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ وہ ظالم یہ دعا کرنے بیٹھے۔ صبح کو خوشی خوشی جو رومال کھولا تو وہ ڈھیلا کا ڈھیلا ہی تھا۔ بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دعا کیوں نہ قبول ہوئی۔ ایک درزی نے کہا کہ اللہ میاں حکیم ہیں۔ وہی دعا قبول فرماتے ہیں جو بندے کیلئے مصلحت ہو۔ خدا کا شکر کرو کہ یہ سونا نہ بنا ورنہ تم آپس میں ہی

مرکٹ جاتے۔ واقعی سچ کہا۔ بعض لوگوں کے لیئے یہی حکمت ہے۔ کہ ان کو سامان عیش زیادہ نہ دیا جاوے۔ اس پر شاید ان کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں۔ تو خوب نیک کام کریں۔ اور اللہ تعالےٰ کے راستہ میں خوب خرچ کریں۔ تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم کو کیا خبر ہے کہ اس وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں۔ زیادہ مال ملنے کے بعد بھی باقی رہیں گی۔ یا نہیں۔ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ حضرات صحابہ سے بڑھکر خوش نیت کون ہوگا۔ مگر حدیث میں آتا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا۔ کہ تمہاری کیا حالت ہوگی۔ جبکہ میرے بعد ممالک وبلاد مفتوح ہونگے۔ اور تمہارے پاس کثرت سے مال ومتاع اور غلام وخادم ہونگے۔ صحابہ نے کہا۔ یا رسول اللہ اُس وقت ہم اللہ کی عبادت کیواسطے فارغ ہو جائیں گے۔ نتفرغ للعبادة ونکفی المؤنة۔ حضور نے فرمایا نہیں تمہاری یہی حالت اچھی ہے۔ جو آجکل ہے۔ جب حضور نے صحابہ کے لئے زیادہ مال کو پسند نہیں کیا۔ حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ ترقی کی اور دنیا میں منہمک نہیں ہوئے۔ پھر ہمارے لئے کثرت مال کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔ بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر رال نہ ٹپکانا چاہیئے۔ اولئك عجلت لهم طيباتهم في حياتهم الدنيا۔ ان کو سب راحت یہیں دیدی گئی۔ اور مسلمانوں کے واسطے راحت جنت میں ہے۔ پس مسلمان کو اتنی دنیا حاصل کرنا چاہیئے۔ کہ پیٹ بھر کر روٹی مل جائے۔ اور ستر عورت کے لیئے کپڑا اور رہنے کو مختصر مکان اور اتنا بحمد اللہ اکثر مسلمانوں کو آجکل حاصل ہے۔ حضور کے زمانہ میں تو صحابہ کو اتنا بھی سامان میسر نہ تھا۔ ہم لوگ تو اُس زمانہ کے اعتبار سے آجکل بادشاہ ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے من اصبح معافی فی جسده آمنا فی سربه عنده قوت یومه فکانما حیزت له الدنیا بحذافیرها۔ کہ جو شخص اس حالت میں صبح کرے۔ کہ بدن میں صحت ہو اور نفس میں

بے فکری ہو۔ ایک دن کا کھانا پاس ہو۔ اس کو تمام دنیا مل گئی۔ جب صحت اور اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھر میں موجود ہو تو یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھر میں آگئی اگلے دن کی فکر نہ کرو۔ ع مترس از بلائے کہ شب درمیانست۔

جس مصیبت کے درمیان میں رات حائل ہو۔ اُس سے اندیشہ نہ کرو جب کل ہوگی۔ دیکھا جاوے گا۔ کیا خبر کل کو تم بھی ہو گے یا نہیں۔ ایک بزرگ اسی کو فرماتے ہیں ؎

چوں ترا نانے و خرقانے بود ہر بن موئے تو سبکانے بود

غرض حق تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ بعض لوگوں کو غریب رکھتے ہیں اُسکو کیا خبر کہ امیر ہونے کے بعد وہ کیسا ہوتا۔ ایسے شخص کو ثواب دنیا کے لئے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرما دیتے ہیں۔ اس کے لئے یہ نیت ہی درجات عالیہ حاصل کرنے لئے کافی ہے۔ کہ اگر میرے پاس مال ہوتا۔ تو یوں خرچ کرتا۔ حق تعالیٰ کے یہاں عجیب دربار ہے۔ وہاں کچھ انفاق ہی پر مدار نہیں۔ غریب کے حق میں نیت انفاق بھی بمنزلہ انفاق کے ہے۔ خود نص میں ارشاد ہے۔ قول معروف و مغفرۃ خیر من صدقۃ یتبعھا اذیٰ واللہ غنی حلیم۔ پس جس کے پاس مال نہو۔ وہ حال اور قال سے ثواب حاصل کرے ؎

لا خیل عندک تھدیھا ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

اور جس کو خدا نے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت و ہمت کیموافق خرچ کر کے خدا کو راضی کرے (مظاہر الاموال ص۱۰)

(۵۰) انتم اعلم بامور دنیاکم سے نو تعلیم یافتہ کا غلط استدلال کہ علماء دنیاوی امور میں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں

صحابہ ایسے جان نثار تھے۔ اُنھوں نے جو حضور کا اشارہ ترک تابیر کی طرف دیکھا اُسی وقت سب نے تابیر کو چھوڑ دیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ اس سال پھل کم آیا۔ تب

حضور کو معلوم ہوا۔ کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہیں۔ بلکہ اس فعل میں طبعی خاصیت ہی۔ اور یہ طبی تدبیر ہے۔ اس لئے آیندہ کے لئے۔ آپ نے اجازت دیدی۔ اور فرمایا۔ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ کہ اپنے دنیاوی کاموں کو تم ہی زیادہ جانتے ہو۔ اس سے نو تعلیم یافتہ نے یہ مضمون نکالا ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دنیاوی امور میں بالکل دخل نہیں دیا۔ بلکہ ان کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ کہ جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کریں۔ یہ مولویوں کی زیادتی ہی۔ کہ دنیاوی معاملات میں بھی دخل دیتے ہیں۔ کہ فلاں تجارت حرام ہے۔ فلاں جائز ہے۔ اور اس طرح بیع کرنا جائز نہیں۔ اس طرح اجارہ کرنا فاسد ہے۔ وغیرہ وغیرہ میں کہتا ہوں۔ کہ اگر انتم اعلم بامور دنیاکم کا یہ مطلب ہی تو کیا قرآن کی اُن آیتوں کو جن میں ربا سود۔ اور اکل اموال بالباطل اور رشوت وغیرہ کو حرام کیا گیا ہے۔ قرآن سی نکال دوگے ؟ اور وہ ہزارہا حدیثیں بھی جن میں بیوع و اجارات و نکاح و طلاق وہبہ و میراث کے احکام مذکور ہیں۔ حدیث کی کتابوں سے نکال باہر کروگے۔ اگر ایسا نہیں کرسکتے۔ تو یہ دعوی کیونکر صحیح ہوا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی معاملات میں دخل نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ تم نے اس حدیث کا مطلب غلط سمجھا۔ بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے۔ کہ امور دنیا جو تجربہ کے متعلق ہیں۔ ان کو تم زیادہ جانتے ہو۔ باقی ان امور کے متعلق جو احکام ہیں۔ ان کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں۔ مگر چونکہ واقعہ تابیر سے کسی کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ نبی کیسے ہیں۔ جن کو حقائق اشیا کا صحیح علم حاصل نہیں۔ اس شبہ کو رفع کرنے کیلئے حضور نے یہ فرمادیا۔ انتم اعلم باامور دنیاکم۔ جس کا حاصل یہ ہی۔ کہ تجربیات کا جاننا نبی کیلئے ضروری نہیں۔ بلکہ ضروری حقائق کا علم ضروری ہے (السبر بالصبر ص۶)

(۵۷) اتفاق نہ مطلقاً محمود ہے۔ اور نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے

خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اُسی وقت مطلوب و محمود ہے۔ جبکہ دین کو مفید ہو

اور نااتفاقی جبھی مذموم ہے۔ کہ دین کو مضر ہو۔ اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نااتفاقی دین کو مفید ہو۔ تو اُس وقت وہ نااتفاقی مطلوب ہوگی۔ اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعا علیہ عدالت سے مرافعہ کرتے ہیں تو اُس وقت دونوں سے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دست بردار ہو جاؤ۔ کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نااتفاقی پیدا ہو گئی ہے۔ اور نااتفاقی مذموم ہے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہو۔ اُس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کیطرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو۔ بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دست بردار بھی ہو جائے۔ تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے۔ اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔ صاحبو! اگر نااتفاقی مطلقاً مذموم ہے۔ تو چاہیئے کہ جب کوئی دعویٰ عدالت میں دائر ہو۔ تو جج مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے۔ کیونکہ نااتفاقی کے مجرم دونوں ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اور نہ عقلاء ایسی رائے دیسکتے ہیں۔ بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں۔ کہ گو نااتفاقی دونوں طرف سے ہی۔ مگر ایک طرف سے حمایت حق کے لئے ہی۔ اور دوسری طرف سے حمایت باطل کے لئے۔ پس تفتیش و تحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اُس کی ڈگری ہونا چاہیئے۔ اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے۔ یہاں تو سب کا اتفاق ہی کہ نااتفاقی مطلقاً مذموم نہیں۔ مگر افسوس دین کے معاملہ میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں۔ کہ نااتفاقی چھوڑ دو۔ اور اتفاق پیدا کرو۔ صاحبو! آخر یہاں یہ کیوں نہیں دیکھا جاتا۔ کہ ان دونوں میں سے کس کی نااتفاقی حمایت حق کیلئے ہے۔ اور کس کی حمایت باطل کیلئے۔ پھر جو حق پر ہو اُس کا ساتھ دیا جاوے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جائے۔ اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں۔ تو بتلائیے صاحبِ حق صاحبِ باطل کے ساتھ کیونکر اتفاق کرلے۔ دونوں طرف سے اگر اتفاق ہوگا۔ تو عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ

صاحبِ حق حق کو چھوڑ دے۔ اور دونوں باطل پر ہو جائیں۔ یعنی دیندار دین کو چھوڑ کر بد دین ہو جائے۔ ایک یہ کہ دین دار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی چھوڑ دے۔ تیسری صورت یہ ہے۔ کہ کچھ تو دیندار دین کو چھوڑ دے۔ اور کچھ بد دین بد دینی کو چھوڑ دے۔ اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے۔ اب عقلاء خود فیصلہ کرلیں کہ ان میں سے کونسی صورت عقل کے مطابق ہے یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جاویگا۔ کہ دیندار تو دین پر قائم رہے۔ اور بد دین بد دینی کو چھوڑ دے۔ اور اس کا حاصل یہی ہی۔ کہ دیندار کو تو بد دین سے نااتفاقی کا حق ہے۔ مگر بد دین کو دیندار سے نااتفاقی کا حق نہیں۔ بلکہ اس کو دیندار کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیئے۔ صاحبو! یہ وہ افتراق ہے۔ جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے۔ کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے۔ آپ نے آکر اس اتفاق کو توڑ دیا۔ اور باپ بیٹوں کو باہم جدا جدا کر دیا۔ اور یہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں یا ایھا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً ویکفر عنکم سیّئاتکم اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایۂ بشارت تبلایا ہی۔ جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہی۔ اور اس لئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں۔ بلکہ کہیں جوڑتا ہی۔ اور کہیں توڑتا ہے۔ جو لوگ حق پر ہوں اُن کے ساتھ وصل کا حکم ہے۔ اور جو باطل پر ہوں اُنکے ساتھ فصل کا حکم ہی پس یہ سخت غلطی ہے۔ جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں۔ کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں۔ دونوں کو مورد ملامت بنانے لگتے ہیں۔ کہ تم کیسے مسلمان ہو۔ کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو۔ اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں۔ جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بد دین ہونا چاہیئے۔ اور صاحب حق۔ حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرے۔ اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے۔ کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو۔ تو اوّل

یہ معلوم کیا جاوے کہ حق پر کون ہے۔ اور ناحق پر کون۔ حق متعین ہو جاوے۔ تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جاوے۔ بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جاتے۔ قرآن میں اس پہ ایک جگہ نص ہے۔ فقاتلوا التی تبغی حتی تفیئ الی امراللہ۔ اور اگر آپ کو تحقیق حق کی فرصت یا لیاقت نہیں۔ تو آپ سے دخل در معقولات دینے کو کس نے کہا ہے۔ اپنے گھر بیٹھیے اور تحقیق سے پہلے کسی کو بُرا نہ کہیے۔ (انسداد للفساد صنہ)

(۵۸) حقیقت شریعت علم صحیح اور صحبت صالح ہی

اعتدال اوروں کیلیے تو فرضی ہی۔ مگر شریعت کیلیے حقیقی ہی۔ کہ اس کی ہر بات افراط و تفریط کے درمیان وسط ہی۔ اور وسط بھی بحرکت سین۔ یعنی وسط حقیقی۔ کیونکہ ایک تو ہی وسط بسکون السین یعنی وسط مطلق اور ایک وسط ہے بفتح السین یہ ہے وسط حقیقی۔ اسی واسطے مشہور ہے کہ اَلوَسَطُ متحرک۔ یعنی متعین نہیں۔ کہ ادھر اُدھر ہو سکتا ہے۔ اور اَلوَسْطُ ساکن یعنی متعین ہے۔ میں نے اس سے بھی زیادہ لطیف کر دیا۔ کہ الساکن متحرک۔ والمتحرک ساکن اور وسط بسکون السین پر چلنا آسان ہوتا ہے، اور جب اُسے بدل دو یعنی سین کا فتح کر دو تو پھر مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ وسط حقیقی ایک غیر منقسم چیز ہی۔ کیونکہ اگر اس کی تقسیم ہو گی۔ تو پھر اس میں بھی طرفین اور وسط نکلیگا۔ حالانکہ اس کو وسط حقیقی فرض کیا تھا۔ ھذا خلف اور ظاہر ہے کہ غیر منقسم پر چلنا جیسا دشوار ہے چنانچہ اگر کوئی کہے کہ سڑک پر اس طرح چلو کہ وہ جو بیچوں بیچ کا سیدھا خط ہی۔ اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو۔ تو بہت مشکل ہے۔ ہاں اگر کسی نے وسط حقیقی میں ایک ڈور اکھینچ دیا۔ تو اب اس کی سیدھ پر چلنا آسان ہی۔ اور شریعت کی حقیقت ہے وسط حقیقی۔ چنانچہ شریعت نے ہر چیز میں ایک وسط نکالا۔ جبن و تہور میں شجاعت۔ خمود و فجور میں عفت وسط نکالا ہے۔ اسی طرح جربزہ و بلاہت میں حکمت وسط نکالا ہے۔ یعنی جربزہ تو یہ ہے۔ جیسا کہ کسی طالب علم نے تیلی سے پوچھا تھا۔ کہ

بیل کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھی۔ اُس نے کہا کہ جبتک گھنٹی کی آواز آتی رہے۔
یہ معلوم رہے کہ چل رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر کھڑا ہوکر خالی گردن ہلایا کرے۔
اور جیسے کسی طالب علم نے اپنے باپ سے کہا کہ میں دو انڈوں کے سو انڈے بنا سکتا
ہوں۔ اُنھوں نے کہا اچھا بناؤ۔ آپ نے کہا ایک یہ ایک یہ اور ایک ان کا مجموعہ۔ یہ تین
ہوئے۔ پھر تین وہ اور ایک ان تین کا مجموعہ وھلم جرا الی مالا یتناہی۔ باپ نے
اُن کی معقول کو ماکول کر دیا۔ کہ ان دونوں میں سے ایک تو خود کھا لیا۔ ایک دوسرے
بیٹے کو دیدیا۔ اور اُن سے کہا وہ اٹھانوے آپ نوش فرمائیں۔ وہ انڈے کیسے تھے
کہ اُن سے یہ اندھے ہوگئے کہ اب انہیں نظر نہ آئے۔ جیسے کسی اُستاد نے ایک بھینگے
شاگرد سے کہا کہ ذرا فلانی بوتل تو اُٹھا لاؤ۔ اُس نے کہا وہاں تو دو ہیں۔ کونسی اٹھا
لاؤں۔ بھینگے کو ایک کے دو نظر آیا کرتے ہیں۔ اُستاد نے کہا نہیں ایک ہی ہے۔
اُس نے کہا دو ہیں۔ اُستاد نے کہا اچھا دوسری بوتل توڑ ڈالو۔ اُس نے ایک
توڑی وہ دونوں ٹوٹ گئیں۔ اسی طرح ان کو بہت سے انڈے نظر آتے تھے۔ کہ دو
غائب ہوئے تو سب ہی غائب ہوگئے۔ یہ جربزہ کہلاتا ہے۔ یہ عقل کا ہیضہ ہے
ایک اکل کا ہیضہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک بلاہت ہے کہ کچھ خبر ہی نہ ہو۔
بہت سے بزرگ ایسے ہوتے ہیں۔ مگر یہ کمال نہیں۔ چنانچہ کوئی نبی بھولا نہیں ہوا
نہایت دانشمند۔ اور بیدار مغز ہوئے ہیں۔ میرے ایک دوست نہایت بھولے تھے
میں نے اُن سے پوچھا کہ تمہاری بیوی عورت ہے یا مرد۔ کہنے لگے بظاہر عورت معلوم
ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ کیسے معلوم ہوا۔ کہ عورت ہے۔ کہنے لگے کہ وہ نتھ پہنے ہوئے
تھی۔ اگر وہ نتھ نہ پہنے ہوئے ہوتی تو شاید اُسے مرد سمجھتے۔ یا ان کو کوئی نتھ پہنا دیتا
تو یہ بھی اپنے کو عورت سمجھنے لگتے۔ تو بعضے ایسے بھولے ہوتے ہیں۔ مگر کمال یہ ہے
کہ نہ جربزہ ہو۔ نہ بلاہت ہو۔ دونوں میں وسط ہو۔ جس کا نام حکمت ہے۔ خیر
الامور اوسطھا۔ اسی طرح باقی امور کو لیلو۔ غرض شریعت نام ہے اعتدال
حقیقی کا۔ اور اس کا مقتضا جیسا کہ مذکور ہوا۔ یہ تھا کہ اس پر چلنا نہایت دشوار ہو

مگر خدا نے آسان کرنے کے لئے۔ اس وسط پر ایک ڈوری ڈالدی ہے۔ جس کو وہ ڈوری نظر آرہی ہے۔ اُس کو چلنا نہایت آسان ہے۔ اور وہ ڈوری کیا ہے۔ علم صحیح صحبت صالحہ۔ یہ وہ چیز ہے۔ کہ اس سے وسط حقیقی نظر آجاتا ہے۔ مرج البحرین یلتقیان۔ بینھما برزخ لایبغیان ٥

	در میان شان برزخ لایبغیان		بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں

تو شریعت ہی افراط و تفریط کے برزخ کا نام ہے۔ میں علم صحیح کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک صفت ہے غضب للنفس اور ایک ہے غضب للہ ان دونوں میں خلط ہے۔ یہاں پر امتیاز کی ضرورت ہے۔ مثلاً ہمنے ایک مسئلہ لکھا۔ اُسے کسی نے دو کر دیا۔ ہمیں غصہ آیا اور فی نفسہ ہمنے وہ مسئلہ صحیح لکھا ہے۔ اس غصہ میں خلط ہی کہ آیا للہ ہے۔ کہ اس نے حق کو رد کیا۔ یا للنفس ہے کہ اُس نے ہمپر رد کیا۔ سو آئمہ طریقت بڑے حاذق طبیب تھے۔ وہ اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اے عزیز غور کر کے دیکھ۔ اگر اسی امر میں تیرے کسی معاصر مولوی پر بھی رد کیا جاتا۔ اور خاص کر وہ معاصر جس کی ذلت سے تمہارا نفس خوش ہو۔ اگر ایسے شخص پر بھی رد ہوتا۔ تو آیا اس وقت بھی تمکو ایسا ہی غصہ آتا۔ یا نہ آتا۔ اگر سوچنے پر معلوم ہو کہ آتا تب تو یہ غضب للہ ہی اور اگر غصہ کم آتا تو آمیزش ہی اور اگر بالکل نہ آتا تو اُس وقت کا غصہ محض للنفس ہے نفس کی شرارت اور بد معاشی ہی۔ اسی طرح دوسرے اخلاق رذیلہ و اخلاق حمیدہ میں امتیاز واسطہ علم صحیح کے ضرورت ہی۔ اور چونکہ شریعت نام ہے۔ وسط حقیقی کا اسی سے یہی صراط مستقیم بھی ہے۔ کیونکہ خط مستقیم کے لئے اقصر خطوط واصلہ بین النقطتین اور اوسط خطوط واصلہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی دو نقطوں کے درمیان میں بھی ہوگا اور یہی صراط مستقیم شریعت ہی۔ جو قیامت میں بشکل صراط قایم ہوگا۔ پس وہ شریعت ہی کی صورت مثالیہ ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس کے بال سے باریک ہونیکے۔ کیونکہ بال تو پھر متجزی ہے۔ اور شریعت وسط حقیقی ہونے کی وجہ سے غیر متجزی۔ کیونکہ شریعت اتنا وسط ہے کہ اس میں پھر وسط نہیں۔ اسی واسطے قیامت میں بال سے باریک نظر آویگی

باقی تلوار سے تیز ہونے کی حقیقت یہ ہے۔ کہ چونکہ شریعت نام ہی وسط حقیقی کا اور وسط حقیقی پر چلنا۔ اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ جیسا کہ تلوار کی دھار پر چلنا۔ اس لئے وہ صراط دھار سے زیادہ تیز نظر آویگا۔ البتہ جن کو یہاں وہ ڈوری امتیاز کی عطا ہونے سے چلنا آسان ہو گیا تھا۔ چونکہ صراط وہی چیز ہوگی جس پر چلنے کے خوگر تھے۔ اس لئے وہاں بھی اسی درجہ میں اس صراط پر چلنا آسان ہوگا۔ یعنی اگر یہاں برق کی طرح ہے۔ تو وہاں بھی ہے۔ اگر یہاں چلنے میں اٹکا تو وہاں بھی اٹکیگا۔ اور جہنم میں گریگا۔ (روح الجوار صـ۲۴)

(۵۹) شریعت سے ناگواری اس کی خوبیاں نہ معلوم ہونیکی وجہ سے ہے

شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کیلئے آنکھ نہیں ہے۔ اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں کہیں حق تعالیٰ نے اپنی غرض پوری نہیں کی ہے ۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم	بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

آپکے مصالح کی ایسی رعایت کی ہے۔ کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے۔ مثلاً شریعت نے یہ بتایا۔ کہ پھل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیچنا حرام ہے۔ گو یہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہے۔ کہ پھل آنے سے پہلے تو باغ پانچ سو کو بکتا تھا۔ اور اب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کو بیچنا پڑا۔ لیکن خریدنے والے سے پوچھ کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے۔ کہ پانچ سو جس باغ کے دیتا تھا ڈھائی سو میں مل گیا۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دور کا عصبہ چھوڑا۔ آدھی میراث بیٹی کو ملیگی۔ اور آدھی عصبہ کو۔ اس میں بیٹی کو ناگوار ہوا۔ کہ میں خاص بیٹی اور میرے باپ کا مال یہ دور کا رشتہ دار اُسے خواہ مخواہ دیدیا۔ مگر اس عصبہ سے پوچھو تو وہ کہیگا ۔ سبحان اللہ شریعت میں حقائق کی کیا رعایت ہے۔ دور دور کی قرابت کو بھی اس قدر مانا ہے۔ تو اب ایک ہی حکم ہے۔ مگر دو آدمیوں میں سے اپنی اپنی اغراض کی

وجہ سے ایک کو ناگوار ہے اور ایک کو گوارا۔ اب ہم کس کے فیصلہ کو ان دونوں میں سے مانیں گے ؎

ترکت اللات والعزیٰ جمیعًا		کذلک لیفعل الرجل البصیر

یعنی لات اور عزیٰ دونوں کو چھوڑ دیا۔ ہم دونوں میں سے کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے۔ کیونکہ یہ دونوں خود غرض ہیں۔ ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے کیوں کہ وہاں شائبہ غرض کا نہیں ہے۔ اسی لئے وہی قابلِ اعتبار ہے۔ وحی کا فیصلہ یہ ہے۔ کہ شریعت قانون تمام ہے۔ جو مصالح عامہ کی رعایت کرتا ہے جیسے سرکاری قانون مثلاً سڑک پر پیشاب کرنا جرم ہے۔ اب ایک شخص کو زور کا پیشاب لگا۔ وہ کہاں تو یہ حکم ہے۔ پیشاب مت کرو۔ اور یہاں موت نکلا جا رہا ہے۔ تو وہ شخص کیا کہیگا۔ کہ بڑی سختی کا قانون ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیشاب کی تو اجازت ہوتی۔ مگر اس کی بدبو سے بچنے کیلئے کوئی ایسی دوا ڈالدی جاتی۔ کہ دماغ بحس ہو جاتے۔ اس لیے کسی کو بدبو نہ معلوم ہوتی۔ بھلا کون اُسے پسند کرے گا۔ اس گدھے کے موتنے کے واسطے سب کو بحس بنادے۔ اسی طرح شریعت نے بھی مصالح عامہ کی رعایت سے قانون بنایا ہے۔ تم اس میں مصالح خاصہ اور وہ بھی نفسانیہ ڈھونڈتے ہو۔ اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالح عامہ کی رعایت سے یہ تو حکماء و عقلاء کی نظر میں ہے۔ اور ایک نظر ہے عشق و محبت والے کی۔ اس کو اس سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ دوست کا قانون ہے۔ یہ حکماء کی نظر سے بڑھ کر ہے۔ جیسے کوئی طوائف اپنے کسی خاص عاشق سے یہ کہدے کہ تم لنگوٹی باندھ کے رام نرائن کے بازار میں پھرو۔ یہ اس سے نہیں پوچھے گا کہ بی اس میں تمہارا کیا فائدہ۔ بلکہ فوراً ادھر اُدھر دوڑنے لگیگا اگر کوئی کہے بھی گدھے یہ کیا ہے۔ تو وہ کہیگا۔ قال الجدار للوتد لم تشقنی قال الوتد انظر الی من یدقنی۔ ایک شخص دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا۔ تو دیوار نے کیل سے شکایت کی کہ میں نے کیا کیا۔ جو میرے جگر کو شگافتہ کر رہی ہے۔ کیل نے جواب دیا کہ اس سے پوچھو۔ جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔ تو حکماء و عقلاء احکام کے لم کے درپے ہونگے

اور جو عاشق ہوگا۔ وہ یہ کہیگا۔ کہ حکمت اس سے پوچھو جس نے یہ قانون مقرر کیا ہے مجھکو کچھ بحث نہیں۔ بس مولوی صاحب کو یہی جواب اختیار کرلینا چاہئیے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند	آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے۔ میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر حکم و اسرار معلوم بھی ہوں تو پوچھنے پر تو ہرگز مت بتاؤ۔ چاہے یہی گمان کریں۔ کہ انہیں نہیں آتا اور پوچھنے والے یہی خوب سمجھ لیں۔ کہ جاننے والے بھی بہت ہیں۔ مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتادیا کریں۔ جیسے طبیب کہ جانتا سب ہے۔ کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا۔ اور چھ ماشہ گل گاؤزبان کیوں لکھا۔ اگر کوئی مریض پوچھنے لگے۔ تو وہ نہیں بتائیگا۔ اگر وہ کہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں طب نہیں آتی۔ ہاں صاحب نہیں آتی تمہیں پسند ہو پیو ورنہ مت پیو۔ عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز	ورنہ در مجلس رنداں خبری نیست کہ نیست

یعنی کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہو۔ مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں بتاتے اور حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا محبوب سمجھ کر اُس کے حکم کی علت دریافت کرنا عشق کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جاؤ ہم عاشق ہی نہیں۔ پھر ہم پر وظائف عشق بھی واجب نہیں۔ تو صاحب تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ عشق تو لوازم ایمان سے ہے۔ جب تم نے آمنا کہا۔ تو عشقنا کا التزام بھی کرلیا۔ جیسے کوئی شخص کہے مجھ پر نان و نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہوگیا میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا۔ صرف قبلت النکاح کہا تھا۔ ہر شخص یہی کہیگا کہ قبلت کہا۔ جب ہی شوہری کے حقوق ملتزم ہوگئے۔ پس اسی طرح جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا۔ پس عاشق ہوگئے۔ کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہوگئے۔ اور مومن کے بارہ میں ارشاد ہے۔ والذین اٰمنوا اشد حبا للہ۔ جو لوگ خدا پر ایمان لائے۔ وہ خدا کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ تو تصدیق ایمانی کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہوگئے۔ اب آپ عشق سے انکار کریں۔ تو کیا ہوتا ہے۔

جب عاشق ہونا ثابت ہوگیا۔ تو عشق کے حقوق ادا کرو۔ بس کان مت ہلاؤ۔ اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو۔ اگر کوئی اس انقیاد کا قصد کرے۔ تو اول اول تو تکلف ہوتا ہے۔ پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ تو اسکے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ جس طرح دوا عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ دوا کیونکر غذا ہو جاتی ہے تو میرے پاس اس کی لاجواب مثال موجود ہے۔ دیکھیے حضرت تمباکو سلمہ اللہ تعالیٰ کہ کوئی اس سے مشکل سے بچا ہوگا۔ کہیں اکلاً کہیں شرباً اس کا استعمال ہوا کرتا ہے شروع کرتے وقت کیسی متلی ہوتی ہے۔ کیسی ابکائیاں آتی تھیں۔ چکر آتا تھا۔ مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر یہ غذا سے زیادہ مرغوب ہو جاتا ہے۔ روزے میں سب کو تو پانی اور شربت کی فکر ہوتی ہے۔ مگر انہیں نہ پھلکیوں کی پروا نہ شربت کی پروا۔ نہ افطاری سے مطلب۔ ارے بھئی حقہ دیدو۔ ایک پان دیدو۔ ایسی مکروہ چیز کیسی محبوب ہوئی۔ اے اللہ تمباکو کی تو اتنی محبت اور شریعت کی اتنی بھی نہیں۔ ارے بھائی تمباکو ہی سمجھ لیا ہوتا۔ تمباکو تو کیا ہوتا۔ آخر کسی طرح بعد سے لوگوں کو سمجھاؤں بھی۔ اگر خمیرہ گاؤزبان نہیں سمجھتے تو خمیرہ تمباکو ہی سمجھو۔ بہرحال اب یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ عادت ڈال لو تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔ بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کیوقت نماز کو اٹھنے میں ناک منہ چڑھاتے دیکھ کر اگر یہ شبہ ہو۔ کہ عادت پڑ جانیکے بعد۔ ان پر کیوں اثر ہے بات یہ ہے کہ اُن کے دل پر اثر نہیں ہے۔ صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے۔ اور دلمیں نہایت خوش ہیں۔ اسکی مثال بھی میرے پاس موجود ہے۔ اور وہ نظر حضرت تمباکو کے دوست مرچ ہیں۔ کہ ناک بہ رہی ہے۔ آنسو جاری ہیں۔ سی سی کر رہے ہیں مگر کھائے چلے جاتے ہیں۔ کیوں صاحب اگر تکلیف ہے تو کیوں کھاتے ہو۔ بات یہ ہے۔ کہ تکلیف منہ کو ہے۔ مگر زبان اور حلق کو تو مزہ آتا ہے۔ اس لئے منہ کی تکلیف گوارا ہے۔ تو اب سمجھ میں آگیا کہ لذت والم دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو۔ مگر دل اور روح شاداں ہے۔ اور اس عادت کا یہ اثر ہے۔ کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے۔ گو بدن کو آرام ملا کہ پڑے

سوتے رہے۔ مگر قلب کو جو تکلیف ہے۔ اُس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود	گر ز باغ دل خلالے کم بود

یعنی اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے۔ اُس وقت دیکھو اُن کے غم کو۔ پھر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ زاہد کو تو غم ہوتا ہی مطلقاً عمل فوت ہو جانیکا اور عارف کو غم ہوتا ہے باختیار خود فوت ہو جانے کا۔ اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوست نے اس میں یونہی تصرف کیا۔ مگر یہ بات عام لوگوں کے سنانے کی نہیں۔ کیونکہ اگر یہ قصداً بھی سو گئے۔ اور نماز قضا کردی۔ تو حیلہ نکال لیں گے۔ کہ محبوب کی یونہی مرضی تھی۔ تو یہ مرضی مرض والوں کیلئے نہیں۔ کیونکہ وہ خود مَرضی (بفتح الرار) ہیں۔ یعنی مرض والے۔ بہر حال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہے۔ مگر روح کو نہیں ہوتی۔ بلکہ ان اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے۔ کہ وہ غذائے روح بن جاتی ہیں۔ کہ اگر وہ نہ ملیں تو پریشانی ہوتی ہی۔ صرف شروع میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے۔ جیسے مشاہدہ سے پہلے مجاہدہ کی ضرورت ہی۔ یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔ تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ۔ حالانکہ اس میں ہمارے کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی بے حد رعایت کی ہے۔ اور ساری مصلحتوں سے بڑھکر تو چین ہے جو بدون اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ چین تو بقول تمہارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ہر وقت خدا کو یاد کریں۔ اور اتباع شریعت نہ کریں۔ تو تعلق اللہ تو حاصل ہو گیا۔ بس چین سے رہیں گے۔ تو خوب سمجھ لو۔ کہ مطلق تعلق سے۔ یہ قاعدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسے تعلق میں چین کا گمان بے حسی ہے فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے۔ تو مرنیکے بعد کھل جائیگی۔ جیسے ایک سرحدی گنوار ہندوستان میں آیا۔ ایک حلوائی کی دوکان پر جاکر حلوا لیا۔ اُس نے دام مانگے یہ وہاں سے بھاگا۔ وہ حلوائی بھی پیچھے بھاگا۔ جب وہ اتنا بھاگا کہ قریب تھا

کہ پکڑ لے۔ آپ نے وہ حلوا جھٹ منہ میں رکھ لیا۔ کہ جاؤ نہ ہمارا نہ تمہارا۔ وہ پکڑ کر
پولس میں لے گیا۔ تھانیدار کوئی رحمدل تھے اُنھوں نے بجائے چالان کے یہ سزا دی
کہ گدھے پر سوار کر کے اور اعلان کے لئے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دینے
کی سزا دی۔ تو لونڈوں نے جو اُسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ
ہو لئے۔ یہ ہندوستان کی سیر سے فارغ ہو کر اپنے ملک میں پہنچے۔ وہاں لوگوں نے
اُن سے پوچھا۔ کہ آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور ملک است۔ ہندوستان کیسا
ملک ہے۔ آپ نے کہا خوب ملک است۔ بڑا اچھا ملک ہے۔ پوچھا گیا۔ بچہ طور۔ تو
آپ فرماتے ہیں۔ در ہندوستان حلوا خوردن مفت است۔ حلوا مفت کھانے
میں آتا ہے۔ سواری خر مفت است۔ گدھے کی سواری مفت ملتی ہے۔ ڈم ڈم مفت
است۔ باجا مفت ملتا ہے۔ فوج طفلاں مفت است۔ لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے
ہندوستان خوب ملک است۔ تو جیسے ان حضرات کو یہ نہ معلوم ہوا۔ کہ یہ حشم و
خدم عزت کا سامان تھا۔ یا یہ نہایت ذلت کی سزا تھی۔ اسی طرح ان کو نہیں معلوم کہ
یہ چین ہے۔ یا بے چینی۔ لیکن کہاں تک۔ فسوف تری اذا انکشف الغبار
افرس تحتک ام حمار جب حقیقت منکشف ہوگی۔ اُس وقت معلوم ہوگا
کہ چین تھا یا بے چینی۔ جیسے اس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی
ہوگی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہوگا۔ اسی طرح انہیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائیگا
کہ وہ لذت تھی۔ یا بے لذتی۔ غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایہ راحت
ہے۔ تو وہ جانبین سے ہو۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ وہ نسبت ہی نہیں جو صرف
ایک طرف سے ہو۔ جیسے کسی شہر میں ایک پردیسی طالب علم تھے۔ اُن کے دیس
کے کوئی آدمی اُن سے ملنے گئے۔ اُنھوں نے پوچھا۔ میاں طالب علم کس رنگ میں
ہو۔ کہنے لگے۔ کہ شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں۔ پوچھا کیا سامان ہوا۔ کہنے لگے
ہاں آدھا سامان کام تو ہو گیا۔ آدھا باقی ہے۔ پوچھا کس طرح۔ کہنے لگے میں تو راضی ہوں
مگر وہ راضی نہیں۔ خوب آدھا ہو گیا۔ تو یہ تو اُلو پن ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ

بزعم خود صاحب نسبت ہیں۔ جو ملکہ یا دداشت بہم پہنچاکر اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں۔
مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب اُن کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں۔ مگر اللہ
میاں راضی نہیں۔ خوب سمجھ لو کہ اُن کے راضی ہونیکا معیار صرف اتباع احکام ہے
اگر اس حال میں موت آگئی۔ تو سب کھل جائیگا کہ یہ تعلق ان کو پسند نہونیکے سبب
تمہاری نظر میں کس قدر ہوگا۔ بقول سعدی علیہ الرحمۃ ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت	زر و خاک یکساں نماید برت

آپ نے ہزار روپے محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش
نہیں ہوا۔ اور اُس نے نہیں لئے اور انہیں واپس کر دیا۔ کسی نے کہا کہ گھر میں
بھیجدو۔ تو یہی کہوگے۔ پھینکو بھی میں کیا کرونگا۔ ایسے منحوس روپے کو۔ اسی طرح جب
معلوم ہوگا۔ کہ حق تعالیٰ اس تعلق سے راضی نہیں ہوئے۔ تو اس تعلق کو کیا سمجھوگے
تعلق وہی ہے۔ جو کہ دونوں جانب سے ہو۔ اور یہ تعلق بدون اتباع شریعت کے
ہو نہیں سکتا۔ تو دیکھئے شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی۔ حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔
ثم جعلنٰک علی شریعۃ من الامر اللہ فاتبعہا۔ ثم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے
ہیں۔ ولقد اٰتینا بنی اسرائیل الکتٰب والحکم والنبوۃ تا فیما کانوا فیہ یختلفون
فرماتے ہیں یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی۔ اور ہم نے
ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں۔ اور ہمنے ان کو دنیا جہان والوں پر فوقیت
دی تھی۔ اور ہمنے ان کو دین کے بارہ میں کھلی کھلی دلیلیں دیں۔ سو اُنھوں نے علم ہی کے
آنیکے بعد باہم اختلاف کیا۔ بوجہ آپس کی عنداضدی کے۔ آپ کا رب اُن کے
آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دیگا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے
تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ ثم جعلنٰک الخ۔ پھر آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب
وغیرہ عنایت کی تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔
من الامر میں من بیانیہ ہے۔ کہ وہ شریعت یا طریقہ خاص کیا ہے۔ وہ امر دین ہے
پس اس کا اتباع کیجئے۔ لقب کتنا لطیف ہے۔ شریعت یعنی جس عنوان سے

علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں۔ وہی عنوان آیت میں وارد ہوگیا۔ جس سے صریحاً مدعا علماء کا ثابت ہوگیا۔ اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے۔ ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون اور ان جاہلوں کی خواہش کا اتباع نہ کیجیے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز بیان ہے۔ یہ نہیں فرمایا۔ کہ ولا تتبع غیرھا۔ کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے۔ بلکہ یوں فرمایا کہ جہلاء کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجیے۔ اس میں بتادیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں۔ وہ خواہشیں ہیں۔ اور ہوائے نفسانی ہیں۔ اس لئے وہ عمل کے قابل نہیں۔ الذین لا یعلمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہی یعنی الذین لا یعلمون کی اہوا کا اتباع جائز ہے۔ بلکہ یہ قید واقعی ہی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں۔ جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ تو جہلاء ہیں جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانیمیں نہ آنا۔ تو اسکا یہ مطلب تھوڑا ہی ہی کہ غیر مفسدوں کے بہکانیمیں آجانا نہیں مطلب یہی ہی کہ بہکانیوالے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں اُن سے بچتے رہنا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو۔ اور الذین لا یعلمون کا مفعول جو ذکر نہیں فرمایا۔ سبحان اللہ اس میں عجیب رعایت ہے۔ اگر مفعول ذکر فرماتے۔ تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا۔ کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے۔ تو اس صورت میں۔ یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہی اس لئے یہاں مطلق علم کی نفی کردی۔ کہ اہواء اس لئے مذموم ہی کہ وہ ایسوں کا فعل ہے۔ جو بالکل ہی جاہل ہیں۔ یہ دعوی کہ جو شخص شریعت کا متبع نہ ہو۔ وہ بالکل جاہل ہے۔ اتنا بڑا ہے۔ کہ سارا عالم اس میں مقابل ہے۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے۔ کہ یہ ساری دنیا کو جاہل بنانا اتنی پکی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال خلاف کا نہیں۔ ورنہ آپ کو جھجک ضرور ہوتی۔ کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ اور اس وقت گو ظاہر میں آپ نہیں تشریف رکھتے۔ مگر آپ کا علم و فیض تو ہے۔ جیسے آفتاب پر ابر آجاوے۔ تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہی۔ مگر اس کی روشنی

تو ہے۔ بلکہ چوندھوں کیلئے تو یہ ابر بھی رحمت ہی ۔ کہ براہِ راست وہ اس کا تحمل نہ کرسکتے۔ اسی طرح بعضے لوگ ایسے ہیں۔ کہ اگر حضور کے زمانہ میں ہوتے۔ تو یقیناً یہ حضور کے اتباع سے عار کرتے۔ اور اس سے حد کفر میں پڑ جاتے۔ تو اچھا ہوا کہ ابر آگیا۔ ورنہ ان چوندھوں کی بڑی مشکل ہوتی۔ بہر حال اب وہ آفتاب کی روشنی ابر سے بھی چھن رہی ہے۔ اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے پڑھتے رُک گیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ		چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی آفتاب رخصت ہو گیا اور میں اسے اس لیئے نہیں پسند کرتا کہ آفتاب رخصت نہیں ہوا۔ وہ تو اب بھی درخشاں ہے۔ صرف ابر کے نیچے چھپ گیا ہے بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہی ؎

ہنوز آں ابر رحمت درخشاں است		خم و خمخانہ با مہر و نشان است

اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ غرض حضور کے غلام حضور سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں۔ جواب بھی اس دعوے کو ثابت کرنیکو تیار ہیں۔ کہ جو متبع شریعت نہو وہ جاہل ہے۔ اور میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا۔ مگر دین کے محاسن پر نظر کر کے کہہ سکتا ہوں۔ کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عاقل ہو۔ مگر عالم نہ ہو۔ اور نہ کسی عالم محقق کی صحبت میں رہا ہو۔ اس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ مہینے کیلئے بھیجدو۔ خدا کی قسم اس چھ مہینہ میں وہ محقق یہ ثابت کردیگا۔ کہ اس عاقل کی زبان سے اقرار کرائیگا کہ میں احمق ہوں۔ اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا۔ اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے۔ تو تجربہ کرلو۔ کہ چھ مہینے کی رخصت لو۔ پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو۔ اس وقت دیکھ لوگے کہ یہ شخص آئیگا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا۔ مگر جائیگا یہ کہتا ہوا۔ کہ میں احمق ہوں۔ نہیں بلکہ پہلے احمق تھا۔ کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آجاوے گی۔ تب معلوم ہوگا۔ کہ ھل الذین لا یعلمون کا مدلول کیسا یقینی ہے۔ کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے۔

وہ جہل ہے۔ میں حالانکہ کچھ بھی نہیں۔ مگر جونپور کے ایک شاعر صاحب میرے یہاں آئے۔ جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے۔ میں تو ادنیٰ سے ادنی۔ ادنی سے ادنی ہوں۔ اس طرح دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اضافت ادنیٰ کی طرف کی جائے۔ بہر حال میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ مگر چند روز رہنے کے بعد وہ واپس گئے۔ تو وہاں جاکر اُنہوں نے ایک رسالہ لکھا۔ اسمیں یہ بھی لکھا تھا۔ کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے وہاں جاکر یہ معلوم ہوا۔ کہ وہ تہذیب ہی نہیں تھی۔ خیر وہ تو مر گئے۔ ایک اور دہلی کے طبیب بھی آئے چند روز یہاں رہنے سے وہ بھی یہ کہنے لگے۔ کہ جن کو ہم ابتک کمالات سمجھتے تھے۔ سارے نقائص نکلے۔ اور جنہیں ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے۔ تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر شبہ ہو۔ تجربہ کر لیجئے۔ اس لئے فرمایا اھواء الذین لا یعلمون۔ جاہلوں کا اتباع نہ کیجئے یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے۔ اور اطلاق مضر ہے۔ کیونکہ اطمینان اور چین بدون تقیید کے نہیں ہوتا۔ مثلاً ہمنے یہ ارادہ کر لیا۔ کہ جب بیمار ہونگے ہم فلانے طبیب کا علاج کریں گے۔ تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے۔ بیماری کا خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا۔ کہ کس کا علاج کریں۔ اور اگر تقیید نہیں ہے۔ مثلاً ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا۔ ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تغیر نہیں آیا۔ دوسرے سے رجوع کر لیا۔ تیسرا پیش آیا۔ تیسرے سے رجوع کر لیا۔ تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا۔ اور ہر وقت یہ فکر رہے گی۔ کہ اب کے تغیر میں کس طبیب سے رجوع کرینگے۔ غرض تقیید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائیگا۔ اور اگر وہ تقیید حقائق کے موافق ہو۔ تو سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔ اگر شریعت کا علم وحکمت کیموافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا۔ جیسا کہ مدلول ہی ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون کا۔ تب بھی اتباع شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا۔ اور اب تو

جبکہ شریعت کا علم و حکمت کیموافق ہونا ثابت کر دیا گیا۔ تو اس اتباع کا ضروری و مصلحت و موجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہو گیا۔ آگے وعید ہے۔ انھم لم یغنوا عنک من اللہ شیئاً۔ یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے۔ یعنی گو یہ آج مددگار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آسکتے۔ اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا۔ کہ اتباع کے بعد ہم تو اکیلے رہ گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ وان الظالمین بعضھم اولیاء بعض ط واللہ ولی المتقین اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ اور اللہ دوست ہے اہلِ تقویٰ کا۔ اس سے تردد رفع ہو گیا۔ کہ اہل اہوا اگر ہم سے الگ ہو گئے تو کچھ پروا نہیں کیونکہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شریعت میں جو صفتیں ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں۔ ھذا بصائر للناس وھدی ورحمۃ لقوم یوقنون ط قرآن یا شریعت عام لوگوں کیلئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اور یقین لانے والوں کیلئے بڑی رحمت ہے۔ ھذا بصائر بصائر جمع بصیرت کی ہے۔ بصیرت کہتے ہیں باطنی روشنی کو جیسے بصر کہتے ہیں۔ نگاہ یعنی ظاہری روشنی کو تو شریعت بصائر ہے یعنی باطن کو روشن کرنے والی ہے وھدیٰ اور سراپا ہدایت ہے۔ کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے۔ اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے ورحمۃ اور رحمت ہے۔ جو کہ مقصود ہے۔ گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے ذہن میں آیا تھا۔ مگر اسے بھول گیا تھا۔ اس وقت پھر یاد آگیا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ رہرو کو انہیں تین چیزوں کی ضرورت ہے جب آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے۔ تو اس کے لئے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور ایک بصر یعنی نگاہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راستہ نظر آوے۔ حق تعالیٰ کے قربان جایئے۔ کہ شریعت بتلاتے ہیں کہ یہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ ھذا بصائر یہ آنکھیں بھی ہیں۔ وھدی اور راستہ بھی اسی کے ذریعہ سے ملے

ہوتا ہے۔ ورحمۃ اور رحمت بھی ہے۔ یعنی مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔
سبحان اللہ بصیرت طریق مقصود تینوں اسی ایک شریعت میں ہیں۔ اب رہا یہ کہ
بصائر کو جمع کیوں لائے۔ اور ہدیٰ ورحمۃ کو مفرد کیوں لائے۔ اس میں نکتہ یہ ہے
کہ راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں۔ اور سب کی آنکھیں الگ الگ ہوتی
ہیں۔ اس لئے اس کو جمع لائے۔ اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اور مقصود بھی سب کا
ایک ہی ہوتا ہے۔ اسلئے وہاں مفرد لائے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ یہ رحمت تو ہے۔
مگر ہر شخص کے لئے نہیں۔ بلکہ لقوم یوقنون۔ یعنی یقین کرنے والوں کیلئے۔ یقین
کے دو درجے ہیں۔ ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی۔ تقلیدی تو یہ کہ احکام کو بلا دلیل مان
لو۔ پھر ان احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جائیگا۔ جیسے شروع میں الف۔ بے
کہ محض اُستاد کی تقلید سے مان لیتے ہو۔ اس کے بعد اُسی تقلید کی بدولت بڑے
علوم کے محقق بن جاتے ہو۔ اگر شروع ہی میں یہ پوچھا۔ کہ اس کی کیا دلیل ہے۔
کہ یہ الف ہے۔ تو نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیشہ جاہل رہو گے۔ اس لئے پہلے کسی محقق کی
تقلید کرو پہلے ہی محقق بننے کی کوشش مت کرو۔

ای بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی	تا راہ بیں نہ باشی کے راہبر شوی

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو۔

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق	ہاں اے پسر بکوش کہ روزی پدر شوی

(الشریعت صفحہ ۴۰ تا ۴۲)

(۶۰) بعض عامی کو مغفرت بدون عذاب کے بھی ہوگی۔ اسمیں معتزلہ کے سوا کسی کا اختلاف نہیں

بعض گنہگار بدون عذاب ہی کے بخش دیے جائیں گے۔ معتزلہ کے سوا
کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک گنہگار کو عذاب ہونا لازم ہے۔
تماشا ہے۔ نہ معلوم ان لوگوں کی عقلیں کہاں گئیں۔ وہ خدا کے ذمہ عقاب و ثواب کو

واجب کہتے ہیں۔ گویا خدا کو نعوذ باللہ قانون کا تابع کرتے ہیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ قانون بنانیوالا۔ قانون کا تابع نہیں ہوتا۔ بلکہ خود قانون اُس کے تابع ہوا کرتا ہے۔ اگر اُن کے نزدیک عذاب و ثواب کا وجوب عقلی ہے۔ اس سے واجب کا مضطر ہونا لازم آتا ہے۔ اور اضطرار امارات حدوث سے ہے۔ اور واجب اضطرار سے منزہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ وجوب شرعی ہے۔ تو اُس کے لئے دلیل شرعی کی ضرورت ہی۔ اگر وہ دلیل میں آیات وعید کو پیش کریں۔ تو ہم آیات عفو و مغفرت و شفاعت کو پیش کرینگے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے گناہوں کو بدون عذاب کے بھی معاف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ان اللّٰہ لا یغفران یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء۔ باقی جن آیات میں افعال کبیرہ کا عقاب مذکور ہے وہاں استحقاق مراد ہے۔ لزوم وقوع مراد نہیں۔ یعنی کبائر سے وہ شخص عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ وقوع عقاب لازم نہیں۔ ممکن ہے حق تعالیٰ ویسے ہی بخشدیں۔ باقی وقوع کے متعلق آئت۔ ان اللّٰہ لا یغفران یشرک الخ سے صاف معلوم ہو گیا کہ سب گناہوں پر عذاب لازم نہیں۔ بجز شرک و کفر کے کہ ان پر عذاب لازم ہے۔ یعنی شرعاً۔ غرض گناہ کبیرہ تو بدون عقاب کے معاف ہو سکتا ہی مگر کفر و شرک کا ارتکاب بدون عذاب کے نہیں رہ سکتا۔ اس پر عذاب لازم ہی اور وہ بھی ابدالآباد کیلئے جس کا انقطاع کبھی نہ ہوگا۔ یہ جرم کسی طرح معاف نہ ہوگا۔ نہ عذاب سے نہ بغیر عذاب کے (محاسن الاسلام صہ ۹)

(۶۱) مرتد کا درجہ کافر اصلی سے بڑھا ہوا ہے اور اس کی وجہ!

قوانین سلطنت میں بھی باغی کی سزا اُن لوگوں سے زیادہ ہوتی ہی۔ جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں۔ بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں۔ ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جاوے۔ تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں۔ یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں۔ یا عزت کیساتھ نظر بند کر دیتے ہیں۔ مگر باغی کیلئے بجز قتل یا عبور دریائے شور کے

کچھ سزا ہی نہیں۔ اور اس کیوجہ یہ ہی کہ رعایا بنکر باغی ہوجانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے۔ اس طرح اسلام لاکر مرتد ہوجانے میں اسلام کی سخت توہین اور اس کی تعلیم کی دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہی۔ دیکھئے ایک وہ شخص ہی۔ جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی۔ بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہی۔ اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا۔ اور اگر کبھی وہ آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اسکی کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ سب کہدیتے ہیں کہ میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہی۔ دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال آپکا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا۔ اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہنچا ہی اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی بیان کرتا ہی۔ لوگ اُن پر توجہ کرتے ہیں۔ اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا منشا محض عداوت نہیں ہے۔ اگر دشمن ہوتا۔ تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اتر سے پتر سے معلوم ہو گئے ہیں۔ اس لئے مخالف ہو گیا (حالانکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اتر سے پتر سے معلوم کرنے کے بعد ہی دشمن بنا ہو۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے دوستی ہی اس نیت سے کی ہو۔ کہ لوگ دوستی کے زمانہ میں مجھے اُس کا رازدار سمجھ لیں گے۔ تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا۔ اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے۔ کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہی۔ اس کو ضرور کچھ رازدار باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ اس لئے مخالف ہو گیا۔ چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وقال الطائفة من اهل الكتاب امنوا بالذی انزل علی الذین امنوا وجہ النهار واكفروا آخره لعلهم يرجعون۔ پس ہر چند دوست کہ دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے۔ مگر عادۃً لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہو جاتے ہیں (اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لئے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہی۔ جو موافقت کے بعد مخالفت کرے اس لئے شریعت میں مرتد کیلئے دنیوی سزا بھی سخت ہی۔ اور عذاب آخرت بھی اشد

ہے (محاسن الاسلام صـ۱۹)

(۳۶) حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے غنی کامل کر دیا۔ اس پر شبہ کہ حضور کے پاس اتنا مال کہاں تھا جس سے آپ کے غنا کو کامل کہا جاوے۔ اس کا جواب

سمجھ لینا چاہیئے کہ اوّل تو حضور کو غنائے ظاہری کی ضرورت نہ تھی۔ اور جو اصل غنا ہے۔ یعنی غنائے قلب وہ تو آپ کے پاس بدو فطرت سے موجود تھی اور نبوت کے بعد اس میں اسقدر ترقی ہوئی کہ کسی کو بھی آپ کے برابر غنائے قلب حاصل نہو گا۔ کیونکہ اس کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے۔ اور ان صفات میں حضور سے زیادہ کوئی کامل نہیں۔ اس لئے آپ کے غنائے قلب کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ بلکہ ظاہری غناسے تو اہلِ قلب کو اور پریشانی ہوتی ہے۔ اور اس کے حقوق کا خیال کرکے یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اسی کے ازالہ کیلئے حضرت سلیمان علیہ السلام سے فرمایا هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ هٰذَا مبتدا عطاؤنا خبر اول بغیر حساب خبر ثانی یہ ہماری عطا ہے۔ اور بے حساب یعنی بے شمار بغیر حساب سے کثرت کا بتلانا مقصود ہے اور ایک تفسیر یہ ہے۔ کہ بغیر حساب معمول ہے۔ فامنن او امسک کا یعنی یہ ہماری عطا ہے۔ خواہ دو یا نہ دو آپ سے اس کے حقوق کے متعلق کوئی سوال اور بازپرس نہو گی جس طرح چاہو تصرف کرو۔ کلی اختیار ہے۔ دوسری تفسیر مجھے زیادہ پسند ہے اور واقعی حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے اتنی بڑی سلطنت اور اس کا ساز و سامان خارجان ہو جاتا۔ اگر ان کی تسلی اس طرح نہ کی جاتی۔ جب بغیر حساب فرماکر بارِ غم ہلکا کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بے فکری سے سلطنت کی۔ اس سے ظاہر سامان کی کثرت کا موجب پریشانی ہونا ثابت ہو گیا۔ تب ہی تو اس کا ازالہ کیا گیا

اسی واسطے جب حق تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہے مَلِک ہونا اختیار کرلیں۔ یا نبی عبد ہونا اختیار کرلیں۔ حضور نے جبرئیل علیہ السلام کے مشورہ سے نبی عبد ہونا اختیار کیا۔ اگر آپ بھی نبی مَلِک ہونا چاہتے تو آپ سے بھی یہی ارشاد ہوتا ھذا عطاء نا فامنن او امسك بغیر حساب اور اس سے آپ کی بھی تسلی کردی جاتی۔ مگر آپ نے سلطنت پر عبدیت کو ترجیح دی۔ اور غنائے ظاہری کو اختیار نہیں فرمایا۔ دوسرے اگر غنائے ظاہری ہی مراد لی جاوے۔ جیسا مفسرین میں یہی مشہور ہے۔ تو گو آپ کے پاس مال جمع نہ رہتا تھا۔ اور اسی سے شبہ عدم غنائے ظاہری کا ہوسکتا ہے۔ مگر جو مقصود ہے غنائے ظاہری سے کہ کوئی مصلحت اٹکی نہ رہے۔ وہ مقصود اس طرح حاصل تھا۔ کہ وقتاً فوقتاً اس قدر مال آتا تھا۔ کہ سلاطین و امراء کی طرح آپ خرچ فرماتے تھے۔ جس میں یہ بھی حکمت تھی کہ آپ مقتدا تھے۔ اور مقتدا کیلئے وقعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ عرفاً مول سے ہوتی ہے۔ بشرطیکہ تمول پر تحول بھی مسلط ہو (یعنی سخاوت بھی ہو۔ کہ لوگوں کو دیتا دلاتا رہے۔ جس سے مال چلتا پھرے) چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے ظاہری غنا کی بھی یہ حالت تھی۔ کہ آپ نے حج وداع میں سو اونٹ قربانی کئے۔ جن میں تریسٹھ اپنے دست مبارک سے نحر کئے۔ جس کی کیفیت حدیث میں آئی ہے۔ کلھن یزدلفن الیہ۔ کہ اونٹ حضور کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تھا۔ گویا ہر ایک یہ چاہتا تھا۔ کہ پہلے مجھے ذبح کیجیے۔ سبحان اللہ کیا شان محبوبیت تھی ؎

همہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بکف	بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ شعر حضور ہی کی شان میں زیادہ چسپاں ہے۔ واقعی آپ تو ایسے ہی تھے۔ کہ جانور اپنی گردنیں خود آگے بڑھاتے تھے۔ اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش پہلے میں آپ کے ہاتھ سے ذبح ہوجاؤں۔ تو اتنے اونٹوں کا ذبح ہونا بدون ظاہری غنا کے کب ممکن ہے۔ اسی طرح آپ کی عطا اور سخاوت کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ نے سوسو دو دو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا فرمائے۔ ایک اعرابی کو بکریوں کا بھرا

خجگل عنایت فرمادیا۔ بحرین سے جب مال آیا۔ تو وہ اتنا تھا کہ مسجد میں سونے چاندی کا ڈھیر لگ گیا۔ اور حضور نے سب کا سب ایک دم سے بانٹ دیا۔ اور بعض صحابہ کو اتنا دیا۔ جتنا وہ اُٹھا سکتے تھے۔ ایسی نظیریں تو سلاطین کے یہاں بھی نہیں سُنی جاتیں۔ اور اس سے آپ کا غنائے ظاہری بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ غنائے ظاہری کی حقیقت مال کا رکھنا نہیں ہے۔ بلکہ مال کا خرچ کرنا ہے۔ وہ بوجہ اکمل ثابت ہو گیا۔ (انوار الیتامیٰ ص۳۱)

(۶۴) شہدار کی ارواح کا جنت کے سبز پرندوں میں ہونے پر شبہ کا جواب

جنت میں وہ جسم طیر شہدار کیلئے مرکب ہو گا۔ اُن کا حقیقی جسم وہ نہ ہو گا۔ بلکہ اُن کیلئے جسم انسانی دوسرا ہو گا۔ پس ارواح شہدار کا۔ جو اصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں ہم بہل اور بگھی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں۔ اگر پالکی اور بگھی بند ہو۔ تو دیکھنے والے کو بھی معلوم ہو گا۔ کہ پالکی اور بگھی آ رہی ہے ہمارا جسم اس کو نظر نہ آئیگا۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائیگا۔ کہ بگھی اور پالکی ہمارا جسم ہے۔ اور ہماری روح اس کے اندر حلول کئے ہوئے ہی۔ بلکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسکے اندر جو آدمی بیٹھا ہے۔ اس کا جسم بگھی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ محض اس کی سواری ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھئے۔ کہ جنت میں ارواح شہدا کے لئے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہو گا۔ اور اسکے اندر روح انسانی اپنے جسم کے ساتھ سوار ہو گی۔ پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا۔ یہ صورت جب لازم آتی کہ روح انسانی اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر جسم طیر میں حلول کرتی اور وہاں یہ بات نہ ہو گی۔ اب رہی یہ بات کہ وہ جسم انسانی کونسا ہے۔ جس کے اندر شہدار کی روحیں حلول کر کے جو اصل طیور خضر میں سوار ہونگی۔ آیا وہ یہی جسم عنصری ہے یا کوئی دوسرا جسم ہے۔ اس کی تحقیق کے لئے کشف کی ضرورت ہی۔ کیونکہ نص اس سے

ساکت ہے۔ اہلِ کشف کو معلوم ہوا ہے۔ کہ عالم برزخ میں انسان کو جسم مثال عطا ہوتا ہے جو اسی جسم عنصری کے مشابہ ہے۔ مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ لیکن یہ جسم مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہو گا۔ اور جنت و دوزخ میں یہی جسم عنصری پھر مل جائیگا۔ گو برزخ میں جسد عنصری کا ہونا کچھ محال نہیں۔ مگر خلاف مشاہدہ ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہوا ہے۔ کہ برزخ میں عذاب و ثواب ارواح کو جسم مثالی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ (ترجیح الآخرہ صد ۳۲)

(۶۴) عذاب قبر پر اعتراض کا جواب

احادیث میں جو عذاب و ثواب قبر کا ذکر ہے۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ ہمنے انسان کے مرجانیکے بعد اس کے جسم عنصری کا مہینوں پہرہ دیا ہے۔ ہمکو تو کچھ بھی عذاب و ثواب نظر نہیں آیا۔ جواب یہ ہے کہ برزخ میں انسان کو یہ دوسرا جسم عطا ہوتا ہے۔ جو کہ جسم مثالی ہے۔ عذاب و ثواب اُسی کو ہوتا ہے۔ لہذا جسد عنصری پر عذاب و ثواب محسوس نہونے سے اس کی مطلقاً نفی نہیں ہو سکتی۔ پھر بعض دفعہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ظاہر کرنے کے لئے۔ اس جسم عنصری پر بھی عذاب و ثواب کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ بعض لوگوں نے کسی مردہ کی قبر میں آگ جلتی ہوئی دیکھی۔ بعض لوگوں کو کسی قبر سے نہایت پاکیزہ خوشبو محسوس ہوئی۔ لہذا اس حدیث پر کوئی اشکال نہیں خوب سمجھ لو۔

(ترجیح الآخرۃ صلہ ۳۶)

(۶۵) اہلِ دنیا کے اس شبہ کا جواب کہ ہمنے دنیا کو آخرت پر اسلئے ترجیح دی ہے کہ اسکے منافع قریب عاجل اور یقینی ہیں اور آخرت کا دھانہ معلوم کب ملیگا

اس کا جواب بھی سُن لو۔ والآخرۃ خیر و ابقی۔ اس میں جواب ہے اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا

محض عاجل ہونا اسکی ترجیح کیلئے کافی نہیں۔ بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں
سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہی۔ مگر آخرت میں اسکے مقابل دو صفتیں
ہیں۔ ایک خیریت دوسرے بقا۔ یعنی دنیا سے آخرۃ عمدہ اور کثیر بھی ہے۔ اور پائیدار
رہنے والی بھی ہے۔ دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہی۔ نہ پائیداری ہے۔ اور ان
دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح
نہیں دیتا۔ کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو۔ تو پھر تجارت کبھی نہ ہوسکے
کیونکہ اس میں سرمایہ عاجلہ کو اُس وقت لگانا پڑتا ہے۔ اور نفع زائد آجل ہے لیکن
تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل
ہوتا ہے۔ اور سرمایہ اس وقت موجود ہے۔ بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجودہ
سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں۔ محض اس اُمید پر کہ آیندہ نفع زائد ملیگا۔ معلوم ہوا
کہ زیادۃ و کثرت کے مقابلہ میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پھر تم آخرت
پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور آخرت آجل ہے۔ تم نے
یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور کتنی عمدہ ہے۔ اسی طرح زراعت بھی دنیا
میں نہ ہوسکتی۔ کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آیندہ کی اُمید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔
اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو۔ بس زراعت کو بھی جواب دیدو۔ مگر تم ایسا
نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو۔ کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی اُمید ہی۔ پھر آخرت
کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہی (یعنی جلدی ملنے
والی ہے) اور یہ آجل ہی (یعنی دیر سے ملنے والی ہی) ارے وہ آجل ایسی ہے کہ اسکے
سامنے دنیا کسی قابل بھی نہیں۔ اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ ابقیٰ ہی
بہت پائیدار ہے۔ اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اسکے مقابلہ میں وصف
عجلت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اسکی صدہا نظیریں ہیں۔ ایک شخص آپ کو مکان
دینا چاہتا ہے۔ مگر اس کے پاس دو مکان ہیں۔ ایک تو کچا بنا ہوا ہے اور چھوٹا بھی ہی
اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے۔ اور وسیع بھی ہی۔ وہ آپ سے کہتا ہے۔ کہ اگر تم

پختہ مکان لینا چاہو۔ تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں۔ مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جاویگا۔ اور اگر کچا مکان لینا چاہو تو وہ ہمیشہ کیلئے تمہاری ملک کردوں گا اب تبلائیے آپ کیا کرینگے۔ یقیناً ہر عاقل یہی کہیگا۔ کہ بھائی اس عالیشان محل سے جو عاریتاً ملتا ہے۔ وہ کچّا مکان اچھا۔ جو دواماً ملک ہو۔ مگر افسوس تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو۔ کہ آخرت کو جو دوامی ہے۔ دنیا کے لئے۔ چھوڑتے ہو۔ جو چند روزہ ہے۔ انسان کی حیات ہی کیا ہی۔ بعضے لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے۔ اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے۔ اس ناپائیدار مردار کیلئے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لئے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتے ہیں۔ پھر مزہ یہ کہ یہاں معاملہ بر عکس ہے کہ دنیائے عاجل کوئی عالیشان و خوبصورت بھی زیادہ نہیں آخرت اس سے کہیں وسیع اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوبصورت و عالیشان ہی تو یہاں تم ایک کچے ناپائیدار مکان کیلئے جو عاریتہً مل رہا ہی۔ اور عاریت بھی سال دو سال کیلئے نہیں بلکہ ایک دو لمحہ کیلئے۔ کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ شاید نہیں نفس نفس بود ایسے عمدہ و عالیشان محل کو چھوڑتے ہو۔ جو دواماً تمہاری ملک کیا جاتا ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا وہ عذر کہاں گیا کہ صاحب دنیا تو ابھی مل رہی ہی اور آخرت کا معاملہ اُدھار ہی۔ صاحبو! دنیا تمکو ایک دو لمحہ کیلئے مل رہی ہے۔ جس میں کچھ راحت نہیں۔ کلفت ہی کلفت ہی۔ اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہی۔ جہاں رنج و غم کا نام نہیں جس کو دیکھ کر بیساختہ کہوگے۔ الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب رہا یہ شبہ کہ آخرت کا اُدھار ایسا ہی۔ کہ نہ معلوم کب ملیگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اُس وقت ہو سکتی ہے جبکہ موجل کے ملنے کا پورا یقین نہو۔ اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ موجل ضرور ملیگا۔ تو وہاں تاخیر زائد کی بنا پر عاجل کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ اب یہ دیکھو کہ آخرت کا وقوع محتمل ہی یا یقینی۔ فرماتے ہیں۔ ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم وموسیٰ یعنی آخرت کا آنا

ایسا یقینی ہی - کہ خبر متواتر سے ثابت ہی - ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کے وقت سے اس کی خبر ہر زمانہ میں دی جارہی ہے - لہذا یہ عذر بھی باطل ہوا اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے - مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہو جائیگا - اور مرنے میں دیر کیا ہی زندگی کا دومنٹ بھی بھروسہ نہیں - لہذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے - اور ایک تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کرکے اشارہ کیا گیا ہی - وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب اُدھار ہی نہیں - بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں - چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں - کہ اُنہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی - تو خدا نے انکو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح و عزت و راحت عطا فرمائی - کہ اُن کے دشمن مغلوب و مقہور ہوئے - اور وہ غالب و قاہر ہوئے - دشمنوں کے نام لینے والے بھی ناپید ہو گئے اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع و تعظیم کرنے والے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں - تو خیریت و بقار کا نمونہ دنیا میں بھی اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے - (ترجیح الآخرہ صفحہ ۴۴ تا ۴۷)

(۶۶) حسن یوسفی و جمال محمدی کی تحقیق

شاید کسی کو شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنانِ مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے - حضورؐ میں یہ بات کہاں تھی اس کا جواب یہ ہی کہ حسن کی انواع ہیں - حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کردے - اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے - یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا - چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی - اُنہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے - اور ایک نوع حسن کی یہ ہے - کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے - مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے - تحمل سے باہر ہوتا جائے - جس قدر غور کیا جائے - اُسی قدر

دل میں گھستا جائے۔ اسی کو ایک شاعر بیان کرتا ہے ؎

یزیدک وجهه حسنا		اذا ما زدته نظرا

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا۔ کہ اس میں دفعۃً متحیر کر دینے کی شان ظاہر نہ تھی (کیونکہ آپ میں خداداد عظمت وجلال کی ایک شان ایسی تھی۔ کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس کو حسن صورت کو آنکھ بھر کر نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی تاکہ تحیر کی نوبت آوے۔ کما فی حدیث علی من راٰہ بداھۃ ھابہ اخرجہ الترمذی فی الشمائل جامع) البتہ جتنا کوئی زیادہ پاس رہتا اتنا ہی حضور کا حسن اس پر منکشف ہوتا تھا۔ اور دن بدن دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا (کما فی حدیث علی المذکور ومن خالطہ بشاشۃ احبہ) یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہو جانا منقول ہے۔ مگر فی نفسہ یہ زیادہ بعید نہیں۔ بلکہ ایک فطری امر ہے۔ جو عادت کے مطابق ہے۔ گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے۔ اور حضور پر نور پر مرد عاشق تھے۔ جن میں بچے بھی تھے۔ اور بوڑھے بھی تھے۔ مردوں کا عاشق ہونا وہ بھی بچوں اور بوڑھوں کا فی نفسہ بھی بہت عجیب ہے۔ ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں۔ رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ فی حلۃ حمراء والقمر طالع فکنت اری الی القمر مرۃ والی وجھہ صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ فواللہ کان وجھہ احسن منہ (او کما قال) یعنی ایک رات میں نے حضور کو سُرخ (دھاریدار) جوڑے میں دیکھا۔ اُس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تو میں کبھی آپکے چہرہ پر نظر کرتا۔ کبھی چاند کو دیکھتا۔ بخدا آپ کا چہرۂ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اسی کو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے ؎

گہے بروئے تو گاہے بسوئے مہ نگرم	کنند مقابلہ چوں کس کتاب را تنہا

یعنی کتاب کے مقابلہ کیلئے تو دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تنہا کیونکر مقابلہ کروں۔ ایک مرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضی اللہ عنہ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو

حضور کا سپر بنایا تھا۔ کفار کے جتنے تیر آتے وہ سب کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے۔ تاکہ حضور کے کوئی تیر نہ لگنے پاوے۔ یہ عشق نہ تھا تو کیا تھا۔ اس کے علاوہ صحابہ کی محبت کے واقعات کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ بہت صحابہ نے آپ کی محبت میں گھر چھوڑا باہر چھوڑا۔ بیوی بچے چھوڑے۔ اپنے عزیزوں کو جبکہ وہ حضور کے مخالف ہوتے بیدریغ قتل کیا۔ حتی کہ خود اپنی جانیں حضور پر نثار کر دیں اور سر کٹوائے اسی حسن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

لواحی زلیخا لو رأین جبینہ	لآثرن بالقطع القلوب علی الید

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن دل میں گھسنا تھا۔ اگر آپ کو زنانِ مصر دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھوں کے دلوں کو چیر پھاڑ دیتیں۔ بس اجمالاً حضور کے حسن کے متعلق میں اتنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں۔ اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کیخلاف ہے۔ باقی اس بات میں تفصیلی گفتگو کرنا تو میرے مذاق کے بالکل خلاف ہی۔ کیونکہ اس میں ایہام تنقیص کا ہو جاتا ہے (الرفع والوضع صا۱)

(۶۷) بعض لوگوں کا یہ غلط خیال ہے کہ علماء کو غیر خدا سے خوف طبعی بھی نہ ہونا چاہیے

بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کو ایسا ہونا چاہیے۔ یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ کہ بس خدا ہی سے ڈریں اور کسی سے نہ ڈریں۔ اُن کے نزدیک علماء کو نہ شیر سے ڈرنا چاہیے نہ سانپ بچھو سے نہ توپ سے نہ بندوق سے نہ حکام سے نہ ڈاکوؤں سے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ موذی چیز سے انبیاء علیہم السلام کو بھی خوف طبعی ہوتا تھا۔ اگر یہ خوف طبعی توکل کے خلاف ہے۔ تو کیا معاذ اللہ انبیاء کو غیر متوکل کہوگے ہرگز نہیں۔ کس کا منہ ہے جو اپنے کو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ متوکل بتائے۔ مگر وہاں یہ حالت تھی۔ کہ نبوت کے بعد اُن کے دل میں فرعون سے بھی خوف تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں قالا ربنا اننا

نخافا ان یفرط علینا او ان یطغیٰ ۔ قال لا تخافا اننی معکما اسمع و اریٰ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے عرض کیا - کہ اے ہمارے پروردگار ہمکو فرعون کی طرف سے یہ خوف ہی کہ وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے - یا حد سے بڑھ جائے - باوجودیکہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو صریح اور صاف حکم ہو چکا تھا - اذھبا الی فرعون انہ طغیٰ ۵ فرعون کے پاس جاؤ - کیونکہ وہ سرکشی پر کمر باندھ رہا ہی - مگر باایں ہمہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے - آجکل کے بہادروں کی طرح اپنی بہادری ظاہر نہیں کی - کہ ہمکو نہ قتل کا خوف ہے نہ قید خانہ کا اندیشہ ہے - ہم بلا خوف خطر اس خدمت کو انجام دیں گے - بلکہ انھوں نے اپنے طبعی خوف کو حق تعالیٰ سے عرض کر دیا - کہ ہمکو اس کی زیادتی سے ڈر لگتا ہی - اور اس کا بھی اندیشہ ہی - کہ کہیں وہ ہمکو قتل نہ کر دے - اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف کا ہونا نبوت ولایت کے بالکل منافی نہیں - ورنہ حق تعالیٰ اس خوف پر انکار فرماتے - مگر حق تعالیٰ نے اس پر ان کو ذرا ملامت نہیں کی بلکہ تسلی دیکر فرمایا - کہ لا تخافا اننی معکما - تم ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں - اور دوسری جگہ ارشاد ہے - نجعل لکما سلطاناً فلا یصلون الیکما انتما و من اتبعکما الغالبون ط کہ ہم تمکو رعب عطا کریں گے - جس کی وجہ سے وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے - اور تم کو اور تمہارے متبعین ہی کو غلبہ حاصل ہوگا - جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے طبعی خوف کے ازالہ کا سامان کر لیا اُس وقت فرعون کے پاس تشریف لیگئے - اس سے معلوم ہوا - یخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ میں خوف طبعی کی نفی نہیں - بلکہ خوف عقلی کی نفی ہے - دوسرے یہ کہ یہ آیت تبلیغ احکام کے متعلق ہی اور مقصود یہ ہے - کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام میں سوائے خدا کے کسی سے ایسا نہیں ڈرتے کہ وہ تبلیغ سے مانع ہو جاویں - چنانچہ پوری آیت اس طرح ہے - الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ ط وکفیٰ باللہ حسیباً وہ انبیاء ایسے تھے - کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے - اور اللہ ہی سے

ڈرتے تھے۔ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کیلئے کافی ہے۔ اس میں تبلیغ احکام کے وقت۔ غیر اللہ کے خوف عقلی کی نفی کی گئی ہے۔ رہا یہ کہ ان کو کسی سے خوف طبعی بھی نہیں ہوتا۔ یہ اس آیت کا مفہوم نہیں۔ لوگ قرآن کو ادھورا پڑھتے ہیں۔ اس لیئے اشکال ہوتا ہی۔ پورے مضمون پر نظر کرنے کے بعد کچھ اشکال نہیں رہتا۔ غرض تبلیغ احکام کے وقت بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت خوف طبعی کسی درجہ کا لاحق نہیں ہوتا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کو فرعون سے طبعی خوف تھا۔ اسی لیئے انہوں نے حق تعالیٰ سے اپنا خوف ظاہر کر کے اس کا علاج چاہا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام ضرور کرتے ہیں۔ اور تبلیغ کے متعلق خوف عقلی تو ان کو صرف خدا سے ہوتا ہے۔ مخلوق کا خوف عقلی انہیں ذرا نہیں ہوتا۔ جس کے اثر سے خود طبعی مخلوق کا اثر ایسا غالب نہیں ہوتا۔ جو تبلیغ سے رد کرے۔ بلکہ اگر کسی وقت مخلوق سے ان کو خوف طبعی ہوتا بھی ہے۔ تو وہ خشیت خداوندی سے مغلوب ہو جاتا ہے پس مخلوق کی خوف عقلی کی تو مطلقاً نفی ہے اور خوف طبعی کی مطلقاً نفی نہیں۔ بلکہ اس کے غلبہ کی نفی ہے۔ اب یہ مضمون انشاء اللہ کسی نص سے متعارض نہ ہوگا۔ اس پر شاید یہ کوئی کہے۔ کہ پھر علماء کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کہ مخلوق سے خوف عقلی ان کو ذرا نہ ہو۔ اور خوف طبعی اگر ہو۔ تو خوف خداوندی سے مغلوب ہو۔ اس پر غالب نہ ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ علماء کے ذمے تبلیغ فرض ہوئی ہی۔ وہاں بیشک ان پر خوف خداوندی ہی غالب ہوتا ہے۔ مخلوق کا خوف طبعی غالب نہیں ہوتا۔ مگر جہاں ان پر تبلیغ فرض ہی نہ ہو محض مستحب ہو۔ وہاں اگر ان کو مخلوق سے طبعی خوف ہو تو اس میں کیا حرج ہے۔ بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان پر تبلیغ ہر حالت میں فرض ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ جن علماء کو تم خائف کہتے ہو وہ اس خوف کی وجہ سے کسی فرض و واجب کو ترک کر دیتے ہیں۔ یا مباح و مستحب کو۔ اگر تم انصاف سے دلائل میں غور کرو گے۔ تو تم کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ وہ مخلوق کے خوف سے کسی فرض و واجب کو ہرگز ترک نہیں کرتے

بلکہ محض بعض مباحات۔ یا بہت سے بہت بعض مستحبات کو ترک کر رہے ہیں سو ایسی حالت میں وہ یخشونہ ولا یخشون احدً الا اللہ کے خلاف کیونکر ہو سکے۔ بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں۔ کہ جن مسائل کی تبلیغ آجکل کے بہادر لوگ کر رہے ہیں علماء بھی ان سب کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ صرف عنوان کا فرق ہے۔ بہادران قوم مقابلہ اور سب وشتم کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں اور جن کو تم خائف کہتے ہو۔ وہ تہذیب اور نرمی کیساتھ ان مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ اب صرف اس بات کا فیصلہ باقی رہا کہ مخالفین اسلام کے سامنے آیا ہم کو مقابلہ اور سب وشتم کے ساتھ احکام کو ظاہر کرنا چاہیئے۔ یا نرمی اور تہذیب کے ساتھ۔ سو اس کا فیصلہ خود قرآن نے کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر جب فرعون کے پاس تبلیغ احکام کیلئے جانے کا حکم فرمایا تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا وقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشیٰ اور فرعون سے نرمی کیساتھ بات چیت کرنا۔ شاید ان کو نصیحت ہو جاوے یا خدا کا خوف اسکے دل میں آجاوے۔ دیکھ لیجئے موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کون متوکل ہوگا اور فرعون سے زیادہ ظالم و سرکش کون۔ مگر باینہمہ یہ حکم ہو رہا ہے کہ اس سے نرمی کیساتھ گفتگو کیجئے گا۔ صاحبو! قاعدہ یہی ہے۔ کہ جب کسی مخالف پر اپنا زور اور دباؤ نہ ہو تو وہاں مقابلہ اور سختی نافع نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر مضر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع میں اکثر نرمی ہی سے کچھ نفع ہوتا ہے۔ جامع) (حرمات الحدود ص۱۲۱)

(۶۸) جنٹلمینوں کا انگریزی کو علم میں شمار کرنا غلطی ہے

جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں۔ انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں۔ اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں اطلبوا العلم ولو بالصین (ترجمہ) علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں بھی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے چین سے بھی طلب علم کی ترغیب دی ہے۔ حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا بلکہ محض دنیاوی علم تھا معلوم ہوا۔ کہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں۔ خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا۔ پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل۔ ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔ (قلت ذکرہ فی المقاصد طریقین وقال ھو ضعیف من الوجھین وقال ابن حبان انہ باطل لا اصل لہ اخرجہ ابن الجوزی فی الموضوعات قال واخرجہ البیھقی فی الشعب قلت فدالتزم ان لا یخرج موضوعاً فالاشبہ الحکم علیہ بالضعف والضعیف لا یحتج بہ الاحکام جامع) اور اگر ثابت بھی ہو تو ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے لفظ ولو پر نظر نہیں کی یہ لفظ فرض کیلئے آتا ہے مطلب یہ ہی کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کرکے حاصل کرنا چاہیئے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم و مستبعد ہو۔ موجود کو فرض نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوا کہ حضور کی مراد اس حدیث میں وہی علم ہے۔ جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا۔ اس لئے یہ بطور فرض کے فرما رہے ہیں۔ کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو۔ اور علم دین ہی ہی۔ ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا۔ کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو گیا۔ تو ہر ایک بھنگی اور چمار کو بھی عالم کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہی۔ جو کام وہ کرتا ہے۔ اس کو وہ خوب جانتا ہے۔ اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے۔ تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے۔ اور خیر جانے دیجئے۔ ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے۔ مگر ہم کہتے ہیں۔ اطلبوا العلم ولو بالصین میں تو تصریح نہیں۔ کہ اس سے کونسا علم مراد ہے۔ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے۔ بس علم شرعی وہ ہے۔ جس کو شریعت علم کہتی ہے جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں وہ فرماتے ہیں: ع علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است۔ اور حدیث میں ہی۔ الدنیا ملعونۃ وما فیہا ملعون الا ذکر اللہ وما والاہ الحدیث معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیائے ملعونہ ہے۔ اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں۔ اب میں آپ ہی سے

پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قرب ہوتا ہے۔ وصل ہوتا ہے یا فصل۔ قرب ہوتا ہے یا بعد۔ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے۔ گو چاہیئے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب بڑھتا کیونکہ اس سے قدرت صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے۔ اور اپنا عجز زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لئے اُن کے مقاصد بہت وسیع ہیں۔ جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں۔ جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے۔ زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے۔ بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں۔ جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں۔ جو کھلی دلیل ہی عجز کی۔ مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے۔ بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہو گئی اس پر نازاں ہوتے ہیں۔ کہ ہمنے یہ ایجاد کر لی۔ ڈلے پتھر ایجاد کر لی۔ اگر ایجاد تمہارے اختیار میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کر لی۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے۔ کہ سوچو اور غور کرو۔ باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آجانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے۔ یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ مگر عادت الٰہیہ ہی۔ کہ جب کسی بات کیلئے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھولدیتے ہیں۔ اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کیلئے ہزار غور و فکر کے بعد حقیقت ظاہر نہیں کرتے۔ چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی۔ کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے۔ اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں۔ اگر غور و فکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کر لیا۔ غرض تجربے سے یہ بات مشاہد ہے کہ کچھ عوارض کہ بمنزلہ لوازم کے ہیں۔ آپ سے جمع ہو رہے ہیں کہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا۔ بلکہ بعد ہی ہوتا ہے۔ تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔

ہاں ایسے لوگوں کو ایسا علم دین البتہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آجکل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں۔ کہ کسی جگہ نماز کا وقت آگیا۔ اور پانی نہ تھا۔ تیمم کی ضرورت ہوئی۔ تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمم کیا۔ کہ اول تو مٹی کو ہاتھ پیر بہایا۔ جیسا پانی کو بہایا کرتے ہیں۔ پھر کلی کرنے کیواسطے منہ میں ڈالتے اور مسح کیلئے سر پر بھی ڈالتے اور پیروں پر بھی مٹی بہاتے۔ مگر منہ میں دیتے ہوئے بعض لوگ ہنس پڑے اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم آتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے۔ بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے تو اس میں کچھ حرج تھا۔ مگر پوچھتے کس طرح لیڈر ہو کر اپنے جہل کو کیوں ظاہر کریں۔ گو مٹی سے کلی کر کے اس سے زیادہ جہل ظاہر کر دیا۔ اور مزا یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر ہی رہے۔ یہ حالت قوم کی ہے۔ کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا۔ ان ہی حضرت کا یہ واقعہ بھی ہے۔ کہ ایک دفعہ موٹر میں سوار تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ موٹر ٹھیرایا گیا۔ اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی۔ حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے۔ مگر اُنہوں نے موٹر کے اندر بیٹھ کر ہی پڑھی۔ بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہو گیا۔ جبکہ موٹر کھڑا ہوا تھا۔ چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو۔ تو بیٹھ کر نماز کی گنجایش ہی ہے۔ مگر موٹر میں تو چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجایش نہیں۔ کیونکہ اس کا ٹھیرا لینا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل کا ٹھیرانا ہمارے اختیار میں نہیں۔ اور اگر موٹر کھڑا ہوا ہو۔ تب تو کسی طرح ترک قیام کی گنجایش نہیں۔ مگر ان لوگوں نے تو محض لیڈر بننے کیلئے نماز شروع کی ہے۔ اس لئے نماز بھی لیڈری میں ادا ہوتی ہے۔ شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے۔ گو ایسی غلطیاں دیہاتیوں سے بھی ہوتی ہیں۔ اور ان کو بھی مسائل کا علم نہیں مگر وہ اپنے کو تعلیم یافتہ تو نہیں کہتے۔ نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بلکہ بیچارے اپنی جہل کا اقرار کرتے ہیں۔ تو گو ان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو۔ مگر شاید اُن کے عجز و نیاز کی وجہ سے اُن کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے۔

چاہے ہنوز کیسی سزا کے بعد ہی سہی - حق تعالیٰ کو عاجز پر رحم آتا ہی - اس لئے بعض دفعہ گنہگاروں کو ان کی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے - اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تصوف اور تقویٰ دھرا رہجاتا ہی (الھدیٰ والمغفرۃ صہ ۱۳)

(۶۹) حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جنت مانگنے پر شبہ کا جواب

اللھم انی اسئلک الجنۃ وما قرب الیھا من قول او عمل (ترجمہ) اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں - اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں - جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو - قول ہو یا عمل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہی - کیونکہ حضور کی یہی حالت تھی - تو سمجھ لیجیے - کہ ارفع تو وہی حالت ہے - کہ محض رضائے محبوب کیلئے عمل کیا جائے - رہا حضور کا جنت مانگنا - سو اسکے متعلق وہ بات یاد کر لیجیے - جو میں نے پہلے بیان کی ہے - کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے - پس آپکا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے - ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہمکو آرام ملیگا - حوریں ملینگی خوب مزے اُڑیں گے غرض ہمکو حظ نفس مطلوب ہے - اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا - کہ وہ خدا کی چیز ہے - اور خدا تعالیٰ نے آپ سے مانگنے کا امر فرمایا ہے - جب محبوب خود چاہے - کہ مجھ سے میری چیز یں بھی مانگو تو اُس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہی - اس وقت استغنا مناسب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین ۔۔۔ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اس لئے آپ نے جنت مانگی اور اس سے استغنا نہیں برتا - عارف کامل خدا کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغنا ظاہر نہیں کر سکتا - چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اصل النعم ہے - وہاں کوئی ابن العارض جیسا صاحب حال ہو - تو وہ بلا سے استغنا ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبۂ حال سے معذور ہوں گے - ورنہ معرفت کا مقتضا یہی ہے - کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے - اس طرح اور جس چیز کا اُسے

مانگنا پسند ہو۔ وہ بھی مانگے۔ اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے۔ کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور صلے اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے۔ کہ وہ محل دیدار ہے۔ تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا۔ بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎ عاشقاں جنت برائے دوست میدارند دوست۔ اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا۔ بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے۔ کہ ہماری شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں۔ تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہی۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ وہ لوگ بڑے حوصلے کے ہیں۔ جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبۂ خضراء ہی ہمیں نظر آئے ؎

مرا از زلف تو موئے بسند است ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

تو بعض دفعہ غلبۂ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہی۔ کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس لئے تمنا کرتا ہے۔ کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں۔ کاش اُس کے شہر ہی میں جا رہوں۔ اور کبھی اپنی احتیاج وافتقار ظاہر کرنے کیلئے جنت کی طلب کی جاتی ہے۔ کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج تو کیوں نہ ہوں گا۔ میں تو جنت تک بھی محتاج ہوں۔ اس لئے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے۔ کہ اے اللہ جنت دیدے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا۔ تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنی عنہ ربنا۔ یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا ہی۔ اس لئے کھانے کو اٹھا دیا ہے۔ ہم اس کو ہمیشہ کیلئے وداع نہیں کرتے۔ نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں۔ اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغنا ہے۔ حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ

حالت ہے۔ کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم		کرشمہ دامن دل میکشید کہ جا اینجاست

آپ کی جس ادا کو بھی دیکھو۔ اس میں غضب کی دلربائی ہی۔ پھر کمال یہ کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف بلکہ ایک بیساختہ حال ہے ؎

دلفریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند		دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپکی سچائی کی شہادت دی۔ اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور میں جس قدر کمالات تھے۔ وہ اصلی تھے۔ تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک مبنیٰ طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہی۔ یعنی اظہار احتیاج بس حضور کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں (اور آپ کے سوال کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کا جو منشاء آپکی شان کے مناسب تھا۔ وہ اپنے علم کے موافق عرض کر دیا) لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے۔ تو وہ بھی راہِ صواب پر ہے۔ غلط راستے پر نہیں۔ خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیئے۔ خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو۔ یا جنت کے واسطے سے ہو سب ٹھیک ہے ؎

بجنت اگر مدد کند دامنش آورم بکف		گر بکشند زہے شرف ور بکشم زہے طرب

یعنی مقصود قرب ہے۔ بس قرب ہونا چاہیئے۔ خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ کہ مقصود تو کام چلنا ہے۔ کہ بندہ کو خدا کی اطاعت و ذکر کی توفیق ہو جاوے۔ اب وہ خدا کی براہ راست محبت سے ہوا تو کیا۔ اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا۔ دونوں رستے ٹھیک ہیں (اور دونوں بڑھیا ہیں۔ گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع) (ذم النسیان ص۴۸)

(۲) انبیاء علیہ السلام کو حب دنیوی اسباب سے تعلق نہیں ہوتا۔ تو چاہیئے کہ ان سے مفارقت سہل ہو۔ پھر ان کا نزع کیوں شدید ہوتا ہے،

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی۔ حتی کہ حضرت عائشہؓ

رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ حضور کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھکر اس کی تمنا نہیں کرتی۔ اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ تو بات یہ ہے کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں۔ جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا۔ اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں۔ جیسے جائداد اور مال وغیرہ کی محبت۔ ان سے جو نزع میں شدت ہوتی ہے۔ اس سے تکلیف سخت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ تعلقات ہیں۔ جو آخرت سے مانع نہیں ہیں۔ بلکہ معین آخرت ہیں۔ اور یہ وہی تعلقات ہیں۔ جو اس۔ کے مصداق میں داخل ہے۔ ع اسیرش نخواہد خلاصی زبند۔ اس کی تعیین عنقریب آتی ہے۔ اس سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے۔ مگر اس سے روحانی تکلیف نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا منشاء قید لذیذ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذات حق کے کسی سے نہیں ہوتا۔ اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے۔ مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے۔ اور یہ بدون توجہ الی الخلق کے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے۔ اور اصلاح و ارشاد کیلئے اُن سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے۔ اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا۔ بلکہ موجب اجر اور سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہوگا۔ اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا۔ چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کے ساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ اور انبیاء میں بھی ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سپرد سب سے زیادہ یہ خدمت تھی۔ کیونکہ قیامت تک آنیوالی مخلوق کیلئے آپ ہی رسول ہیں۔ آپکے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں۔ تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد و اصلاح کی فکر و اہتمام تھا۔ اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہوئی۔ کیونکہ روح کو امت کیساتھ تعلق تھا۔ اور وصال

کے وقت بھی آپ کو ان کا اہتمام تھا۔ مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوشگوار تھا۔ آپ کیلئے اسمیں اجر اور ترقی درجات تھی۔ اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی۔ مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ انبیاء کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوئے ہیں۔ جن کے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے۔ ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے۔ مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے۔ اس لئے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح وارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے۔ اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ ان کو نہ کسی کا فکر ہے۔ نہ کسی سے تعلق ہے۔ ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں۔ بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔ بعضے ہنستے ہوئے جان دیتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم	رحت جاں طلبم درپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم	جسم بگذارم سراسر جاں شوم

اُن کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل ہیں۔ جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے۔ کیونکہ وہ موت کیوقت اُن کے برابر بے فکر نہیں ہوتے۔ ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے۔ اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے۔ مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں۔ بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں۔ جو صاحب ارشاد ہیں۔ کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہے۔ اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا۔ وہ دوسروں سے افضل ہوگا۔ لیکن ہم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے۔ کہ اپنے لئے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔ بس بادشاہ کو اختیار ہے۔ کہ تمہارا امتحان لے کر جو عہدہ جس کو چاہے دیدے (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۲۱)

(۱۷) تفاضل تفصیلی بین الانبیا ممنوع ہے

آجکل ایک سیرت نبویہ شائع ہوئی ہے جس کو تعلیمیافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں۔ کیونکہ کاغذ چکنا اور لکھائی عمدہ ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی ایسا ہی ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کسی نبی کی سیرت ہے۔ کیونکہ کمالات نبوت سے اس میں بحث ہی نہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے۔ زیادہ تر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تدبیر وانتظام ہی کا پہلو دکھلایا گیا ہے۔ اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت کا ذکر بھی ہے۔ تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاء میں نقص نکالا گیا ہے۔ چنانچہ شروع ہی میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ حضورؐ تمام کمالات کے جامع تھے۔ اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے۔ کسی میں کوئی صفت تھی۔ کوئی نہ تھی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ وہ رحم سے خالی تھے۔ اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی قوم کیلئے سخت بددعا کی تھی رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا ۵ (اے پروردگار زمین پر کفار میں سے کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیئے۔ سب کو تباہ کر دیجیئے جامع)۔ یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رہی دلیل تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو سمجھایا۔ غور کیجیئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد ہے۔ اتنی مدت تک ان کی اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے۔ ذرا کوئی کر کے تو دکھلائے۔ نوسو برس تو کیا۔ نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے۔ کہ اتنی مدت تک قوم کی بدحالی اور

ے یہ سیرت مولوی شبلی نعمانی نے شائع کی ہے۔ علی محمد۔

ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے۔ اور بد دعا نہ فرمائی۔ اس مدت کے بعد اگر وہ از
خود بھی بد دعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے۔ چہ جائیکہ اُنہوں نے
خود بد دعا نہیں فرمائی۔ بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا۔ کہ اب ان میں سے
کوئی ایمان نہ لائیگا۔ اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے۔ اُس وقت
بد دعا فرمائی۔ تبلائیے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہی ہو جائے۔ تو
اس وقت اُن کا باقی رہنا بہتر ہے۔ یا ہلاک ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا
میں کچھ فائدہ نہیں۔ بلکہ اندیشہ فساد ہے۔ کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے۔
اُس وقت اُن پر بد دعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہی
چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بد دعا میں اس بات کو ظاہر فرما دیا۔ انک ان تذرھم
یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا (خداوندا اگر آپ ان کو زندہ
چھوڑ دیں گے۔ تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔ اور کافر
و فاجر کے سوا کسی کو نہ جنیں گے) اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس
سے نہیں فرمائی۔ بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اب ان میں یا ان کی اولاد
میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا۔ واوحی الی نوح انہ لن یؤمن من قومک الا من
قد آمن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون ۵ تو بتلائیے اس حالت میں اگر نوح
علیہ السلام اُن کیلئے بد دعا نہ فرماتے۔ تو اس کا انجام کیا ہوتا۔ ظاہر کہ اس وقت
تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی کم معدودے چند تھے اور
کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا۔ کہ یہ نہ خود ایمان لائیں گے۔ نہ اُن کی اولاد میں
کوئی مومن ہوگا۔ اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا۔ کہ یہ سب ایماندار
ہی ہوں گے۔ بلکہ ان میں ایماندار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونیوالے تھے۔
بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونیوالا تھا۔ اب اگر اس زمانہ کے
کافر غرق نہ کئے جاتے اور ان کی اولاد بھی اُس وقت موجود ہوتی۔ تو مسلمانوں
کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔ (احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت

جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں۔ جب
تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اسقدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آرہا ہے۔ تو دنیا بھر
کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہوتا۔ سب کافر ہی ہوتے۔ اس مقدمہ
کے ملانیکے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے
حال پر بہت ہی رحم فرمایا۔ جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بد دعا کی۔ ورنہ آج کفار
کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی۔ اور ان کو جینا محال ہوتا) غرض اس
سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم
کے واسطے ایسی سخت بد دعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اُس نے دوسرے
پہلو کو نہ دیکھا کہ اُن کی یہ بد دعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل
ہے سراسر رحم تھی۔ ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دوبھر ہو
جاتا۔ یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا۔ اس کے بعد لکھا ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام
میں تمدن و سیاست کا مادہ نہ تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کونسی وحی آگئی تھی۔ یا
اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ
مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں) کچھ نہیں اس اعتراض کا منشا صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ
السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اس سے
ان حضرت نے یہ استنباط کر لیا۔ کہ ان میں یہ مادہ ہی نہ تھا۔ حالانکہ عدم ظہور شے
ظہور عدم کو مستلزم نہیں۔ بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کرنے کا موقع نہ ملے
تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں۔ ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ
دیکر دیکھو۔ اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے۔ اُس وقت تم کو اس بات کا حق ہے۔ ورنہ
دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقعہ ہی
نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن و سیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آگیا۔ اور تم نے کیونکر
سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں۔ یہ بات تو جب چل سکتی تھی۔ کہ ان کو سلطنت
کا موقعہ ملتا۔ اور پھر انتظام نہ کر سکتے۔ پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہو گیا۔ اب میں

ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے۔ گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا۔ اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کیف انتم اذا نزل فیکم عیسیٰ بن مریم عدلا مقسطا او کما قال) تمہارا کیا حال ہوگا اُس وقت جبکہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آویں گے۔ عادل منصف ہو کر حکومت کریں گے۔ تو حضور نے اس وقت سے مسرت فرمائی جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے۔ اور آپ اُن کے متعلق عدل و اقساط کی خبر دے رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہو سکتا۔ عدل وہی کر سکتا ہے۔ جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو۔ نیز احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اُس وقت بہت امن و امان اور خیر و برکت ہوگی۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے۔ اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں۔ تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کریں گے۔ پس معلوم ہوا۔ کہ اس شخص نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے۔ وہ نہایت لغو ہے۔ حضور کے کمالات ثابت کرنے کا یہ کونسا طریقہ ہے۔ کہ آپ کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے۔ کیا حضور اس سے خوش ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یاد رکھو انبیاء علیہما السلام کامل ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہی کہ ہمارے حضور اکمل ہیں۔ تفاضل بین الانبیاء سے اسی واسطے منع کیا گیا ہے۔ کہ حضور کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔ الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق مختلف باہم ہیں۔ مگر کامل سب ہیں۔ اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔

(العبرۃ بذبح البقرہ صـ۲۴)

(۲۷) بعض لوگ اہلِ عرب کی جہالت و وحشت کو بہت ہی غلط اور بدنما بھدے عنوان سے بیان کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں

سر سید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہی۔ حتیٰ کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ شتر کینہ مشہور ہے۔ مولوی محمد علی صاحب نے سر سید کی تفسیر کے رد میں ایک کتاب البرہان بہت ہی عمدہ لکھی ہے۔ بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے انھوں نے اس اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ اوّل تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا۔ یہ عجیب طریقہ استدلال ہے۔ پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں۔ کہ شتر کینہ جو مشہور ہے یہ عرب کا محاورہ ہی یا فارس کا۔ ظاہر ہے کہ یہ عرب کا محاورہ نہیں۔ فارس کا ہے تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا۔ عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا۔ اور اگر مان لیا جاوے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا۔ اس کی دوسری خوبیوں کو بھی تو بیان کیا ہوتا ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے۔ تو ہزار باتیں مدح کی ہیں۔ اس میں تحمل و جفاکشی بہت ہے۔ قناعت کا مادہ بہت ہے۔ عرب کے اونٹ مطیع و منقاد بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے۔ کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کیلئے اسکی گردن کو جھکایا وہ فوراً گردن کو زمین پر رکھ دیتا ہے۔ پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس طرح اٹھاتا ہے۔ کہ سوار نہایت سہولت سے پشت پر پہنچ جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے اس طرح چڑھتے اترتے ہیں۔ اونٹ کی لمبی گردن

سیڑھی کا کام دیتی ہے۔ تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے۔ تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہلِ عرب کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں جن کی اصالت ونجابت وشرافت ضرب المثل ہے کہ وہاں کے گھوڑے مالک کے ساتھ ایسے وفادار ہوتے ہیں۔ جنکو سب جانتے ہیں (لڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک زخمی ہو کر گرا چاہتا ہے۔ تو وہ اُس وقت دشمن پر حملہ کر کے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان سے اس کو لے بھاگتا ہے) اگر یہی طریقہ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفات حمیدہ سے بھی تو اہلِ عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہیئے تھا مگر کچھ نہیں آجکل لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ اہلِ عرب کی جہالت ووحشت کو بہت ہی غلط اور بدنما بھدے عنوانوں سے بیان کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں۔ کہ آپنے ایسے جاہلوں کی اصلاح کی ایسے وحشیوں کو متمدن بنایا۔ ان لوگوں کی نیت تو اچھی ہے۔ مگر عنوان نہایت بُرا ہے۔ اوّل تو بات اتنی کہنی چاہیئے جتنی اصلیت ہو۔ اہل عرب میں حضور کی بعثت سے پہلے جہالت ووحشت ضرور تھی۔ مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ پھر جتنی جہالت تھی۔ اُسکے ساتھ اُن کے کمالات وصفات حمیدہ کو بھی تو بیان کرنا چاہیئے۔ جو ان میں خود زمانہ جہالت میں تھیں۔ اہلِ عرب میں ہمیشہ سے شجاعت کا جوہر موجود تھا۔ زبان کے بڑے پکے تھے۔ جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ وفاءعہد ان کی ضرب المثل ہے۔ خیانت سے بہت ہی نفرت کرتے تھے۔ مہمان نواز اور سخی نمبر اول تھے۔ اور ایک بات تو اُن میں ایسی تھی۔ جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب وہ دشمنوں کے ساتھ اپنے مقابلہ اور لڑائی کا ذکر کرتے ہیں۔ تو دشمن کی شجاعت وبہادری کا دل کھولکر تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے بہادر ایسے کریم ایسے دلیر تھے۔ حتیٰ کہ کبھی مقابلہ میں اپنا پس پا ہونا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہل عرب کی خاص صفت ہے۔ اس پہلو کو بھی بیان کرنا چاہیئے

تاکہ ناظرین وسامعین کو اہل عرب سے نفرت نہ پیدا ہو۔ اُن کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو۔ مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ کہ اپنے نبی کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل وحقیر کرے اور اس طرح اُن کا ذکر کرے۔ جس سے قلوب میں۔ اُن سے نفرت پیدا ہو۔ جیسا سرسید نے کیا ہے۔ اس لئے مولانا محمد علی صاحب کو غصہ آیا اور اس کا خوب جواب دیا۔ خدا ان کو جزائے خیر دے (البصرۃ بذبح البقرہ صفحہ ۶۹)

(۷۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح فرمانے میں کیا حکمت تھی

حضور کے مزاح میں تو مصالح کیوں نہ ہوتیں۔ عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں۔ حضور کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے۔ جس میں ایک کام تو آپ کا پہنچا دینا۔ اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے جس کیلئے حضور کی خدا داد ہیبت کسی قدر مانع ہو سکتی تھی۔ کیونکہ حضور کو حق تعالےٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا۔ اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور فیض لینے کیلئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اُس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا۔ پس یہ حال ہو جاتا ہے ؂

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے	تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ کر آتا ہے کہ یوں کہوں گا۔ یہ پوچھوں گا۔ صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔ ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں ؂

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا	سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاح فرمایا کرتے

تھے۔ تاکہ اُن کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں۔ اور حضور کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہوگی۔ جب حضور کے غلامانِ غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ دفعۃً پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ حالانکہ یہ وہ حضرات تھے۔ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پیر بھائی تھے۔ جن میں گونہ مساوات ہوا کرتی ہے۔ مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات تو معتقد تھے۔ تو سُنئے کہ غیر معتقدین پر آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا۔ کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے ؎

گفت کو قصر خلیفہ اے حشم	تا من اسپ و رخت را آنجا کشم
قوم گفتندش کہ او را قصر نیست	مر عمر را قصر جان روشنی ست

(اس موقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہو گیا مگر بہت ضبط سے کام لیا) لوگوں نے کہا کہ عمر کیلئے نہ قصر ہے۔ نہ ایوان ہے۔ بس اس کا دل ہی قصر و ایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی۔ کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کانپتے ہیں۔ اس کے نہ محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر اُس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں۔ اور کبھی بازاروں میں۔ گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ تلاش کر لو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں نکلا۔ معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے۔ جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس۔ آخر وہ جنگل کی طرف چلا۔ جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا۔ جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑے سوئے تھے۔ قدم رکھتے ہی اُس کے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر

پڑا ہوا تھا۔ اور قاعدہ ہے۔ کہ جہاں شیر پڑا ہوتا ہے۔ اُس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے۔ نہ جاہ وحشم ہے۔ نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تنہا پڑا سو رہا ہی نہ اُسے کسی دشمن کا خوف ہی۔ نہ جاسوس کا ڈر۔ سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کی بجائے رکھی ہے۔ نہ کوئی فرش ہے نہ بستر۔ بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہی۔ اور بے فکر سو رہے ہیں۔ اس حالت کا مقتضا یہ تھا۔ کہ سفیر کے دلمیں خلیفہ کی بیوقعتی ہوتی۔ مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا۔ کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا۔ جونہی نظر پڑی ہے پیر اُٹھانیکی ہمت نہ رہی۔ مولانا فرماتے ہیں۔ کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دلمیں کہہ رہا تھا کہ میں نے تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں۔ جن کے دربار میں رعب وداب کے ہزار سامان ہوتے تھے۔ مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہوا۔ آج کیا بات ہے کہ اس بے سر و سامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے۔ آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے۔ کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہو گیا بیشک

ے	ہیبت حق است و این از خلق نیست		ہیبت آن مرد صاحب دلق نیست	

یہ خدائی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ بالآخر سفیر روم کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمر کو خود جگائے۔ وہ تو اپنی جگہ پر دیر تک کھڑا کانپتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے۔ تو دیکھا کہ اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے۔ آپ نے اس کو پاس بلایا اور تسلّی دی۔ جس طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا۔ کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو۔ میں تو اس غریب عورت کا بچّہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کی باتیں سُننے کے بعد ہیبت مبدل بہ محبت ہو گئی۔ اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا۔

کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے۔ بہر وہ اسلام سے مشرف ہو گیا۔ یہ تو حضرات صحابہ کرام کی حالت تھی۔ ہمنے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کو اُن سے بات کرنے کی ہمت نہوتی تھی۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے رعب و ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولنا سے بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے۔ حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رُکتے اور جھجکتے اور ڈرتے تھے۔ اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیارے ہوتے ہیں۔ بات بات میں ان کو غصہ آجاتا ہے۔ اس لئے اُن کے پاس جاتے ہوئے لوگ کانپتے ہیں۔ جیسے مولانا شاہ فضل الرحمن تھے یا آجکل بھی ایک بدنام ہے (ہائے۔ ہزار نام خدا لئے تو بدنام مئے تو۔ جامع) مگر مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا۔ میں نے تو کبھی بھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا۔ اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کیلئے مانع فیض ہو جاتی ہے۔ اس لئے حضرات انبیا علیہم السلام و اولیائے کرام اپنے اصحاب سے گاہے مزاح کر لیتے ہیں۔ تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت و محبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہو جائے (الاسعاد والا بعاد صنہ۳)

(۹۷) اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہی ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہی

بعض جگہ حضور کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا۔ تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہو۔ اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں۔ اگر پہلے ہی یہ فرما دیا جاتا کہ خدا کا راستہ ہے۔ اس پر چلو۔ تو لوگ یہ سنکر گھبرا جاتے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاً دشوار ہے۔ اُن کی تو یہ شان ہی ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم	وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

خدا تعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہنچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں

آتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات اورا گنج کو	تا در آید در تصور مثل او

یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہی مثنوی کو جس گنج دا ور جس گوشہ) سے نکالو گے سب ایسا ہی نکلے گا۔ کسی کے پاس اس کی کنجی نہ تھی۔ صرف حضرت حاجی صاحب ہی کے پاس اس کی کنجی تھی۔ حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ میں ایک دفعہ ایک شیخ کو گنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اس کے معنی بتاتے ہیں وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے۔ مگر کوئی بات بنتی نہ تھی۔ حضرت نے اصلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے بمعنی گنجایش کے۔ بس اس کو سُنکر وہ شیخ پھڑک ہی تو گئے۔ اب شعر کے معنے بے تکلف ظاہر ہو گئے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجایش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجایش نہیں۔ حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے۔ جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے۔ جب حق تعالیٰ کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں۔ تو اگر ابتداءً ہی اسلام کو صراط اللہ کہدیا جاتا یعنی حق تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی۔ تو لوگ گھبرا جاتے اور اس سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں۔ پس اسی طرح ان کا رستہ بھی نہ معلوم کتنا دور دراز ہوگا۔ اس لئے پہلے اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا۔ کہ لوگوں سے کہدیجئے کہ یہ تو میرا رستہ ہے۔ اس پر چلو اور حضور تک سبکی رسائی ممکن ہے۔ آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں۔ پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں اس لئے سُن کر ہمت بندھی۔ کہ یہ تو رسول اللہ کا راستہ ہے۔ اور آپ ذہن سے بہت دور نہیں ہیں۔ تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا۔ بلکہ نزدیک ہوگا۔ یہ فائدہ ہوا کہ آپ کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا سہل و نزدیک ہونا معلوم ہو گیا۔ پھر جب حضور تک رسائی ہو گئی۔ اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا۔ اور حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صرف داعی ہیں۔ آپ خود بھی اسی راستہ پر آ

چل رہے ہیں - یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی - کہ حق تعالیٰ اسکے طے کرنے میں بندونکی امداد فرماتے ہیں - چنانچہ حضور نے اس راستہ کو طے کرلیا ہے - معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں - تو ہم بھی اس کو طے کرسکتے ہیں - خصوصاً جبکہ حضور (جو واقف طریق ہیں) ہمارے معین و رفیق ہیں - واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے - کیونکہ خدائی راستہ ہے جس کو وہی طے کرسکتا ہے - جس کو حق تعالیٰ طے کرانا چاہیں - اس لئے سالک کو جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا رستہ ہے - اُس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے - بعد اس کے طول و لامتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے - اور یوں کہتا ہے

بحر یست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست ۔۔۔ آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ رستہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے جس پر آپ چل رہے ہیں تو اسکی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے ؎

تو دستگیر شوائے خضر پے خجستہ کہ من ۔۔۔ پیادہ مے روم و ہمرہاں سوار انند

اور حضور کی اعانت و رفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کرلیتا ہے - یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے - جن کی رسائی حضور تک ہو چکی ہے - اور جو حضور تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں - ان کو اس کی ضرورت ہے کہ ان مشایخ کا دامن پکڑیں - جو حضور تک رسائی حاصل کرچکے ہیں - جیسے بادشاہ تک پہنچنے کے لئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے - مگر جو وزیر تک بھی نہ پہنچا ہو - اس کو چاہیئے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں - (الاسعاد والابعاد ص ۴۹)

(۷۵) اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح بدل سکتی ہے

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ کا واقعہ ہے - کہ آپ کے زمانہ میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے - جن سے بہت فیض جاری تھا - مگر حضرت مجدد صاحب کو اُن کی بابت مکشوف ہوا کہ اُس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا - پس حضرت

مجدد صاحب یہ دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے۔ آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے۔ اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اُس کیلئے دعا کرنا چاہی۔ مگر ڈرے۔ کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہو۔ کہ تقدیر مکشوف ہونیکے بعد اس کے خلاف کی دعا کرتا ہے مگر پھر حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کا مقولہ یاد آیا۔ کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہکر شقی کو سعید کرا سکتا ہوں۔ اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں۔ چنانچہ پھر تو آپ نے اسکے لئے بہت دعائیں کیں۔ اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے۔ حتی کہ آپ کو مکشوف ہو گیا۔ کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا۔ تب آپ کو چین آیا۔ تو دیکھئے مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا۔ مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی۔ اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ راتوں کی نیند اس کی اُڑ گئی ہے۔ خیر یہ واقعہ تو ہو گیا۔ مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی جس کے متعلق ارشاد ہے ما یبدل المقول الدای۔ حضرت مجدد صاحب نے اس شبہ کا جواب بھی خود ہی دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہی کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے۔ اور واقعہ میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ علم الٰہی میں ہوتی ہے۔ تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا۔ مگر علم الٰہی میں اسکے ساتھ ایک قید تھی۔ یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کیلئے دعا نہ کرے سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا۔ کیونکہ اصل میں علم الٰہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس در اصل ام الکتاب وہی ہی۔ گو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے۔ کیونکہ لوح محفوظ میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ جتنا

کتاب المحو والاثبات میں ہوتا رہتا ہے۔ مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہو سکتا ہے۔ اور ہو جاتا ہے۔ اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجے میں ہے۔ اس میں اس کا اصلاً احتمال نہیں بس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے۔ اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجہ میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے۔ یہ غایت قرب لدی کا مدلول ہے۔ اور غایت ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے۔ حکیم ہے۔ اور قرآن جو درجہ صفت ہے۔ وہی کلام نفسی ہے۔ اور اسی لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا۔ تو لدینا اور علی دونوں کی دلالت اسکے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی۔ اور اسکے قبل جو ارشاد ہوا ہے۔ انا جعلناہ قرآناً عربیاً اس میں اس کے فعل کا مفعول ہونا اور عربیت کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے۔ کہ اس سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے۔ تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہو گیا (الاسعاد والابعاد ص۵۱)

(۷۶) فلسفہ اور تعلیم انبیاء علیہم السلام میں فرق

تمہارا فلسفہ ایسا ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا۔ اور اخیر نتیجہ کیا کچھ بھی نہیں۔ سوا اس کے کہ اشراقیین کی یہ رائے ہے۔ اور مشائیین کی یہ رائے ہے۔ معلوم نہیں کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے۔ اور ہمارا علم یہ ہے کہ اول ہی دن ہمنے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں۔ اور وضو کرنا شروع کر دیا۔ اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا۔ اور عمل پر ثواب کی نیت ہوئی۔ اور تمہیں کیا ملا۔ کونسا ثواب مشائین یا اشراقین کی رائے پر ملنے کی امید ہے۔ بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھیے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں ایک ذراسی بات ہے وہ طے ہی نہیں ہوتی۔ خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دیئے۔

اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں۔ دقیق بیشک ہیں۔ مگر اسوقت
کا حاصل کیا ہے۔ اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو۔ لیکن یہ اُمید ہو کہ اس کو حاصل
کر کے کوئی نتیجہ معتدبہ حاصل ہوگا۔ تب بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہاں حاصل کے
نام صفر ہے۔ تمام عمر اس لوٹ پوٹ میں رہو۔ کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے۔
اور طے جب بھی نہوا کہ کیا ٹھیک ہے۔ اور اگر طے بھی ہو جائے کہ امر حق یہ ہے تب
بھی اس کا حاصل کچھ نہیں صرف ایک بات کا علم ہو گیا۔ اس سے کام کونسا نکلا دیکھئے
معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اس میں اس قدر مناقشات ہیں کہ انکی وجہ سے
اس بحث کو معرکۃ الآرا ٹھیرا لیا ہے۔ اسمیں سب سے پہلے اس پر بحث ہے کہ علم کونسے
مقولہ سے ہے۔ جو ذراسی بات ہے۔ مگر لوگوں نے اسمیں کتابیں کی کتابیں سیاہ کر دی
ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافت سے ہے۔ کوئی مقولہ کیف
سے بتلاتا ہے۔ پھر سب طرف سے وہ حجتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الٰہی توبہ دماغ
پریشان ہو جاتا ہے۔ اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں۔ اگر تحقیق ہو گیا۔ اور امر واقعی معلوم
ہو گیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے۔ تو ثمرہ علم کا تو نہ بدلا۔ یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل
ہونے والا ہے وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہے۔ چاہے علم کسی مقولہ سے ہو۔ اور اگر تحقیق
نہ ہوا اور امر حق معلوم نہوا۔ تب بھی ثمرہ نہ بدلا۔ یعنی جو نتیجہ اس علم سے ہونیوالا ہے۔ وہ اب
بھی مرتب ہوگا۔ بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھاویں۔ یا کوئی معجون کھاویں۔ تو اس کی لذت
یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں۔ اس کی ترکیب کا ہمکو علم ہو یا نہو منفعت پھر بھی حاصل
ہوگی۔ لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں۔ باورچی پکاتا ہے اور وہ کھا لیتے ہیں۔
اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مرتب ہے۔ برابر حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ ترکیب کسی کو
بھی نہیں آتی۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے۔ یعنی باورچی۔ وہ پلاؤ کے نتیجہ
سے اکثر محروم رہتا ہے۔ کیونکہ اُسے پلاؤ کھانے کو نہیں ملتا۔ نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل
ہوتا ہے۔ اور پکاتا وہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ علم باورچی
کو ہے۔ اور ثمرہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے۔ عالم صاحب ثمرہ سے محروم ہیں

اب فرمائیے۔ کہ علم اچھا یا ثمرہ۔ یہی حال علوم حکمار کا اور علوم شرعی کا ہے۔ کہ ان کے پاس صرف علوم ہی ہیں۔ اور اُنہوں نے ان کو منتہائے نظر قرار دے رکھا ہے اور ثمرہ حاصل ہے۔ شرعیات جاننے والوں کو۔ انبیار علیہم السلام نے تو غذا پکی پکائی دی ہے۔ اور حکمار نے پکانا سکھایا ہے۔ مگر اُنہوں نے جس چیز کا پکانا سکھلایا ہے۔ وہ کھانے کی ہے بھی نہیں محض سونگھنے کی ہے۔ دن بھر تو سر مارا۔ جب چیز تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ تو کھانے کی نہیں ہے۔ ع چو دم بر داشتم مادہ بر آمد۔

اور یہ میں غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی تبلائی ہوئی چیز کھانیکی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو اُنہوں نے تمام عمر سر مار کر طے کیا۔ وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں۔ اب دیکھ لیجئے کہ وہ کار آمد ہیں یا نہیں جب غلط ہیں تو کار آمد کیسی تو یہ بات صحیح ہوئی کہ جو چیز اُنہوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ نکلی۔ خلاصہ یہ کہ تعلیم انبیار علیہ السلام کی سہل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ فضول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ کام میں لگانا چاہتے ہیں۔ ان کو خلق خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہی۔ اور اپنی بڑائی جتانا منظور نہیں ہوتی بنار تو سہولیت تعلیم انبیار کی یہ ہے یعنی شفقت۔ لیکن نتیجہ اس سہولت کا یہ ہوا۔ کہ عام فہم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا۔ یہ بڑی نادانی ہے (الباطن ص۵)

(۷۷) بعض نو تعلیم یافتہ کا ظاہری اصلاح ہی کو کافی سمجھنا اور اسی میں دین کو منحصر سمجھنا غلطی ہے

آجکل دین کی طرف سے ایسی لاپروائی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے۔ اُلٹا ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو دین کا نام لیتے ہیں۔ اور یہ کس قدر دین سے بعد کی دلیل ہی اور اگر کسی کا خیال دین کی طرف ہی بھی تو صرف ظاہر کی اصلاح کا نام دین رکھ لیا ہی۔ نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی۔ بس اس کا نام دین ہی۔ اُن کی نظر بھی اُس سے آگے نہیں بڑھتی۔ جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہنچی تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو

جوظاہر کے علاوہ ہیں۔ اور خطرناک بھی ہیں۔ تو اس خفا کی وجہ سے ان میں اور دشواری پیدا ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ یہ امر کس قدر قابل توجہ ہوئے۔ پس اس حدیث (قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ) میں ان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ان تمام امراض کی ایک اصل اور جزو بیان کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا۔ کہ کس قدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے تفصیل یہ ہے کہ دین کے دو جزو ہیں ظاہری اور باطنی۔ اب تو یہ حالت ہے کہ باطن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہے۔ باطن کی جگہ بطن لیلیا ہی۔ بس پیٹ بھر لیا جائے۔ جس طرح بھی ہو حلال سے ہو یا حرام سے۔ دھوکہ سے ہو یا اشراف نفس کے ساتھ ہو۔ بلا طیب خاطر ہو یا جبر سے ہو جس طرح بھی مل جائے۔ لقمہ حاصل کر لیا جاوے۔ ہاں بیشک ظاہر کو بعض نے ذرا درست کر لیا ہے اور بس۔ اور اس میں بھی دو فریق ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ اور ایک عوام۔ عوام تو اس بارے میں اقراری مجرم ہیں۔ خود اپنے منہ سے کہتے ہیں۔ کہ جی ہمارا کیا دین الٹی سیدھی ٹکریں مار لیتے ہیں دل دنیا میں لگا ہوا ہے کسی وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں۔ خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں اپنے قصور کا۔ دوسرا گروہ جو تعلیم یافتہ ہے۔ ان پر زیادہ افسوس ہے کہ وہ اپنے قصور کے بھی مقر نہیں۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا۔ کہ دین کا کوئی باطنی جزو بھی ہے۔ عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں۔ وہ محض ظاہری ہے اور باطن سے ہم محروم ہیں۔ اور یہ تعلیم یافتہ لوگ محروم ہونیکا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے۔ کیونکہ شان میں فرق آجائیگا۔ انہوں نے باطنی جزو کو ذہن سے اڑا ہی دیا۔ بس ظاہر پر کفایت کر لی اور اس پر ناز کر بیٹھے۔ اور سمجھ گئے کہ ہم پوری دیندار ہیں۔ اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے۔ بعض اجزاء کو گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے۔ اور اپنے نزدیک ایک ضروری اجزاء نکال لئے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ گویا دوسرے اجزاء نعوذ باللہ فضول اور زائد ہیں۔ اور وہ انتخاب کن اجزاء کا کیا ہی جن میں سہولت ہی۔ یا جن کی عادت ہو گئی ہی۔ جیسے نام مسلمانوں کا سار کھ لینا

صورت مسلمانوں کی سی بنالینا۔ بہت کیا تو نماز بھی پڑھ لی۔ بس انہیں اجزار کا نام
دین سمجھ لیا ہی۔ صاحبو! دین کے اجزار تو ہیں۔ عقائد۔ اعمال۔ معاشرات۔ معاملات۔ اخلاق
ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔ اب یہ حالت ہی کہ ان اجزار میں سے بعضوں کا
تو نام سن کر بھی لوگ چونکتے ہیں۔ اور تعجب کرتے ہیں۔ بعض وقت زبان سے بھی کہتے
ہیں۔ کہ ان کو دین سے کیا تعلق۔ معاشرات بھی کوئی دین کے سکھلانے کی چیزیں ہیں
یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں۔ جو ملنے جلنے سے خود آدمی سیکھ جاتا ہے۔ اس میں بھی مولویوں
نے پابندیاں لگادی ہیں۔ علیٰ ہذا معاملات میں بھی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں۔ غرض بعض
اجزار کو دین کا جزو ہی نہیں سمجھا جاتا۔ بڑے اعمال دیانات تک رہ گئے ہیں۔ اور وہ اعمال
بھی سب نہیں۔ ان میں سے بھی وہی لے لئے ہیں جن کی ایک رسم چلی آتی ہے۔ اور جسکی
بچپن سے عادت پڑگئی ہے۔ چنانچہ بڑی دینداری یہ ہے۔ کہ نماز پڑھ لی۔ ڈاڑھی رکھ
لی۔ شرعی پاجامہ پہن لیا۔ گوشت کھالیا۔ صورت شکل۔ وضع مسلمانوں کی سی بنالی یہ ان
لوگوں کا انتہائی کمال ہے۔ جو اپنے آپکو دیندار کہتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو دیندار بھی نہیں
کہتے ان کا تو یہاں ذکر ہی نہیں۔ غرض دین کے اجزار میں ایسا انتخاب کیا ہی۔ کہ اب خلاصہ
کا بھی خلاصہ یعنی گویا جوہر نکل آیا۔ اور دین نام رہگیا صرف گنتی کے چند اعمال کا اور وہ بھی
اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کے چند شعبوں کو درست کرلیا۔ غرض اس انتخاب میں بھی جو
رہا وہ ظاہر ہی ظاہر رہ گیا۔ اس کے سوا دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا۔ بس
اس ناتمام ظاہر کو بناکر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں اس بیان سے ظاہر کو بگاڑنے والے
خوش نہوں کہ ہم تو دیکھئے باطن پرست ہیں۔ مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں
جو سمجھتے ہیں باطن کا درست ہونا کافی ہے۔ ظاہر کے درست کرنے کی ضرورت نہیں
بلکہ اُن کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مخل ہے۔ لہذا
ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچانا جاسکتا۔ کہ یہ مسلمان ہیں۔ وضع قطع بھی مسلمانوں
کی سی نہیں رکھتے۔ بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے۔ یوں کہتے ہیں۔ کہ کسی کے سامنے نماز
پڑھیں گے۔ تو وہ ہمارا معتقد ہوجاویگا۔ اس سے ہمارے نفس کو خوشی ہوگی۔ تو یہ

نفس پروری ہوئی اسی قسم کی بہت سی خرافات من سمجھوتا کرنیکے لئے گھڑلی ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے۔ پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ میرے ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا۔ کہ یہ لوگ خوش ہوتے اس لئے کہتا ہوں۔ کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا۔ بلکہ اسپر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں تاکہ وہ اصلاح باطن کی فکر کریں۔ محض اصلاح ظاہر پر قناعت نہ کریں۔ باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے اس لئے کسی کو یہ گنجایش نہیں۔ کہ اصلاح ظاہر کو ترک کردے۔ گو بالفرض باطن بھی درست ہو۔ اور ان بددینوں کا تو باطن بھی درست نہیں۔ بلکہ اُنہوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ ظاہر کو تو بگاڑا ہی ہے۔ باطن کو بھی بگاڑا ہوا ہے۔ اور یہ ایسے دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ کہ ہمارا باطن درست ہے۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا۔ ایک ہی فرض ادا ہوتا۔ اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جائے کہ ہم اس کو نہیں مانتے۔ کہ ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے۔ باطن ہمارا بالکل اچھا ہے۔ ہمنے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنیکے لئے بگاڑا ہے۔ اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہوگیا۔ پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہے ہوا۔ کہ اُنہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ میں بطور جواب الزامی کے کہتا ہوں۔ کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر ہر حکم کی مخالفت کرتا ہے اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا۔ لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے تو کہتا ہے۔ واللہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیر خواہ ہوں۔ یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے۔ صرف عجب سے بچنے کے لئے کر رکھی ہے تاکہ میرے خلوص میں فرق نہ آوے بتائیے آپ اس کو کیا کہیں گے۔ یہی کہیں گے کہ جھوٹا بدمعاش غلط کہتا ہے۔ فرمائیے اس کی کیا وجہ ہے۔ جب ایک شخص اپنے منہ سے کہہ رہا ہے۔ کہ میں دل سے مطیع ہوں اور خیر خواہ ہوں۔ تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں۔ اور اسکو باغی کیوں سمجھتے ہیں۔ اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اسکی وجہ سوائے اسکے کیا ہے۔ کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے باطن کا۔ جب ظاہر افعال اسکے مخالف ہیں۔ تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ باطن اس کا موافق اور مطیع ہے اور یہی کہا جاویگا کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باغی ہے۔ اسی

طرح سمجھ لیجیے۔ کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہی۔ تو یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہی۔ ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کے۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ باطن درست ہو۔ اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ نا ممکن ہے۔ کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدون اضطرار کے ظاہر اس کا مخالف ہو۔ یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آ گئی۔ اصل بیان یہ تھا کہ آجکل بہت سے دیندار ایسے ہیں۔ جنہوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ لیا ہے۔ پھر اعمال سے مراد صرف اعمال ظاہری لئے گئے ہیں وہ بھی بہت نہیں۔ بلکہ معدودے چند جیسے ڈاڑھی بڑھالی۔ نماز پڑھ لی وضع قطع درست کر لی اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہو گئے۔ اس تقریر سے چونکہ شبہ ہو سکتا تھا۔ کہ ظاہر کا بنانا کچھ اچھی چیز نہیں۔ اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں۔ اس لئے انکی غلطی کو بیچ میں رفع کر دیا گیا۔ باقی اصل خطاب انہیں لوگوں کو ہے۔ جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھے ہوئے ہیں۔ ان سے جنکو اپنے مرض کی خبر نہیں۔ اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار بھی ہی۔ اور جب خبر ہونا دشوار ہے۔ تو اسکی اصلاح بھی دشوار ہے۔ خبر کے دشوار ہونیکی وجہ یہ ہے۔ کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہی۔ لهذا خبر بھی آسانی سے ہو گی۔ اور اصلاح بھی اسکی آسان ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہی۔ بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوئی۔ پھر اصلاح کیسے ہو۔ اور جب اس مرض کی مریض کو بھی خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو تو کیسے خبر ہو گی۔ کیونکہ وہ دوسروں کو نظر تو نہیں آتا۔ اور بدگمانی کی کسی کو اجازت نہیں۔ تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے۔ لهذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا۔ پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے کیونکہ اطلاع مفقود اور وہی شرط علاج۔ اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے۔ تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے۔ توجیہ اور تاویل کا۔ کہ اس کو کھینچ کھانچ کر مرض کی حد سے نکال لیں گے۔ اور نا جائز کو جائز بنا لیں گے۔ حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے۔ تو قلب میں اس تاویل سے ہرگز بشاشت

نہیں ہوتی۔ بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہیگا۔ کہ یہ گناہ ہے۔ پھر جب خود ہی کو گناہ ہونیکا علم ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو تو کیسے علم نہ ہوگا۔ تو پھر اس توجیہ اور تاویل سے کیا کام چلا۔ خدا کے سامنے تو گنہگار ہی رہے۔ ظاہر بینوں کی نظر میں سرخرو ہوگئے تو کیا ہے

کہ گفتہ اللہ دوغے میزنی	از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام	در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست	با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن

ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آگئی کہ ان کی نظر صرف ظاہر تک ہی۔ مگر باطن کو بگاڑ کر خدا کو دھوکہ کیسے دوگے۔ جبکہ ان کی نظر باطن تک بھی پہنچی ہے۔ دنیا کی نظروں کے سامنے تاویلیں کر کے سرخرو ہوگئے تو کیا ہوا تاویل سے اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کا تو اصل واقعہ کا علم ہے۔ اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے۔ کہ اس چیز کی بُرائی پر پردہ پڑ جاتا ہی۔ اصل گناہ تو مرض تھا ہی۔ یہ تاویل کا مرض اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ یہ نہو۔ تو گناہ ایسی چیز ہے۔ کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں۔ تو اُمید ہوسکتی ہے۔ کہ کبھی اس سے فتنہ ضرور ہو جائیگا۔ اور جب تاویل درمیان میں آگئی۔ تو گناہ کی بُرائی پر پردہ پڑ گیا۔ اب تنبیہ ہو۔ تو کیونکر ہو۔ اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ نہیں کر سکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے۔ کوئی بُرائی اس کی نظر میں نہیں آتی۔ اور خود تنبہ اس واسطے نہیں رہا۔ کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑ گیا تبنیہ اور تنبہ سب اُڑ گئے۔ اب اصلاح کی کیا اُمید ہو۔ دیکھیے کس قدر دشواری ہے۔ باطن کی اصلاح میں بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں۔ کہ اس میں تاویل کی بھی ضرورت نہیں اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں۔ اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے۔ اس لئے اس بات کو مانتے ہیں۔ کہ ہمارے اندر

یہ عیب نہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں۔ کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں۔ علم ہے عمل ہے۔ نماز ہے۔ روزہ ہے۔ جب اتنے کمال موجود ہیں۔ تو وہ عیوب بھی نہیں۔ فیصلہ غلبہ سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے۔ بُرائی کم۔ تو بھلائی ہی کا حکم ہوگا۔ اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اور اچھے بن گئے۔ اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی۔ یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا۔ اس سے بات بھی وہی کی وہی رہی۔ اور دل کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ ہم اچھے ہیں۔ یہ ایسی مدلل تقریر ہے۔ کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔ اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پاوے۔ مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کریگا۔ اور اس روز دل کے سمجھا لینے سے کچھ کام نہ چلیگا۔ اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپ کا غالب تو مغلوب ہو۔ اور مغلوب غالب ہو۔ دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے اور ان عیبوں کے دور کرنیکی جو اُس کے اندر ہیں۔

تو کیا اس دل کے سمجھا لینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہو گئی۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑ گیا تھا۔ اس طرح اس فیصلہ سے بھی پردہ پڑ گیا تاویل بھی ایک مرض ہے۔ وہ ایک قسم کا پردہ تھا۔ یہ دوسری قسم کا پردہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہی ہے۔ اس میں اور اُس میں اتنا فرق ہے۔ کہ اس تاویل کا حاصل یہ تھا۔ کہ گناہ کو گناہ تسلیم نہ کیا تھا۔ اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا۔ اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے۔ کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا۔ خیال کر لیجئے کہ یہ کس قدر گھری تاویل ہے۔ بہر حال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آگئی ہوگی کہ امراض باطن کا ادراک نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ اتنے موانع موجود ہیں اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جب اسکی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے۔ کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے۔ جب مرض کی خبر ہو اور جب خبر ہی نہیں۔ تو علاج کیسا۔ اس دشواری کو دیکھ کر بعض لوگوں نے

تو ہمت ہار دی ہے۔ کہ کون علاج کرے۔ ہمارے اندر امراض ہیں۔ تو بلا سے اللہ میاں بڑے کریم ہیں۔ ہم گنہگار سہی اللہ میاں معاف کرنے والے ہیں۔ پھر کیوں مصیبت میں پڑے۔ کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو۔ اس کے نخرے اٹھاؤ۔ ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہو۔ اچھی خاصی مصیبت ہے۔ جب اللہ میاں رحیم و کریم ہیں۔ تو کیا ضرورت ہے۔ اس مصیبت کو اٹھانے کی۔ وہ اپنی رحمت سے خود ہی سب کام بنا دیں گے یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں۔ اور کوئی کام خلاف شریعت کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے۔ روزے کی بھی ضرورت ہے۔ ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے۔ مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی۔ کہ اس کے بھی کسی مرض کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ یا نہیں۔ پس سن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں۔ اور ان کے دور کرنے کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے۔ جیسے ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا (الباطن صفحہ)

(۷۸) بعض نو تعلیم یافتہ باطن ہی کو مقصود اصلی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ظاہری اصلاح کی ضرورت نہیں

ان نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے خیالات بھی نئے ہیں انہوں نے دین کا خلاصہ ایک نئے طریق سے کیا ہے۔ یہ دعویٰ تو ان میں اور فقراء میں دونوں میں مشترک ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور مقصود اعظم باطن ہے۔ ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور آگے اس بات میں دونوں متمائز ہیں۔ کہ وہ باطن کیا ہے۔ کہ فقراء نے تو ہر عمل کا باطن الگ نکالا ہے۔ نماز کا الگ۔ روزے کا الگ اور حج و زکوٰۃ کا الگ۔ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور ان امراء نے اس سے بھی زیادہ اختصار کیا گویا ان کی صفت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ انہوں نے ست کا بھی ست نکالا۔ یہ مولویوں اور فقراء کو سب کو فضول سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کل دین کا خلاصہ ایک ہی چیز نکالی ہے۔ وہ کیا ہے۔ تہذیب اخلاق۔ بس تمام اعمال تو دین کیلئے ظاہر ہیں اور باطن دین کا اور حقیقت اس کی تہذیب اخلاق ہے۔ اور کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ ٹھیک

بیٹھک اور مال کا خرچ کرنا اور پیٹ کاٹنا۔ جس جس عمل کو عبادت کہا جاتا ہے وہ سب
بانی اسلام (علیہ السلام) نے صرف اس واسطے تجویز فرمائی تھیں۔ کہ تہذیب اخلاق حاصل
ہو۔ ملک عرب وحشی ملک تھا۔ اور وہاں بہیمیت بہت زیادہ تھی۔ ان کی اصلاح بلا ان
سخت گیری کے ہو نہیں سکتی تھی۔ اس واسطے یہ احکام تجویز کئے گئے تھے۔ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم بڑے ریفارمر تھے۔ اُن کی اصلاح کیلئے ایسی صحیح تدبیریں تجویز فرمائیں کہ ان
سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی تہیں اور ہم کو وہ بات بدون نماز روزہ کے حاصل ہی۔ جو حضور کا
مقصود اصلی تھا یعنی تہذیب اخلاق۔ کیونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں۔ اور بہیمیت عرب کی سی
ہم میں نہیں ہے۔ تو ہمارے واسطے اس سخت گیری کی کیا ضرورت ہی۔ اور یہ بڑی نادانی
ہے۔ کہ متکلم کی اصل غرض کو نہ سمجھا جاوے۔ اور صرف الفاظ پر رہا جاوے۔ جیسا کہ خشک
مولوی کر رہے ہیں۔ کیوں صاحب کیا دلیل ہے اس بات کی کہ تمام احکام سے مقصود
اصلی حضرت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف تہذیب اخلاق ہے۔ کوئی دلیل اسپر
ہونی چاہیئے۔ اور میں دور کی بات کہے دیتا ہوں۔ کہ اول تو دلائل عقلیہ سے اس کا
احتمال بھی منفی ہے۔ لیکن بفرض محال اگر اس کا احتمال بھی ہو۔ کہ شاید یہی مقصود ہو
تو صرف احتمال پر اس دعوے کی بنا ہوئی۔ دلیل پر تو بنا نہ ہوئی۔ تو کیوں صاحب
ایک دین ہی۔ آپکے نزدیک ایک ایسی چیز ہے۔ جس میں اپنے مطلب کیلئے احتمال
ہی پر بنا کر کے اس سے تسلی کر لی جاتی ہے۔ کبھی دنیا کے بھی کسی کام کی بنا۔ آپ یا
کوئی عقلمند صرف احتمال پر کیا کرتا ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑا مہاجن ہو۔ جس کے یہاں
بہت دولت ہی۔ وہ مر جاوے۔ تو آپ اُس کے یہاں جا کر کہیں۔ کہ اس میں سے
مجھے بھی حصہ ملنا چاہیئے۔ کیونکہ میں اس کا بیٹا ہوں۔ اور کوئی کہے تم بیٹے کس طرح ہو
تو جواب دیجئے۔ کہ احتمال تو ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔ اور جب احتمال ہی۔ تو میں
دعوی کرتا ہوں کہ میں بیٹا ہوں۔ لہذا میراث ملنی چاہیئے۔ کیوں صاحبو کیا یہ بات چل
جاویگی۔ اور کیا اس کو سُنکر کوئی پاگل نہ کہیگا۔ یا مثلاً جو آپ کا بیٹا ہے اس کو
آپ میراث سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کہ گو اس کو بیٹا کہا جاتا ہی۔ مگر احتمال

تو ہے۔ کہ بیٹا نہ ہو۔ لہذا اسی شق کو ترجیح دی جاتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے۔ اور میراث سے محروم ہونا چاہیئے۔ تو کیا بات مان لی جاویگی۔ عاجبوا تعجب ہے۔ کہ دنیا کے تو کسی معمولی کام کی بنا بھی احتمال پر نہیں کرتے اور دین کے بڑے بڑے کاموں میں ایسی جرأت کرتے ہیں۔ اور تغیر کر ڈالتے ہیں۔ دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ احتمال کے موقع پر ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی دوا میں شک ہو جائے کہ یہ دوا فلانی ہے۔ یا کوئی تیزاب ہے۔ تو اس کو کوئی بھی نہیں پئے گا۔ بلکہ اسی کو پسند کرینگے۔ کہ اس کو تلف کر دیا جائے۔ گو کتنی ہی لاگت اس میں ضائع ہوئی ہو۔ اور اس کو مکان میں رکھنا گوارا نہ کریں گے۔ اسی احتمال کی وجہ سے کہ کوئی پی نہ جاوے۔ اور نقصان ہو جاوے۔ یا اللہ! دین ہی کیا ایسی سستی اور بیکار چیز ہے۔ کہ اُسے بالکل سر پر سے اڑا دینے کیلئے صرف احتمال کافی ہے۔ تمام ارکان دین کو بدل ڈالا۔ صرف اس احتمال پر کہ شاید مقصود ان سب سے تہذیب اخلاق ہو اور لطف یہ ہے۔ کہ یہ احتمال بھی مرجوح بلکہ غلط اور اپنا تراشا ہوا۔ اور زبردستی کا احتمال ہے۔ کیونکہ احتمال تو وہاں ہو سکتا ہے۔ جہاں متکلم کی طرف سے کوئی بیان نہ ہو۔ یہاں تو صاحب شرع کی طرف سے صاف صاف بیان موجود ہیں۔ ہر ہر عبادت کی کیفیت اور اس کے کرنے کی ضرورت اور اس پر ثواب اور ترک پر وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔ پھر یہ احتمال بھی کہاں رہا کہ شاید مقصود تہذیب اخلاق ہی ہو۔ یہ تو کھلی ہوئی توجیہ القول بما لا یرضی قائلہ ہے۔ اور یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ایک نوکر سے کہیں کہ انگور لے آؤ اور وہ آٹا لے آوے۔ اور کہے کہ مقصود تو کھانے سے تغذیہ بدن ہوتا ہے اور وہ انگور میں اتنا نہیں ہے جتنا آٹے میں ہے۔ کیا یہ حرکت اس کی نافرمانی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ ایک معقول وجہ بیان کرتا ہے۔ مگر جواب میں اسکے یہی کہا جاویگا کہ تو اپنی طرف سے غرض اور مقصود کو تراشنے والا کون ہے۔ کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اس وقت ہمکو مقصود تغذیہ بدن ہے۔ ممکن ہے کہ تفکہ مقصود ہو۔ جس کے لئے انگور موضوع ہے۔ نہ آٹا خصوصاً۔ اگر یہ صورت ہو کہ کوئی قرینہ بھی ایسا موجود ہو۔ جس سے اس پر کچھ دلالت ہوتی ہو۔ تو تغذیہ مقصود نہیں۔ مثلاً کھانے کا وقت نہ ہو۔ یا ابھی

کھانا کھا چکے ہوں ۔ یا گھر میں کوئی بیمار موجود ہو جس کو طبیب نے انگور کھانے کیلئے کہا ہو
تو اس صورت میں اس کا آٹا لے آنا اور زیادہ سخت بیوقوفی اور بدتمیزی بلکہ گستاخی اور
تعنت سمجھا جاویگا ۔ حالانکہ اس قرینہ کے ہوتے ہوئے بھی وہ احتمال باقی ضرور رہتا
ہے ۔ لیکن ایسے نوکر کو کان پکڑ کر نکال دیا جاویگا ۔ بس یہی قصہ دین کا سمجھو ۔ کہ جب دین
میں قرائن اس بات کے موجود ہیں کہ خود اعمال بھی مقصود ہیں تو اپنی طرف سے ایک احتمال
نکال کر ان کو بدلنا کیسے جائز ہوگا ۔ اور یہ قرائن اگر معمولی بھی ہوتے تب بھی اس اختراع کی
گنجائش نہ تھی چہ جائیکہ تصریحات قولی موجود ہیں ۔ اس وقت میں تو اس اختراع کی مثال
بالکل یہ ہوگی ۔ کہ نوکر سے کہیں انگور لے آ ۔ اور وہ جواب میں کہے جی ہاں میں سمجھ گیا ۔
آپ کا مطلب یہ ہے کہ انگور نہ لانا بلکہ آٹا لانا ۔ اے اللہ! عقلیں کہاں چلی گئیں ۔ یا عقل اسی
واسطے ہے کہ دنیا کے کام اس سے بنائے جائیں اور دین کا نام آتے ہی اس کو بالائے طاق
رکھدیا جاوے ۔ اور دین کے کاموں کو جان جان کر بگاڑا جاوے ۔ دنیا کے کاموں میں تو
ذرا سا احتمال جو غیر ناشی عن دلیل بھی ہو ۔ پیدا ہو جاوے تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا
جاوے ۔ اور دین کے کاموں میں ایک غلط احتمال اپنی طرف سے تراش کر اس پر عمل کر لیا
جاوے ۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے ۔ کہ دین کو صرف ایک غیر ضروری چیز سمجھا ہے ۔ جس کا
مقتضا یہ ہے ۔ کہ یوں کر لیا تو کیا ۔ اور یوں کر لیا تو کیا ۔ ورنہ اگر ذرا بھی وقعت دین کی قلب
میں ہوتی ۔ اور اسکی کچھ بھی ضرورت سمجھی جاتی ۔ اور درجہ وہم میں بھی یہ بات ہوتی ۔ کہ
قیامت آنیوالی ہے اور بازپرس ہوگی ۔ اور وہاں ایسی ایسی ہولناک تکلیفیں اور عذاب
ہیں ۔ تو اول تو یہ احتمال پیدا ہی نہ ہوتا ۔ اور پیدا بھی ہوتا ۔ تو پہلو احتیاط ہی کا اختیار کیا
جاتا ۔ اور یوں کرتے کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اعمال کا یہ خاص باطن (یعنی تہذیب اخلاق)
مقصود ہو (گو یہ اُن کا خود تراشیدہ ہے) مگر بہتر یہی ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے
اور ظاہر کو بھی ترک نہ کیا جاوے ۔ کیونکہ اگر وہ احتمال غلط نکلا تو قیامت میں کیا جواب
ہوگا ۔ دیکھیے مالگذاری داخل کرنے کو تحصیل میں جاتے ہیں ۔ اور فرض کیجیے کہ بیس روپے
مالگذاری کے داخل کرنے ہیں ۔ لیکن اگر شک پڑ گیا کہ کچھ آنہ پائی اس رقم کے اوپر اور بھی

ہیں۔ تو اس صورت میں جیب میں پچیس روپے ہی ڈال کر چلیں گے۔ اس خیال سے کہ کچھ تو کسر مالگزاری میں ہے۔ جس کی مقدار معلوم نہیں اور شاید کوئی روپیہ کھوٹا بتا دیا جاوے۔ یا عملہ والوں کو کوئی روپیہ حق ناحق کا دینا پڑے۔ تو احتیاط یہی ہے کہ پانچ روپے زاید لے چلیں۔ اگر خرچ نہوئے تو واپس آجاویں گے۔ اور اگر نہ لے چلے اور وہاں کمی پڑ گئی۔ تو ذرا سی بات کیلئے آبرو پر بن جاویگی۔ ایسے موقعوں میں دنیا میں بیوقوف سے بیوقوف بھی احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے۔ پھر تعجب ہے۔ کہ دین میں وہ لوگ بھی۔ جو اہل عقل ہونے کے اور تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں احتیاط کا پہلو اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ ایک من گھڑت احتمال پر قطعی حکم کر دیتے ہیں۔ اور ایسے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ دوسری جانب کا (جو درحقیقت راجح اور یقینی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں یہ محتمل جانب مرجوح بلکہ غلط ہے) ان کو احتمال ہی نہ ہوتا۔ اس کی وجہ صرف دین کا غیر ضروری سمجھنا ہے۔ بس اس کا آخر جواب ہمارے پاس یہی ہے۔ کہ آنکھ میچنے پر معلوم ہو جاویگا۔ کہ کس دھوکہ میں رہے اور اس وقت اس کا تدارک کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ غرض اس امر کے فرقے نے بھی دین کا ایک ست نکالا ہے۔ اور یہ ست اس ست سے بڑھا ہوا ہے۔ جو فقراء نے نکالا تھا۔ کیونکہ فقراء نے جو ست نکالا ہے وہ ایک دین کی چیز تو ہے۔ اور انہوں نے ست بھی دنیا ہی کی ایک منفعت نکالی۔ بس وہ ست تھا اور یہ روح ہے۔ آجکل ہر چیز کی روح نکالی گئی ہے۔ گلاب کی روح ہے چنبیلی کی روح ہے خس کی روح ہے۔ انہوں نے یہ دین کی روح نکالی ہے (روح کیا نکالی کہ دین کی روح ہی نکال دی) تمام دین کی روح ایک ذرا سی نکالی۔ جس کا نام تہذیب اخلاق رکھا ہے۔ اس کو اور وہ بھی اپنے ہی نزدیک حاصل کر لیا ہے۔ بس کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی عمل کیا بھی۔ تو دنیا کے فائدہ کیلئے۔ مثلاً نماز پڑھی تو اس فائدہ کی بنا پر کہ ان حرکات سے جسم کی ریاضت ہو جاتی ہے۔ اس واسطے کبھی اٹھک بیٹھک کر لیتے ہیں۔ اور اگر کبھی اور طرح ریاضت ہو گئی۔ مثلاً گھوڑے کی سواری کر لی۔ یا کرکٹ اور فٹبال

کبھل لیا۔ تواب یہ یا ضت کی ضرورت نہیں رہی بس نماز حذف۔ یا ایک نماز کا فائدہ یہ ہے۔ کہ اس کے واسطے وضو کیا جاتا ہے۔ جس سے صفائی ستھرائی ہو جاتی ہے۔ اور صفائی اچھی چیز ہے اور تہذیب میں داخل ہے۔ اور اگر صبح اُٹھ کر غسل کر لیا یا صابون سے منھ ہاتھ دھو لیا ہے اور بنگلہ اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ گرد وغبار کا وہاں دخل نہیں ہے۔ تو اس صورت میں نماز کے واسطے وضو کی کیا ضرورت ہے چنانچہ ایک صاحب ایسا ہی کرتے تھے کہ بے وضو نماز پڑھ لیتے تھے۔ اور اگر کسی نے کہا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی۔ تو کہتے یہ دقیانوسی مولویوں کے خیالات ہیں۔ یہ لوگ غور نہیں کرتے اور دین کی تہ کو نہیں پہنچتے۔ عرب میں جب اسلام شروع ہوا تو افلاس بہت تھا۔ لوگ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے۔ اور میلے کچیلے رہتے تھے۔ اس واسطے اس وقت کیلئے بانئ اسلام علیہ الصلواۃ والسلام نے یہ قید لگادی تھی۔ کہ جب نماز پڑھو تو مُنہ ہاتھ دھو لیا کرو۔ اب زمانہ وہ نہیں ہے۔ اب مال کی افراط ہے۔ محنت مزدوری کی ضرورت نہیں۔ ہم آئینہ دار بنگلوں میں رہتے ہیں۔ روز صبح کو صابون ملکر غسل کرتے ہیں۔ گرد وغبار کا یہاں تک گذر نہیں۔ بتاؤ ہمارے بدن پر کیا لگ رہا ہے جس کے واسطے بار بار دھوویں (کوئی پوچھے کہ ہر روز صبح کو کیا لگ جاتا ہے جس کے واسطے روز نہاتے ہو۔ مگر یہ کام تو اُس اُستاد نے بنایا ہے جس کے حکم میں چوں وچرا کی گنجایش نہیں یعنی فیشن نے) خود یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ عرب عموماً میلے کچیلے رہتے تھے یہ تاریخی بات ہے۔ اُن کے یہاں تاریخ کو بڑا دخل ہے اور اس پر بڑی جلدی ایمان لاتے ہیں۔ تاریخ میں یہ مل گیا۔ کہ عرب میں افلاس تھا۔ آگے عموم اپنی رائے سے تجویز کر لیا۔ کیا تاریخ میں کہیں یہ بھی ہے کہ اہل عرب سب ایسے ہی غریب اور مفلس تھے۔ کیا ان میں متنعم اور صاحب ثروت نہ تھے۔ عرب میں تو وہ لوگ بھی تھے۔ جن کے یہاں سو سو غلام تھے۔ تو اگر وضو کی بنا غربت اور مفلسی پر تھی۔ تو ان لوگوں کو مستثنے کر دیا جاتا اور صرف غریبوں کے لئے وضو کا حکم ہوتا۔ نیز صحابہ کے حالات ابتدا میں بیشک ایسے ہی تھے۔ مگر پھر حق تعالیٰ نے فتوحات دیئے اور دولے

ملک ہوئے۔ اور یہ حالت تھی کہ بدن پر بجائے عطر کے مشک ملا کرتے تھے۔ مگر کیا بدنج
یہ کہیں ہے۔ کہ اُنہوں نے وضو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بس زمانہ آزادی کا ہی۔ جو چاہو کرو
اور جو چاہو کہو۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چنانچہ وہ صاحب پانچوں وقت نماز بے وضو
اُڑاتے تھے۔ ایک صاحب نے اور زیادہ ترقی کی کہ نماز بھی ندارد کردی۔ کیونکہ مقصود
بدون اس کے حاصل تھا یعنی ریاضت جیسے گھوڑے کی سواری وغیرہ۔ ایک اور صاحب
کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ مدعو تھے اور بڑے معزز شخص تھے۔ ان کے ساتھ اور بہت سے
اشخاص بھی مدعو تھے۔ گویا تمام جلسہ انہیں کی وجہ سے مدعو تھا۔ اور سالار قافلہ بھی یہی
تھے۔ نماز کا وقت ہوا تو سب لوگ اُٹھے۔ مگر یہ نہ اُٹھے۔ کسی نے کہا آپ بھی نماز کو چلیں
تو کہا میں نماز کو لغو سمجھتا ہوں۔ لوگوں نے کہا۔ نماز تو اسلام کی چیز ہے۔ آپ ایسا کیوں
کہتے ہیں۔ تو آپ جواب میں (نعوذ باللہ توبہ) کیا کہتے ہیں۔ کہ میں اسلام ہی کو لغو سمجھتا ہوں
صاحبو! یہ نوبت ہے۔ ان لوگوں کی جو سر برآوردہ کہلاتے ہیں۔ اور جن کی عزت کو لوگ
اسلام کی عزت سمجھتے ہیں۔ اس پر اگر کوئی مولوی کچھ کہے۔ تو کہا جاتا ہے۔ کہ مولویوں کو
تو بس فتویٰ لگانا آتا ہے۔ مسلمانوں کے کسی ایک فرد کو تو مشکل سے ترقی ہوتی ہی۔ اس کے
یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ بس ترقی قومی دیکھ ہی نہیں سکتے۔ صاحبو! کیا یہ اسلامی ترقی
ہے۔ اب سُنئے کہ اس شخص کیلئے اہل جلسہ میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز کیا کہ اس
شخص نے ایسا بیہودہ کلمہ بکا ہے۔ اس واسطے اس سے بائیکاٹ کرنا چاہیئے۔
اور اس سے قطع تعلق کر دینا چاہیئے۔ تو دوسرے حضرات فرماتے ہیں۔ کہ ہم کیوں
اختلاف ڈالیں اُس نے اللہ میاں کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اللہ میاں آپ نمٹ
لیں گے۔ سبحان اللہ! یہ صاحب صلح کل ہوں گے۔ مگر کیا صلح کل ہی۔ دار السلطنت کے
باغی سے تو دوستی کر کے دیکھو۔ دیکھیں صلح کل کے مذاق کو کیسا نباہتے ہیں۔ مگر یہاں اہل
جلسہ کو بھی تامل ہے کہ ایسے بیہودہ سے بائیکاٹ بھی کرنا چاہیئے یا نہیں۔ افسوس رڑکی
میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اس پر بحث تھی کہ نکاح کی پخ کیوں لگائی گئی ہے۔
نکاح کی روح اور حقیقت تو تراضی ہے۔ جہاں تراضی پائی جاوے۔ نکاح ہی کا حکم

ہونا چاہیئے۔عورت و مرد کا ایک کے ساتھ مقید ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا ہاں جبر نہیں چاہیئے۔رضامندی سے کسی مرد اور کسی عورت کے مل جانے میں کیا حرج ہے۔مگر یہ کیا ضرور ہے۔ایک بیوی اور ایک میاں ہو۔یہ مسلمانوں میں کمیٹی ہوئی تھی۔اس سے بڑھکر ایک اور لطیفہ ہے (لطیفہ کیا ہے کثیفہ ہے) لکھنؤ میں ایک محلہ ہے۔خیالی گنج وہاں کے ایک صاحب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ایک روز ذرا دیر میں آئے۔تو پوچھنے پر بیان کیا۔کہ آج وہاں ایک کمیٹی ہوئی تھی۔جس میں اس پر بحث ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ کیا ہے۔بہت گفتگو کے بعد جو اخیر بات طے ہوئی۔وہ یہ کہ ان کا اصلی اور اخیر سبب تنزل کا اسلام ہے۔جبتک اس کو نہیں چھوڑا جاوے گا۔ترقی نہیں ہوگی۔اور یہ بات پاس ہوگئی۔لعنت ہے۔اس پاس ہونے پر۔اے صاحبو خیال تو فرمائیے۔کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔پھر اس پر اپنے کو کہتے ہیں ٹھیٹ مسلمان ہیں۔ٹکیٹ نہیں۔بلکہ تمہارے اسلام کی آنکھ میں ٹینٹ نکل آیا ہے۔جس نے بالکل بیکار کر دیا۔اور جس کا علاج سوائے نشتر کے کچھ نہیں اور نشتر بھی کونسا نائی کا۔پھر وہ نشتر نہیں۔جس سے آنکھ بن جائے۔بلکہ وہ جس سے اور پھوٹ جاوے اور کاٹکر نکال دی جاوے۔کیونکہ اس میں قابلیت ہی بننے کی نہیں ہے۔یہ تو نوبت ہے اگر اس پر کوئی حکم شرعی سُنایا جاوے۔تو کہتے ہیں۔کہ بس مولویوں کو فتوی لگانا آتا ہی۔اور غصہ انکی ناک پر رکھا رہتا ہے۔اور ذرا دیر میں بُرا مان جاتے ہیں۔اگر انکی ماں کو کوئی گالی دے۔تب دیکھیں یہ بُرا نہیں مانتے اور اس شخص سے اُن کی دوستی قائم رہتی ہی یا نہیں۔اس وقت تو یہ بھی ایسا خشک برتاؤ کرینگے۔کہ مولوی بھی لطف کے ساتھ ایسا نہ کریں۔بات یہ ہی کہ جس سے جس کو تعلق ہوتا ہے۔اس کو بُرا کہنے سی غصہ آتا ہے۔سو آپ کو اپنی ماں سے تعلق ہے۔اس واسطے ماں کو گالی دینے سے غصہ آگیا۔اور ایسا ہونا ہی چاہیئے۔اگر ایسا نہ ہو تو فطرت سلیمہ کے خلاف ہی۔اور ہم کو اللہ و رسول سے تعلق ہے۔اس لئے جب ہمارے اللہ (تعالیٰ) اور ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دی جاوینگی تو ہم کو کیسے غصہ نہ آویگا۔اور کیوں ہم بُرا نہ مانینگے

اور کس طرح ایسے بیہودہ سے دوستی رکھیں گے۔ ایک اور ایل۔ ایل۔ بی صاحب کا قصہ ہی (اتنا بڑا تو پاس کیا مگر ڈگری ہی یہ ہے) کہ انہوں نے مجمع میں کہا۔ کہ رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہی۔ جو بضرورت مذہب مان لیا جاتا ہی۔ ورنہ واقع میں اسکی کوئی اصل نہیں۔ اور لطف یہ ہی کہ اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ آپ کی توہین کرتا ہوں۔ ایسا نہیں۔ بلکہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں محمد صاحب (صلے اللہ علیہ وسلم) کو کہ آپ بڑے ریفارمر تھے۔ اور آپ نے بڑی اصلاح کی۔ لیکن رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہی۔ کیوں صاحبو! کیا ان پر بھی کوئی فتوٰی نہیں لگانا چاہیے۔ کیا یہ صریح کفر نہیں ہے۔ افسوس یہ ہی۔ کہ ان کے تحت میں ایک مسلمان دیندار لڑکی ہے۔ اور جھبرا جھبر بچے ہو رہے ہیں۔ اگر لڑکی کے گھر والوں سے کہیں کہ یہ نکاح باقی نہیں۔ اور لڑکی کو اس سے الگ کر لینا چاہیئے۔ تو ابھی ناصح پر تلوار کھینچ لی جاوے کہ ہم کو گالی دیتے ہیں۔ صاحبو آجکل تو اسکی بھی ضرورت ہی۔ اور میں بطور نصیحت اور خیر خواہی کہتا ہوں کہ جہاں دولہا کی صحت اور نسب اور حیثیت وغیرہ دیکھتے ہو اللہ کے واسطے اور رسول کے واسطے اس کا اسلام بھی دیکھ لیا کرو۔ وہ زمانہ گیا کہ دولہا کے صرف افعال دیکھے جاتے تھے کہ نمازی اور پرہیزگار بھی ہے۔ یا نہیں۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ اگر یہی دیکھ لیا کرو۔ تو بہت ہی کہ وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں اور لڑکی مسلمان کے گھر جا رہی ہے۔ یا کافر کے گھر۔ آجکل کے تعلیم یافتہ ایسے آزاد ہوئے ہیں کہ بہت سوں کا ایمان اور اسلام ہی باقی نہیں۔ یقیناً کافر ہیں۔ اُن سے نکاح صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کو بیٹی دینے سے چکلہ میں بٹھا دینا بہتر ہے۔ کیوں نام نکاح کا کیا۔ بعضوں کو تو اس قدر اجنبیت ہوئی ہی اسلام سے کہ نام بھی مسلمانوں کا سا پسند نہیں کرتے اور اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔ اور اہل یورپ کیسے نام رکھتے ہیں۔ اور ایسوں کو لوگ قومی لیڈر کہتے ہیں۔ اور ان کی تعریفیں کرتے ہیں۔ کہ بڑے ہمدرد اور با حمیت ہیں مسلمانوں کے اوپر انہوں نے جان و مال فدا کر رکھا ہے۔ آجکل کے لیڈروں میں حمیت تو ہے مگر صرف قومی حمیت ہی۔ مذہبی نہیں۔ یہ کوشش بیشک کرتے ہیں کہ ایک جماعت قائم رہے۔

جنکو اہلِ اسلام کہا جاوے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں بھی یا نہیں۔ بلکہ یہ لوگ مذہبی حمیت کو جنون کہتے ہیں۔ لیڈران قوم کے قصے آپ نے سن لیے۔ اگر ایسے لوگ بھی مسلمان ہیں۔ تو دنیا میں کوئی بھی کافر نہیں۔ ان سے وہ کافر بدرجہا اچھے۔ جو کھلم کھلا اپنے آپ کو دوسری قوم میں شمار کرتے ہیں۔ اُن سے اتنا ضرر مسلمانوں کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ یہ ہمارے مخالف ہیں۔ اور ان لوگوں کو اپنا موافق سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت میں اُن سے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں۔ تو یہ دشمن بصورت دوست ہیں۔ ان سے مسلمان ہر وقت دھوکا کھا سکتے ہیں۔ اُن سے وہ نقصان پہنچتا ہے۔ جیسے ایک رئیس کو ریچھ سے پہنچا۔ ایک رئیس نے ریچھ پالا تھا۔ اور تعلیم اُس کو یہ دی تھی۔ کہ یہ سویا کرتے تھے اور وہ مکھیاں اُڑایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ آقا صاحب لیٹے تھے اور بے خبر سو رہے تھے۔ اور آغا صاحب محافظ تھے ہی۔ اور اپنے معمول کے موافق مکھیاں اُڑا رہے تھے۔ بعضی مکھی ضدن ہوتی ہے کہ جہاں سے اُڑایا جاوے وہیں لوٹ لوٹ کر آتی ہے۔ ایک مکھی نے اسی طرح ان محافظ صاحب کو دق کیا۔ یہ اُڑا اُڑا دیتے تھے۔ اور وہ لوٹ لوٹ کر سر منہ پر آ بیٹھتی تھی۔ بس ان کو غصہ آگیا۔ جیسے ایک افیونی کا قصہ ہے۔ کہ اُن کی ناک پر ایک مکھی بار بار آکر بیٹھتی تھی۔ انہیں غصہ آگیا۔ اور لیکر اُسترہ اپنی ناک کو اُڑا دیا۔ کہ لے حرام زادی وہ اڈا ہی نہیں رہا۔ اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی۔ حالانکہ جب تو ایک ہی مکھی تھی اب تو اس کی ساری برادری خون پر آویگی۔ غرض اس ریچھ کو غصہ آگیا۔ اور ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر لایا اور منتظر رہا کہ ابکے مکھی آوے تو اس کو اس پتھر سے ماروں گا۔ چنانچہ وہ مکھی آقا صاحب کے منہ پر حسب دستور آکر بیٹھی۔ اُنہوں نے پوری قوت سے اور نشانہ صحیح کر کے اُس کے پتھر مارا۔ مکھی تو اُڑ کر الگ گئی۔ اور آقا صاحب کا سر پاش پاش ہو گیا۔ صاحبو! یہ ریچھ بھی خیر خواہ ہی تھا قرائن قویہ اس بات کی شہادت میں موجود ہیں۔ کہ اُس نے اس فعل میں کوئی بدنیتی نہیں کی۔ اپنے نزدیک تو آقا کی خیر خواہی اور خدمت ہی کی۔ مگر ایسی خدمت سے خدا بچاوے۔ اس کا تو کام ہی تمام ہو گیا۔ ایسی خیر خواہی آجکل اسلام کی ہو رہی ہے

کہ ہمدردان اسلام اور خیرخواہانِ قوم وہ تجویزیں کرتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو ترقی ہو۔ خواہ اسلام کا گلا ہی گھٹ جاوے۔ ایک اخبار میں چھپا تھا۔ کہ اسلام ایسا مذہب ہے جس کی طرف بہت لوگوں کو رجحان ہے۔ مگر اس میں نماز کی پخ لگا رکھی ہے کہ اُن کی وجہ سے بہت لوگ اس میں آنے سے رُکتے ہیں۔ اگر علماء نماز کو اس میں سے نکال دیں تو ہزاروں آدمی مشرف باسلام ہو جاویں۔ اور مسلمانوں کی جماعت میں معقول اضافہ ہو جاوے۔ اور بہت زیادہ ترقی اسلام ہو۔ کیوں صاحب بلا نماز کے وہ اسلام بھی ہو گا میں اس سے بھی سہل ترکیب بتاؤں۔ وہ یہ ہی۔ کہ سب قوموں کا نام مسلمان رکھ دیا جاوے خواہ وہ اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ پس آج ہی کروڑوں کی تعداد کا اضافہ ہو جاویگا۔ دنیا میں کوئی قوم اور رہیگی ہی نہیں۔ سب مسلمان ہی ہو نگے صاحبو! یہ لیڈران قوم اور عقلاء کی رائیں ہیں۔ نہ معلوم عقل ان لوگوں کی کون لے گیا۔ ایک چیز کی ذاتیات اور ارکان موجود نہیں۔ اور اس چیز کو موجود سمجھتے ہیں کسی چیز پر حیوان اور ناطق تو صادق آتے نہیں۔ اور انسان کو اس پر صادق سمجھتے ہیں۔ یا کسی کا سر کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا۔ پاؤں الگ پھینک دیئے گئیے۔ اور تمام جسم کی بوٹی بوٹی الگ پھینک دی گئی۔ مگر اس کل کو بیمار حی۔ قائم سمجھ رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ کون سی معقول کا مسئلہ ہے کہ وجود عدم کے ساتھ جمع ہو سکتا ہی۔ دین کی ہر ہر چیز کو تو حذف کر ڈالا اور دین موجود۔ اور مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ ماموراتمیں سے کوئی چیز مامور بہ نہیں مانتے نماز کی ضرورت نہیں۔ اسکی حقیقت جسمانی ریاضت ہے۔ وہ اور طریق سے کرلیجاتی ہے۔ روزہ بہیمیت توڑنے کے لئے تھا۔ وہ اس زمانہ میں رہی نہیں۔ کیونکہ تعلیم کا زمانہ ہے۔ اسی طرح حج زکواۃ وغیرہ سب کو کتربیونت کر کے ندارد کر دیا اور محرمات میں سے کسی چیز کو ممنوع نہیں سمجھتے۔ سود کی حرمت اُڑا دی اس کا تو آجکل اتنا زور شور ہے اور اس مسئلہ میں ایسی قابلیتیں دکھائی گئی ہیں۔ کہ حلال ہی کر کے چھوڑا ہے۔ غرض اجزاء دین کو سب کو الگ کر دیا ہے اور منافیات دین کو دین میں داخل کر لیا ہے اور خوش ہیں کہ ہم دیندار اور پکے مسلمان ہیں۔ یہ تو ایسا ہوا۔ جیسے کوئی اپنے کنبہ والوں کو اور دوستوں کو

تو اپنے گھر سے نکال کر باہر کرے۔ اور غیروں کو اور اپنے جانی دشمنوں کو گھر میں داخل کر لے۔ اور دیکھ دیکھکر خوش ہو رہا ہو۔ اور خوشی خوشی لوگوں کو دکھا رہا ہو۔ کہ دیکھو ہمارا گھر کیسا آباد ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جاویگا۔ کہ کیسا آباد ہے۔ جبکہ وہ تیری تکا بوٹی کرینگے۔ آجکل لیڈران قوم نے دین میں وہ تصرفات کئے ہیں۔ اور ایسی خیر خواہی اس کے ساتھ کی ہے۔ جیسے کسی بوڑھیا نے ایک شاہی باز کے ساتھ کی تھی حکایت اس کی اس طرح ہے کہ ایک شاہی باز اُڑ کر ایک بوڑھیا کے یہاں جا بیٹھا بوڑھیا نے اس کو پکڑ لیا۔ اور اسکی چونچ اور پنجوں کو دیکھ کر بڑا رحم آیا۔ دیکھا چونچ ٹیڑھی ہے، ناخن کسی قدر بڑھے ہوئے ہیں اور ٹیڑھے بھی ہیں۔ اور اس کو گود میں لیکر رونا شروع کیا کہ ہائے بچے تو کیسے زمین پر بیٹھتا ہوگا۔ تیری انگلیاں ٹیڑھی ہیں۔ ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں۔ اور کھاتا کیسے ہوگا۔ کیونکہ چونچ بھی ٹیڑھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تو بے ماں باپ کا ہے۔ کوئی تیری غور کرنے والا نہیں ہے۔ جو ناخن کاٹتا اور چونچ کو درست کرتا۔ اور رحم و شفقت نے ایسا زور کیا کہ قینچی لیکر اس کے ناخن سب کاٹ دئے اور چونچ بھی تراش دی۔ اپنے نزدیک تو بڑھیا نے اس کی بڑی خیر خواہی اور ہمدردی کی۔ مگر خدا بچاوے ایسی ہمدردی سے کہ اسکو برباد ہی کر دیا۔ نہ وہ شکار پکڑنے کے کام کا رہا۔ اور نہ کھانے کے۔ یہی خیر خواہی اسلام کے ساتھ آجکل کے ہمدردان اسلام کرتے ہیں۔ کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول۔ نماز بھی زائد ہے۔ روزہ بھی زائد ہے زکوٰۃ کی حاجت نہیں۔ حج بھی فضول ہے۔ اور پھر مسلمان ہونیکے مدعی۔ معلوم نہیں اسلام کس چیز کا نام ہے۔ کوٹ کا نام ہے۔ یا پتلون کا نام ہے۔ جب اسلام کا ہر جزو فضول ہے۔ تو کل بھی فضول ہے۔ اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے اور ہم تو جانیں تم بھی فضول ہو جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو۔ سچ یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں۔ ایک پیسہ کا سنکھیا کھا کر مر جاتے۔ تو دنیا ایسے ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی۔ غرض اس گروہ نے (یعنی امرا نے) عجیب گت بنائی ہے دین کی۔ درحقیقت تو یہ دین سے بالکل الگ ہیں۔ مگر نام نہاد کیلئے اور دل کو سمجھانے کیلئے۔ دین کا ایک

خلاصہ نکال لیا ہے۔ اور اس کو دین کا لب لباب سمجھ کر خوش ہیں۔ کہ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ لہذا ہم دیندار ہیں۔ وہ خلاصہ تہذیب اخلاق ہے۔ اس کو دین کا باطن کہتے ہیں اور خیال ہے کہ باطن ہی مقصود اعظم ہے ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ اُنہوں نے اس طرح دین کا باطن نکالا۔ اور درویشوں نے اور طرح نکالا تھا۔ جس کو میں بیان کر چکا ہوں غرض ان دونوں جماعتوں نے ظاہر کی ضرورت نہیں رکھی۔ پس یہ حدیث اس پر رد کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ظاہر ہی مقصود اعظم ہے۔ کیونکہ حضور قلب کو شرط کیا دعا کیلئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ یعنی اللہ تعالیٰ بلا حضور قلب کے دعا کو قبول نہیں کرتا۔ یہاں دعا عمل ہے۔ اور اس کیلئے شرط ٹھیرایا ہے حضور قلب کو اور ظاہر ہے (جیسا کہ میں اوپر بھی کہہ چکا ہوں) کہ شرط من حیث الشرط تابع ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اصل عمل دعا ہے اور حضور قلب اسکے تابع ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصلی مقصود عمل ظاہری ہے۔ اور باطن اسکے لئے شرط اور تابع ہے۔ اس سے ان دونوں جماعتوں کے اس خیال پر رد ہو گیا۔ کہ اصل مقصود باطن ہے۔ یہ تحقیق تو نسبت بین الظاہر والباطن کی حدیث سے ہوئی۔ اب عقلی طور پر سمجھیے۔ کہ اس میں ایک فلسفیانہ راز ہے۔ وہ یہ کہ ہر چیز کی ترقی عمل سے ہوتی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو آجکل کے لوگ تو دل سے مانتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کا مدار اسی پر ہے۔ اور ترقی ہی کا آجکل ہر چہار طرف غل ہے۔ سو سب کو معلوم ہے کہ خیال باطن ہے۔ اور عمل ظاہر اور ترقی صرف خیال سے نہیں ہوتی۔ چنانچہ لیکچروں میں برابر کہا جاتا ہے۔ کہ ترقی کیلئے ہاتھ پیر ہلاؤ۔ صرف خیال سے کچھ نہ ہوگا۔ عمل کر کے دکھاؤ عملی حالت کو بدلو تب تم پستی سے نکل کر ترقی کے میدان میں آؤ گے اس کی بنا اسی بات پر تو ہوئی کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے۔ صرف خیال اس کیلئے کافی نہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ عمل اسی خیال ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور خیال کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے۔ کیونکہ اعضا تابع ہوتے ہیں قلب کے جب قلب میں ایک بات مرتبہ خیال میں پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کے بعد

اس کا ظہور مرتبہ فعل میں اعضاء سے ہوتا ہے۔ کہاں ہیں مدعیانِ سائینس اور مدعیانِ تعلیم ذرا اپنے سائینس ہی کے مسئلہ میں غور کریں۔ کہ ہر فعل کے وجود کیلئے دونوں باتوں کی ضرورت ثابت ہوئی۔ خیال کی بھی جس کو دوسرے لفظوں میں باطن کہہ سکتے ہیں۔ اور عمل کی بھی جس کو دوسرے لفظوں میں ظاہر کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کار آمد اور اصل چیز جس سے ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ عمل ہے یعنی ظاہر نہ کہ خیال یعنی باطن۔ گو بلا باطن کے وہ ظاہر نہ ہو سکتا ہو۔ اس کی مثال پھل اور گٹھلی کی ہے مثلاً آم ہے کہ مقصود آم کا پھل ہے نہ گٹھلی۔ گو وجود پھل کا موقوف ہے گٹھلی پر تو جس کو آم کھانا ہو۔ اسکی گٹھلی سے بھی گریز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اول کام گٹھلی ہی سے پڑے گا۔ لیکن مقصود بالذات وہ کام کی چیز پھل ہی ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ تو ان لوگوں کی مثال جو محض باطن کو مقصود اعظم قرار دیتے ہیں اور ظاہر کی صورت نہیں سمجھتے۔ ایسی ہو گی کہ ایک شخص نے گٹھلیاں ٹوکرہ بھر کر جمع کر لی ہوں۔ اور خوش ہو کہ ہمارے پاس آم ہیں اور ہم آم کھاتے ہیں۔ اور جب کوئی اس پر اعتراض کرتا ہو۔ تو جواب دیتا ہو کہ میاں اصل چیز تو یہی ہے۔ اسکے بغیر تو پھل کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ صاحبو! یہ دلیل تو ٹھیک ہی مگر کیا کوئی ان کو اس دلیل کی رو سے آم کھانے والا کہہ سکتا ہے۔ حاشا وکلا۔ آم کی ان کو خوشبو بھی نہیں آئی۔ اور بوجھوں مرے مفت۔ تو اصل یہی ٹھیری کہ بڑا مقصود ظاہر ہی ہوا۔ کہ وہ وجود میں موقوف ہو باطن پر۔ اور یہ بعینہ سائینس کا وہی مسئلہ ہی۔ کہ ترقی کا مدار عمل پر ہے۔ نرا خیال کافی نہیں۔ گو عمل کا وجود خیال ہی سے ہوتا ہے ورنہ نرا خیال تو شیخ چلی نے بھی پکایا تھا۔ اگر خیال سے ترقی ہو سکتی۔ تو شیخ چلی کو بڑی ترقی ہوتی۔ اور اگر یہی ترقی ہے۔ تو ایسی ترقی تو بہت سہل ہے۔ ہر شخص بے محنت ومشقت گھر بیٹھے بیٹھے بلا تنخواہ کر سکتا ہے (الظاہر ص ۲۵ تا ۴۴)

صاحبو! خوب سمجھ لیجیے کہ کوئی مقصود بلا مشقت اور بلا ہاتھ پیر ہلائے حاصل نہیں ہو سکتا دنیا کا نہ آخرت کا۔ اس مشقت ہی کا نام عمل ہے اور اسی کا نام ظاہر ہے اور باطن نام صرف خیال کا ہے۔ اگر ظاہر کو اڑا دیا تو رہا کیا صرف خیال جو کچھ بھی کار آمد نہیں جیسا کہ

آپکا سائنس بھی اس کو ثابت کرتا ہے۔ اور آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے۔ نہ صرف ارادوں اور ڈھکوسلوں سے پھر یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ کہ نرا باطن کافی ہے اور ظاہر کی ضرورت نہیں۔ یہ عقلی ثبوت بھی ہو گیا۔ ظاہر کی ضرورت کا اور اس کے مقصود ہونیکا اور حدیث سے پہلے ثابت ہو چکا۔ اور حدیث کے علاوہ دوسرے نصوص بھی بکثرت موجود ہیں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں۔ اور وہ نصوص اسقدر ہیں کہ دنیا بھر ان کو جانتی ہے۔ اور ہمارے مخاطبین کو بھی معلوم ہیں۔ مگر اُنہوں نے ان میں ایک اور ترکیب چلی ہے۔ وہ یہ کہ اُن کے معنے بدلے ہیں۔ اور کہتے ہیں اُن کے وہ معنے نہیں۔ جو مولوی لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں۔ اور اپنے مذاق کیموافق کھینچ کھانچکر معنی بیان کرتے ہیں۔ اسوقت اُن کی تفصیل کا موقع نہیں۔ اجمالاً یہ کہنا کافی ہے کہ آیا معنی وہ صحیح ہونگے جو لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور اہل اسلام نے سمجھے ہیں۔ یا وہ جو کسی ایک دو نے۔ اختراع کر لئے۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ جب سے شریعت مقدسہ آئی اُس وقت سے ان نصوص کے معنے کیا سمجھے گئے اور تمام امت نے ظاہر کو ضروری سمجھا یا نہیں۔ تمام کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اعمال کی ضرورت سے۔ اور ایک ایک عمل کی کیفیت اور اس کے اجزار ضروری اور غیر ضروری اور متمات و محسنات اور اسکے مفسدات و مکروہات سب تفصیل کے ساتھ مدون ہیں۔ پھر اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر عمل کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا اس سب اُمت کی امت نے غلط معنی سمجھے۔ ظاہر ہے کہ ایک کے سمجھے ہوئے معنی غلط ہو سکتے ہیں۔ نہ کروڑوں کے سمجھے ہوئے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ الحاد ہے۔ اور دہریت ہے۔ اور زندقہ ہے۔ شریعت کا انکار۔ جو اس کا مرتکب ہے وہ بیشک باطل پر ہے۔ خواہ اپنے زعم میں تعلیم یافتہ ہو۔ اور دیندار ہو اور مقتدا ہو۔ اور عقلمند ہو۔ اور کچھ ہی ہو۔ اور یہ اعمال کا تعطل ہے اور یہ نفس کا دھوکا ہے اور انجام اس کا حسرت ہو گا۔ جس کے اعمال صحیح نہیں۔ وہ کسی شمار میں بھی نہیں۔ اور یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے۔ کہ نہ کفر کے ساتھ خدا تک رسائی ہو سکتی ہے۔ نہ فسق کے ساتھ خدا تک تو رسائی طاعت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور طاعت نام ہے عمل کا جس میں

باطن کے ساتھ ظاہر بھی آگیا جس میں عمل نہیں۔ وہ حد رسیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ (الیضاً صفحہ ۵ تا ۶)

(۹۷) طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا سراسر حماقت ہے

عقلاء میں اب تک اختلاف ہی۔ کہ عقل جوہر مجرد ہے۔ یا جوہر مادی ہے اور یہ نفس ناطقہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے۔ یہ عقل کا علم ہے پھر اس کو احکام خداوندی میں مزاحمت کا کیا حق ہے۔ جو لوگ عقل کے بہت متبع ہیں۔ وہ ہر وقت بڑے پریشان ہیں۔ ہر چیز کی لم دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے۔ اور کوئی بات نہیں بنتی۔ اور جہاں کچھ اسباب و علل معلوم بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی اٹکل اور تخمین سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرسوں آندھی آئی تھی۔ میں کہہ رہا تھا۔ کہ عقلاء کے نزدیک اس کے بھی کچھ اسباب ہیں۔ تو یہ لوگ ان اسباب میں تصرف کر کے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر اور بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں۔ آندھی کے اسباب میں بھی تو ذرا تصرف کر کے دکھلائیں۔ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اسباب اختیاری ہیں یا غیر اختیاری۔ اگر اختیاری ہیں اور قابل تصرف نہیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ آندھی کا آنا اور اس کا روکنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں۔ موحد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ کہ حق تعالیٰ کے حکم سے آندھی آتی ہے۔ اسی طرح زلزلہ آتا ہے۔ اس کیلئے بھی اُن کے نزدیک کچھ اسباب ہیں۔ تو ذرا ان اسباب میں تصرف کر کے زلزلہ کو روک تو دیں۔ زلزلہ کو تو کیا روکتے جن چیزوں کا ان کو تجربے سے علم بھی ہو چکا ہے ان کی بھی لم معلوم نہیں۔ مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے مقناطیس کی خاصیت جذب زائل ہو جاتی ہے۔ ذرا اس کی لم مجھے کوئی تبلا دے۔ کہ آخر زلزلہ میں اور مقناطیس کی قوت میں تعلق کیا ہے۔ زلزلہ سے اس کی قوت جذب کیوں زائل ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص اسکی لم بیان نہیں کر سکتا۔ باقی اٹکل پچو بات گھڑ دینا تو ہر ایک کو آسان ہے۔ لم تو وہ ہی

جس کو دل بھی قبول کرلے ۔ ورنہ گھڑ گھڑ کے بیان کر دینا کیا مشکل ہے ۔ مگر وہ ایسی ہی لم ہوگی ۔ جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ بتلائی ہے ۔ کہ وہ دھوپ میں سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا ۔ اس لئے جہاں دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہوگیا ۔ جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہوگیا ۔ واہیات ہے ۔ بھلا اُن سے کوئی پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پرکار تھی ۔ کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا ۔ اور آہستہ آہستہ دھوپ سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹتا تھا ۔ کہ بدن پر گول گول ہی نشانات پڑیں ۔ کوئی نشان مربع یا مستطیل یا مثلث یا مکعب نہ ہو کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ سکتی ہے ۔ چیتا کیا ہوا ۔ بڑا ماہر انجنیئر ہوا ۔ مگر ان احمقانہ وجوہ پر یہ لوگ خوش ہیں ۔ کہ ہمنے وجہ تو بیان کر دی ہے ۔ چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو ۔ جیسے ایک شخص نے جاٹ سے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پے کھاٹ ۔ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولھو ۔ شیخ نے کہا ۔ واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں ۔ کہنے لگا قافیہ نہ سہی بوجھ میں تو مریگا ۔ ایسے ہی ان کی وجہ ہوتی ہے ۔ کہ چاہے جوڑ نہ ہو ۔ مگر وجہ ہونی چاہیئے ۔ یہ ساری خرابی ہے ۔ طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی ۔ کیونکہ یہ لوگ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ یہ نشانات طبیعت نے بلا واسطہ بنا دیے ہیں ۔ کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں ۔ وہ کس طرح افعال مختلفہ بنائی ۔ اس لئے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں ۔ پھر الٹکل پچو اسباب گھڑ کر لگاتے ہیں اور موحد کو کسی جگہ اٹکاؤ نہیں ۔ وہ بڑا بے فکر ہے ۔ جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے کہ خدا نے یونہی بنانا چاہا تھا ۔ بنا دیا ۔ اور گو وہ واحد حقیقی ہے ۔ مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہوگیا ۔ اس لئے الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد کے بھی خلاف نہیں ۔ کیونکہ یہ حکم علت موجبہ میں ہے ۔ حق تعالیٰ ایجاب سے منزہ ہیں اور طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں ۔ وہ علت موجبہ ہی ہوگی ۔ اس لئے اس کی طرف ان افعال کی نسبت نہیں کر سکتے ۔ ہائے کیسے ذی شعور کو فاعل مانا ۔ اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی نہ الٹی نہ سیدھی نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ میں آتا ہے ۔

تو وہاں بھی ظالم خدا کو فاعل نہیں مانتے۔ بلکہ ان مواقع کیلئے بخت و اتفاق کو گھڑ لیا ہے۔ مگر یہ محض نام ہی نام ہے ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و اباؤکم۔ کوئی ان سے پوچھے بخت و اتفاق ہے کیا بلا۔ اس میں فاعلیت کی قوت کہاں سے آگئی اور یہ کیونکر سبب بن گیا۔ بس اس کا کچھ جواب نہیں۔ یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ موحد کیسی چین میں ہے کہ اس کو ایسی دوراز کار باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ کہ سب کا فاعل خدا ہے اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا پیدا کر دیا۔ اور اس کو طبیعت کی ضرورت ہے نہ بخت و اتفاق کی۔ اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے۔ وہاں وہ کہتا ہی کہ اسباب مؤثر بالذات نہیں ہیں۔ بلکہ یا تو مؤثر باذن الخالق ہیں۔ جیسا کہ ایک قول ہے۔ اور یا مؤثر ہی نہیں۔ بلکہ محض علامات ہیں۔ جیسا ایک قول ہے۔ جیسے جھنڈی کا ہلنا ریل کے چلنے کی محض علامت ہی۔ مؤثر بالذات حق تعالیٰ ہیں۔ اگر وہ ارادہ نہ کریں تو سارے اسباب بیکار پڑے رہیں۔ جیسے ڈرائیور گاڑی کو روکنا چاہے۔ تو ہزاروں سرخ جھنڈیاں بیکار ہوتی ہیں۔ تبلائیے یہ شخص چین میں ہے۔ یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو فاعل مانتا ہے۔ کبھی طبیعت کو کبھی بخت و اتفاق کو۔ موحد ان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے ؎

اربًا واحدًا ام الف رب		ادین اذا تقسمت الامور	
ترکت اللات والعزی جمیعًا		کذٰلک یفعل الرجل البصیر	

وہ ان سب لات و عزیٰ پر لات مارتا ہی۔ اور ایک خدا کو فاعل مانتا ہی اور اسباب پرستوں سے کہتا ہے کہ تم ایک خدا کو چھوڑ کر کہاں مارے مارے پھرتے ہو۔ چھوڑو ان خرافات کو اور یہ مذہب اختیار کرو ؎

مصلحت دید من آن ست کہ یاران ہمہ کار		بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

اور مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

خلیل آسا در ملک یقیں زن		نوائے لا احب الآفلیں زن	

کیونکہ وہ دیکھتا ہے۔ کہ اسباب سب اسکے قبضہ میں ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند	با من و تو مردہ با حق زندہ اند

واللہ موحد سے بڑھ کر کوئی صین میں نہیں۔ پھر مشرکین کے بعضے معبود ایسے ہیں کہ ان میں باہم رقابت ہے۔ وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں کہیں وہ یہ معلوم کر کے کہ دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے۔ ناخوش نہ ہو جاوے (تقلیل الاختلاط مع الانام صفحہ ۱۹ تا ۲۲)

آجکل کے حکمار تو ایسے بد تہذیب ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں۔ اُن کی ایسی مثال ہے جیسے ایک چپراسی اپنے افسر سے تنخواہ لیتا ہو۔ مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی افسر نہیں نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے۔ بلکہ زمین سے خود بخود روپے پیدا ہو جاتے ہیں اور ہوا سے اُڑ کر میرے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ رسالہ حمیدیہ میں موحد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پیرایہ میں خوب لکھی ہے۔ کہ ایک موحد اور ایک دہری کسی جزیرہ میں گئے۔ وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت مستحکم بنا ہوا دیکھا جس میں ایک طرف کھانیکا کمرہ ہے۔ جو فرش فروش اور آئینوں سے سجا ہوا ہے۔ ایک طرف سونے کا کمرہ ہے جس میں عمدہ عمدہ مسہریاں بچھی ہوئی اور سقفی پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ ہر کمرہ میں ہوا کیلئے روشندان بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینے سے لگائے گئے ہیں۔ ایک طرف حوض بنا ہوا ہے۔ جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے۔ موحد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا۔ کہ اس کا بنانیوالا بڑا ہی صناع اور بہت ہی ماہر تھا جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا۔ دہری نے کہا کہ اس کے بنانے والا کوئی نہیں۔ بلکہ عرصہ دراز تک بارش ہونے سے زمین کی مٹی جم گئی تھی۔ پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں۔ پھر ہوا سے اُڑ اُڑ کر وہ اینٹیں اس جگہ آکر جمع ہو گئیں۔ پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا۔ اس طرح دیواریں بن گئیں۔ پھر پہاڑ دن سے پتھر گرے۔ اور ہوا نے ان کو اُڑا کر یہاں کھڑا کر دیا۔ اس کے ستون بن گئے۔ پھر درختوں کی لکڑیاں ہوا سے ٹوٹ گئیں وہ اُڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہو گئیں

اس طرح اس نے سارے مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کردیا۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں
کہ تبلایئے ان میں گدھا کون ہے۔ اور آدمی کون ہے۔ یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے
جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے۔ کہ وہ خود بخود تیار ہو گیا۔ اسی طرح سمجھ لیجیے۔ کہ جو لوگ
آسمان و زمین کی اتنی بڑی عجیب و غریب اور عظیم الشان عمارتوں کو کسی صانع کی بنائی ہوئی
نہیں مانتے۔ بلکہ از خود تیار مانتے ہیں۔ وہ بیوقوف ہیں یا نہیں۔ تو یونان کی حکمت اس
حکمت سے پھر بھی اچھی تھی۔ وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے۔ اور اہل سائینس تو غضب کرتے
ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں۔ اور سائینس والوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں۔ یہ
اُن کی محض وضعداری ہے۔ ورنہ ان کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے
کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے۔ وہ کہے کہ ہاں دیکھا ہے۔ اُس کے ایک سونڈ بھی اور
ذرا سا سر تھا۔ اور آنکھیں نہیں تھیں۔ تو پہلا شخص یہ اوصاف سُنکر کہے گا۔ کہ کمبخت تو نے
بادشاہ کو نہیں دیکھا۔ نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے۔ بادشاہ تو ایسا بدصورت نہیں ہے
یہی حال ان سائینس دان مسلمانوں کا ہے۔ جو خدا کے قائل ہیں۔ مگر اس کے کمالات
کے منکر ہیں۔ جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے۔ یفعل ما یشآ و یحکم ما یرید
مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت اور مادہ کے سپرد سارا کام
کردیا ہے۔ اب جو ہوتا ہے وہ اسباب طبیعیہ سے ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے ارادہ کو
کچھ دخل نہیں۔ گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھردی ہے۔ اب اس کے چلنے میں فنر
اور بال کمانی کی طاقت کو دخل ہے۔ خدا کو کچھ دخل نہیں۔ اسی لئے یہ لوگ ابراہیم
علیہ السلام کے نار کے گلزار ہونیکا انکار کرتے ہیں۔ کہ آگ بھلا کیونکر ٹھنڈی ہو گئی
یہ تو قانون طبیعت کیخلاف ہی۔ بھلا بنی اسرائیل پر پہاڑ کیونکر معلق ہو گیا۔ اور ایک
ذرا سے پتھر میں سے بارہ چشمے کیونکر بہنے لگے۔ یہ قانون فطرت کیخلاف ہے ان
لوگوں نے خدا تعالیٰ کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا۔ موحد کہتا ہے کہ نہ معلوم تم
کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو۔ خدا تو ایسا عاجز نہیں۔ اس کی تو شان یہ ہے۔ کہ ایک
پتہ بھی اسکے حکم وارادہ کے خلاف نہیں ہل سکتا۔ اور اگر وہ چاہے۔ تو تمام عناصر کی

خاصیت کو دم بھر میں بدل دے۔ پس ان اوصاف کے ساتھ یہ اُن کا کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں ویسا ہی ہے۔ جیسا اس شخص نے کہا تھا کہ ہاں میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے۔ اسکے ایک سونڈ تھی اور آنکھیں تدارد تھیں۔ مگر بایں ہمہ ان کو کافر نہ کہیں گے کیونکہ اُنکے اقوال سے خدا کا انکار صرف لازم آیا ہے۔ التزام نہیں پایا گیا اور لزوم کفر کفر نہیں۔ التزام کفر کفر ہے۔ اس لئے ہم ایسے مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے۔ ایک اور مزے کی بات سُنئے۔ جب اہلِ سائینس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی۔ کہ اسباب طبیعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے کیونکہ آدم علیہ السلام کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہونا تو ان کو مسلم نہیں۔ یہ تو انسان کی عقل سے بعید ہے۔ تو ڈارون کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ بندر ترقی کرکے انسان بنگیا۔ اس کا نام مسئلہ ارتقا ہے۔ اس بیچارے کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندر ہی نظر آیا۔ جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں۔ اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے اس لئے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے۔ وہ بندر ہی کی نسل سے ہوگا اور ہمکو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہے۔ کہ ہم آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ تو تم اس بات کا کیوں انکار کرتے ہو۔ وہ بیچارہ تو اپنا نسب بتلا رہا ہے۔ تمہارا نسب تھوڑا ہی بتلا رہا ہے۔ اور جس دن وہ ہمارا نسب بتلاویگا۔ ہم کہدیں گے۔ صاحب البیت ادری بما فیہ گھر والے کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے نسب کی خبر تجھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہوسکتی ہمارے پاس شجرۂ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے تجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں تیرے پاس اپنا شجرۂ نسب محفوظ نہو گا۔ تو تجھے اختیار ہے۔ کہ جس سے چاہے اپنا نسب ملالے (مجہول النسب یہ نہ کرے تو اور کیا کرے۔ جامع)

یہ ساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی۔ خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھنستے۔ یہ تو ان سائینس والوں کا حال تھا جو خدا کے منکر ہیں۔ اب ان

سائنس والوں کا حال سُنئیے۔ جو برائے نام خدا کے قائل ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب علم کا قصّہ ہے۔ کہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کا قصّہ ڈارون کی تحقیق سے مصادم ہے تو وہ بولے کہ شاید وہ پہلا بندر جس نے انسان کی طرف سب سے پہلے ترقی کی ہے (نعوذ باللہ) آدم علیہ السلام ہی ہوں۔ استغفر اللہ استغفر اللہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس بات کی نقل سے بھی۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل تبلاتے ہیں۔ یہ محض وضعداری ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ خدا کے قائل نہیں ہیں۔ بھلا ڈارون کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فاعل نہیں مانتا۔ طبیعت کو فاعل مانتا ہے اور طبیعت دفعۃً ترقی نہیں کر سکتی تدریجاً ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسیط یعنی عناصر کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی۔ پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کر لی۔ مگر جو شخص خدا تعالیٰ کو فاعل مختار مانتا ہو۔ اسکو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر کیا ہے اسکے نزدیک اس میں کیا استحالہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے پتلے کو مٹی اور پانی بنا کر دفعۃً اس کو انسان بنا دیں۔ اس ظالم کو ڈارون کی تقلید پر کس بات نے مجبور کیا کہ وہ خواہ مخواہ ایک نبی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے۔ پھر اس میں علاوہ توہین نبی کے یہ بھی خرابی ہے۔ کہ یہ تاویل ڈارون کے قول پر بھی غلط ہے کیونکہ ڈارون اس کا قائل نہیں کہ دنیا میں صرف ایک بندر ترقی کر کے انسان ہوا ہو۔ جس کی نسل میں یہ سب انسان ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے۔ کہ جس وقت بندر کی طبیعت نے ترقی کی ہے تو ایک خاص وقت میں ہر جگہ ہزاروں لاکھوں بندر آدمی بن گئے۔ اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں۔ تو اس شخص نے ڈارون کی تقلید میں قرآن کے اندر تحریف کی۔ اور وہ تحریف بھی ڈارون کے یہاں قبول نہ ہوئی۔ تو ادھر سے بھی گئے اُدھر سے بھی گئے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم	نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ موحد کو ایک خدا

سے تعلق ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ سے بلا واسطہ علاقہ ہے۔ اس لئے حضور کے اقوال میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ آپ کی شان یہ ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود	گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اس لئے موحد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو۔ وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں موحد کہتا ہے۔ کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کو دفعۃً مٹی سے پیدا کر کے دفعۃً انسان بنا دیا۔ اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندر یا سور سے ملائے تو خدا کو فاعل ماننے میں کیسی راحت ہے کہ سب جھگڑوں سے نجات ہو گئی۔ یہ تو علمی راحت ہے۔ اور دنیوی حسی راحت یہ ہے۔ کہ حوادث و مصائب میں موحد مستقل و مطمئن رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ہو مولنا وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون ط کہ ہمکو وہی پیش آئیگا۔ جو خدا نے مقدر کر دیا ہے۔ اسکے خلاف ہرگز کچھ پیش نہیں آسکتا۔ اور حق تعالیٰ ہمارے آقا اور مولیٰ ہیں اُن کی طرف سے جو کچھ پیش آئیگا اس میں رحمت و حکمت ہی ہو گی۔ اس لئے خدا ہی پر مسلمان کو بھروسہ کرنا چاہئے بتلائیے جس کا یہ اعتقاد ہو وہ مصائب میں کب پریشان ہو سکتا ہے۔ اور ملحد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد ہی نہیں رہتی کیونکہ اس کو اسباب پر اعتماد تھا۔ اور اسباب اسکے مخالف ہو گئے۔ تو اب اس کے پاس کوئی سہارا نہیں اور موحد کو خدا پر اعتماد ہے۔ اور خدا کو وہ اپنا مخالف نہیں سمجھتا۔ بلکہ مولیٰ اور آقا سمجھتا ہے۔ اس کو اسباب کے مخالف ہو جانے پر بھی یہ امید ہے کہ شاید خدا تعالیٰ اسباب مخالفہ کو موافق بنا دیں۔ اور اگر اسباب مخالف ہی رہے اور اس کو ناکامیابی بھی ہو جائے۔ تب بھی وہ راضی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو بات بھی آتی ہے۔

اس میں خیر ہی ہوتی ہے۔ پس اس صورت میں اگر دنیا کا عسر رہا۔ تو میری آخرت کی ترقی ہوگی۔ قل ھل تربصون بنا الا احدی الحسنیین ط موحد کیلئے مصائب میں بھی فائدہ ہی ہے۔ اور وہ تکالیف سے بھی خوش ہوتا ہے۔ جیسے بچہ دودھ چھوٹنے کے وقت گو پریشان ہوتا ہے اور اس وقت اسکو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر بعد میں ماں کو دعا دیتا ہے۔ کہ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی		مرا با جان جاں ہمراز کردی

وہ کہتا ہے کہ اس ماں کا خدا بھلا کرے جس نے دودھ چھڑا کر مجھے اس قابل کردیا۔ کہ آج میں پلاؤ زردہ قورمہ اور کباب کھا رہا ہوں۔ اگر دودھ ہی پیتا رہتا تو یہ نفیس و لذیذ غذائیں کیونکر کھاتا۔ اسی طرح موحد کو مصیبت کیوقت گو ظاہر میں تکلیف ہوتی ہے مگر تکلیف کے بعد جب اپنی ترقی کا احساس ہوتا ہے۔ تو وہ خوش ہوکر یوں کہتا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من		دل فدائے یار دل رنجان من

اور موحد عارف کو تو عین مصیبت کے وقت اس کی حکمتیں اور اپنی ترقی محسوس ہوجاتی ہے اسلئے وہ تکلیف بھی لذیذ ہوجاتی ہے اور سب سے بڑھ کر مصیبت لوگوں کی نظر میں موت ہے۔ یہ منتہی المصائب ہے۔ کہ وہ تمام مصائب کا انتہائی درجہ ہے اور اسی کے اندیشہ سے آدمی تمام مصائب سے گھبراتا ہے۔ مگر عارف موحد کے نزدیک یہ زہر کا پیالہ بھی شیریں ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے		راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(ایضاً صفحہ ۲۴ تا ۳۰ ملخصاً)

(۸۰) اس شبہ کا جواب کہ مولوی لوگوں کو کافر بناتے ہیں

یہ لوگ ہمپر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ مولوی لوگوں کو کافر بناتے ہیں۔ میں

اس کے جواب میں کہا کرتا ہوں۔ کہ مولوی کافر بناتے نہیں۔ بلکہ کافر بتاتے ہیں۔ یعنی جو شخص اپنی حرکتوں سے کافر بن جاتا ہے مولوی اس کے کفر کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے کسی کے کپڑے میں پاخانہ لگا ہوا ہو۔ اور دوسرا شخص اس سے کہدے کہ آپ کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے۔ اس کو دھو لیجئے۔ تو کہئے اس نے پاخانہ لگایا۔ یا کہ پاخانہ لگا ہوا بتا دیا۔ پس آپ کا مولویوں پر جھلانا ایسا ہی ہے۔ جیسا وہ شخص جس کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے بتلانے والے کو دھمکانے لگے۔ کہ واہ صاحب تم ہمارے لباس میں پاخانہ لگاتے ہو۔ وہ کہے گا بیوقوف میں نے لگایا نہیں نہ میرے پاس پاخانہ موجود ہے۔ جو میں لگاتا۔ تو نے خود اپنی بے احتیاطی سے کہیں سے لگا لیا ہے۔ میں نے تو تجھے اطلاع کی ہے۔ کہئے ان دونوں میں کون حق پر ہے۔ دیکھو کافر بنانا تو یہ ہے۔ کہ کسی کو کفر کی تلقین کی جائے۔ جیسے مسلمان بنانا یہ ہے۔ کہ کسی کو اسلام کی تلقین کی جائے۔ تو جس طرح ہم کافروں کو اسلام کی تلقین کر کے مسلمان بناتے ہیں۔ کیا اسی طرح کسی مسلمان کو تلقین کفر کرتے ہوئے آپ نے کسی مولوی کو دیکھا ہے۔ کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مولوی کافر بناتے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ وہ کافر بتاتے ہیں۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام صـ۲)

(۸۱) عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت خیر خواہ ہے

آجکل ہر بات میں عقل پرستی کا زور ہے۔ ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کیلئے حکم بنایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شرعیات میں بھی اور شرعیات میں سے معاد میں بھی۔ اور پھر عقل بھی کونسی وہ جو دنیا کے معاملات میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ تعجب ہے کہ اس کو حکم بنایا گیا ہے۔ ایسے عظیم فیصلہ کے لئے۔ اور تمنا کی جاتی ہے۔ کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا۔ لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی۔ کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے۔ تو عقل ہماری اتنی

خیر خواہ نہیں ہیں جتنی شریعت خیر خواہ ہے۔ دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے۔ کہ استحضار تصدیق دواماً ضروری ہو۔ ایک ساعت بھی غفلت جائز نہو جیسا ایک بزرگ غلبہ میں فرماتے ہیں ؎

ہر آنکہ غافل از حق یک زمان است		در آں دم کافر است اما نہان است

یہاں کافر سے کافر اصلی مراد نہیں ہے یعنی مومن کامل کے مقابل اور کامل بھی کیسا جو اکملیت کے درجہ پر پہنچا ہوا ہو۔ کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں۔ اور ایک درجہ کامل کا ہے۔ اور ایک اکمل کا۔ اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد حق میں غفلت کرے۔ اُسے اضافۃً کافر کہدیا ہے اس سے حقیقی اور فقہی کافر مراد نہیں۔ غرض غلبہ حال جو اقتضا ہے کہ استحضار دواماً ہو۔ عقل کا بھی وہی اقتضا ہے۔ تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی۔ اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ سب کو عاصی قرار دیتی۔ شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپکے ذہول کی اجازت دیدی۔ اور عدم تصدیق کو بھی جبکہ تکذیب نہ ہو تصدیق کا قائم مقام کردیا۔ اب بتائیے عقل زیادہ خیر خواہ ہوئی۔ یا شریعت مقدسہ یہ تو ان عقل پرستوں کو خطاب تھا جن پر سائینس کا غلبہ ہے۔ اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں (آثار العبادہ ص)

(۸۴) کفار کا مال ڈبالینا حلال نہیں ہے

آجکل اجتہاد کا زور ہے۔ حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں۔ خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا۔ تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے۔ تو مسلمان کا مال تو بدون طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے۔ اور پھر شاید اس استدلال سے منتفع ہوکر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں۔ کہ وہ مسلمانوں کی نہیں ہے۔ اور غیر مسلم اس کے مالک ہیں

خواہ اُن کے پاس ٹھیکہ ہے۔ اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھکر یہ تاویل کرتے ہیں
کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہی
کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مگر بہت لوگ اس جگہ مسلم کی
قید دیکھ کر یوں سمجھے ہونگے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ جرم نہیں خواہ
اس پر ہمارا حق ہو یا نہو۔ کیونکہ حضور نے تو مسلم کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہی
اس کا ایک جواب ظاہر تو یہ ہے۔ کہ یہ قید اتفاقی ہے۔ کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ
مسلمان ہی سے پڑتا ہے۔ ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال حلال
نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث وعید میں الرجل یقتطع مال الرجل آیا ہے۔ رواہ
فی الترغیب عن الحاکم۔ وقال صحیح علیٰ شرطهما۔ اور دوسرا جواب یہ
ہے کہ کافر ذمی اور کافر مسالم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے
ہے۔ لهم مالنا وعلیهم ما علینا۔ البتہ کافر محارب کا مال مباح ہے۔ مگر
وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس کے متعلق
ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے
مال لینے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھئی اگر کسی کا حق ہی رکھنا
ہو تو مسلمان کا رکھ لے۔ کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو
دی جاویں گی۔ تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اُس کے بھائی ہی کو ملیگا
خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا۔ تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی۔ کہ اپنی نیکیاں اُسے دے
دیں۔ اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر۔ پھر اس صورت میں
نہ تمہارا بھلا نہ اُس کا بھلا۔ کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا۔ اگر کوئی کہے۔ کہ پھر
اُسے کیا نفع ہوا۔ جب نیکیاں اُس کے کارآمد نہ ہوئیں۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو
ہوگا۔ مگر اتنا کم ہوگا۔ کہ اُسے محسوس نہوگا۔ جیسے اگر کسی کے پاس من بھر سونے کا
ایک ڈھیر ہے۔ اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چُرا لیا۔ تو واقع میں تو
کمی ہوئی۔ مگر محسوس نہوگی۔ لیکن اس سے کوئی عادل اور کوئی عاقل اس کی

اجازت نہ دیگا - کہ اتنا سا چرا لیا کرو - مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہو - اور کوئی یہ کہکر ملا دے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا - تو کیا یہ جرم نہیں - یقیناً جرم ہے - اگر اطلاع ہو جائے تو ضرور سزا ہوگی - مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی - کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے - مگر عدم احساس سے بطلان شے تو لازم نہیں آتا - اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو - مگر سزا میں کچھ تخفیف ہوگئی ہو - تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا - اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی - گو اُسے خفت کا احساس نہو - اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے لا یخفف عنہم العذاب - کہ اُن کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جاوے گی - اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی - یہ تعارض ہوا - اس کا ایک جواب تو یہ ہے - کہ ایسی تخفیف نہوگی جس سے راحت محسوس ہو - باقی یہ مطلب آیت کا نہیں کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا - اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہوگا - کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں - کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں - اور بعضے ایسے نہیں - اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں - یہ نہیں کہ فرعون اور شداد اور نمرود کے برابر اُس کافر کو بھی عذاب ہوگا - جو غریب مسکین مظلوم تھا - تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا - کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا - کسی کو اس کا ضعف ہوگا اور کسی کو ضعفین اور یہ سب قرآن میں آیا ہی البتہ جس کے لئے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائیگا - پھر اس سے کمی نہ ہوگی - اور یہ دوسرا جواب ہے - یعنی مطلق خفت کی نفی نہیں ہی - بلکہ عذاب مجوزہ میں خفت کی نفی ہے - بہرحال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا - کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ بُرا ہے - اب تیسرا جواب سنئے - حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل اُمت سے یہ احتمال ہی نہ تھا

کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہنچائیگا۔ اگر کریگا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کرے گا۔ کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا خیال یہ تھا۔ کہ خانۂ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب حضور نے امت کو اس سے بھی روک دیا جس سے اب خانۂ دوستاں بروب کی بھی گنجایش نہ رہی۔ اسکی اس لئے تشریح کردی کہ شاید اس قول کے ظاہر پر عمل کرنے لگے۔ اب ایسے شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اسکے گھر سے لائے ہیں۔ وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے۔ وہ بھی سب لیجائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑیگا۔ اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے (اسرار العبادہ صـ۱۶)

(۸۳) اعتقاد تقدیر سے دنیا میں بھی راحت رہتی ہے۔ اور انکار تقدیر سے پریشانی بڑھتی ہے

اعتقاد تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کیساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں بھی راحت رہے۔ کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہوا کرے بلکہ یہ سمجھ کر کہ تقدیر میں یونہی تھا۔ صبر و شکر سے کام لیا کریں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ اعتقاد تقدیر کا یہ اثر ہمارے اندر کتنا ہے۔ سو دیکھنے سے معلوم ہو گا۔ کہ ہم مصائب و حوادث میں ضعف قلب اور قلت اعتقاد کی وجہ سے ایسے ہی پریشان ہو جاتے ہیں۔ جیسا ایک دہری یا منکر تقدیر پریشان ہوتا ہے۔ صاحبو! اگر ہمکو تقدیر کا پلکے اعتقاد ہے۔ تو اس کا اثر ظاہر میں بھی تو کچھ ہونا چاہیئے۔ یاد رکھو محض زبان سے اتنا کہدینا تو آسان ہے۔ کہ ہمکو تقدیر پر اعتقاد ہے۔ مگر امتحان کے وقت ہر شخص کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اور امتحان کا وقت یہی ہے۔ جبکہ مصائب و حوادث کا نزول ہو رہا ہو۔ اور کسی کی قلعی نہ بھی کھلے تب بھی حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے وہاں تو کوئی حیلہ نہیں چل سکتا۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام	درغلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست	باخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن	رائت اخلاص و صدق افراشتن

صاحبو! جو شخص سچ مچ تقدیر کا معتقد ہے۔ اس کو رنج و غم کبھی نہیں ہوتا اور یہ جو کبھی کبھی آپ ان کو مصائب میں دیکھتے ہیں۔ یہ نظر بد سے بچانے کے لئے صورت رنج و غم ہے۔ جس کو مولٰنا فرماتے ہیں ؎

دل ہمی گوید از و رنجیدہ ام	وز نفاقِ سُست او خندیدہ ام

ان کو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرچوں کے کھانیوالیکو کلفت ہوتی ہے۔ کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں۔ مگر دل میں ہنس رہا ہے۔ اور مزے لے لیکر کھا رہا ہے۔ ان کو اس میں ایسی لذت آتی ہے کہ سلطنت کے بدلہ میں بھی اپنی تنگی اور فقر و فاقہ وغیرہ کو دینا نہیں چاہتے۔ چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک شہر کے دروازہ پر پہنچے۔ دیکھا کہ شہر پناہ کا دروازہ بند ہے لوگوں سے پوچھا کہ دن میں دروازہ کیوں بند کیا گیا۔ کیا کسی دشمن کا خطرہ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ بادشاہ کا باز اُڑ گیا ہے۔ اس لئے دروازہ بند کرا دیا کہیں دروازہ سے نہ نکل جائے۔ یہ سُنکر آپ بہت ہنسے اور سمجھ گئے کہ بادشاہ محض احمق ہے۔ بھلا باز کو دروازہ سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو اوپر سے بھی جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آپنے بطور ناز کے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ سبحان اللہ یہ تو اتنا احمق اور اسکو بادشاہ بنا دیا۔ اور ہم ایسے عاقل اور عارف اور ہماری یہ حالت ہے۔ کہ پیر میں جوتی بھی سالم نہیں۔ بدن پر کپڑے بھی درست نہیں۔ ان بزرگ کا مقام ادلال کا تھا۔ مگر ناز ہر وقت نہیں چلتا۔ کیونکہ کبھی وہ بھی ناز کرنے لگتے ہیں۔ یہ کیا کہ تم ناز کرو۔ اور وہ کبھی نہ کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ بہت اچھا کیا تم اس پر راضی ہو کہ اس بادشاہ کی حماقت و جہالت مع سلطنت کے تم کو دیدی جاوے اور تمہاری معرفت و محبت معہ فقر و تنگدستی و خستہ حالی کو اس کو دیدی جاوے۔

یہ جواب سنتے ہی وہ بزرگ کانپ اُٹھے اور فوراً سجدہ میں گر پڑے۔ کہ میں اس گستاخی سے توبہ کرتا ہوں اور اس تبادل پر ہرگز راضی نہیں۔ تو حضرت وہ ایسا شیریں غم ہے۔ جس سے سلطنت کے ساتھ بھی تبادل گوارا نہوا اور وہ ایسا درد ہے کہ اگر کوئی ان کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر ان پر ترس کھائے۔ اور اس سے نجات اور سکون کی دعا کرے کہ خدا تم کو اس غم سے نجات دے تو وہ یوں کہتے ہیں ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آبحیات		ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشنی

اور کیوں نہ ہو یہ تو محبوب حقیقی کے عاشق ہیں۔ مجنوں نے تو ایک ادنےٰ مخلوق کی محبت کے غم سے بھی نجات نہیں چاہی۔ جب اس کا عشق مشتہر ہوا اور سوز و گداز سے کھانا پینا متروک ہوگیا۔ اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا تو اس کا باپ مکہ معظمہ میں اسکو لایا۔ اور کہا بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر خدا سے دعا کر کہ لیلےٰ کی محبت میرے دل سے نکال دے تو اس نے رو کر کہا ؎

یا رب لا تسلبنی حبها ابداً		ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

اور کہا ؎

الٰھی تبت من کل المعاصی		ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

تو جب ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت میں غم لذیذ ہو جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت ہو تو کیا عجب ہے۔ اب اسکو غم کہنا ہی غلط ہے وہ واقع میں غم نہیں محض صورت غم ہے اور جو واقعی غم ہے۔ اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا۔ یا اس کو دنیاوی نقصان نہیں ہوتا یہ سب کچھ اسے پیش آتا ہے۔ اور اس سے کلفت بھی اس کو ہوتی ہے۔ مگر پریشانی و حقیقی غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو۔ اور کلفت کہتے ہیں الم۔ دکھن کو اہل اللہ کو مصائب میں الم تو ہوتا ہے۔ مگر گھٹن نہیں ہوتی۔

اس کی ایسی مثال ہی جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم میں نشتر لگائے۔ اُس وقت تمکو الم تو ہوگا۔ مگر رنج وغم نہ ہوگا۔ گو ظاہر میں تم ہائے ہائے بھی کروگے۔ مگر دل اندر سے خوش ہوگا۔ اور اس الم پر راضی ہوگا۔ کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت کیموافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع و مفید خیال کرتے ہو یہی حال اہل اللہ کا ہی زمانہ کی مصائب و حوادث کیساتھ کہ وہ ان کو عین حکمت اور سرتاپا مصلحت سمجھتے ہیں اس لئے ہر حال میں خوش ہیں اور یوں کہتے ہیں ؎

ابھی دل کی حسرت یہی آرزو ہے	نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

غرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنیوالے ہیں ان کو غم حقیقی کبھی ہوتا ہی نہیں۔ پس الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون اپنی حقیقت پر ہے اس میں تاویل کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہی کہ ان کو حقیقی خوف و حزن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ جس کا اثر یہی ہی کہ رنج و غم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جیسا کہ ابھی میں نے ایک آیت سے ثابت کیا تھا۔ لکیلا تاسوا علی مافاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم۔ پس قائل تقدیر کو آخرت میں تو خوف و حزن ہو ہی گا نہیں۔ دنیا میں بھی اسکو غم نہیں ہوتا۔ اس لئے لاخوف علیہم ولاھم یحزنون ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہی۔ اسکو دنیا میں بھی غم ہی اور آخرت میں بھی۔ اور جس کا اعتقاد ضعیف ہے وہ آخرت میں تو پٹ چھٹ کر جنت میں پہنچ جائیگا۔ مگر دنیا میں عمر بھر ضرور بے چین رہیگا۔ تو کیا اچھا ہو کہ یہاں بھی راحت ہی ہو۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل و اعتقاد کو کامل کرو۔ پھر تمہارے لئے دنیا میں بھی چین ہوگی لھم البشری فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو اس چین کی ضرورت نہیں دنیا میں ہمکو بے چینی ہی منظور ہے تو یہ شخص قابل خطاب نہیں پھر ہم تو جب جانتے کہ یہ لوگ دنیا کی چیزوں سے بھی صبر کر لیتے۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہی کہ چار پیسوں سے بھی صبر نہیں۔ اور آخرت کے بارہ میں ایسی ہمت ہی کہ وہاں کی راحت اور دنیا کی حیات

طیبہ سے عبر ہے۔ اس کا نام صوفیہ کے محاورات میں صبر فرعون ہے۔ مولانا اسکی شکایت فرماتے ہیں ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن	صبر چوں داری زرب ذوالمنن
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں	صبر چوں داری زنعم الماہدون

(خیر الحیات وخیر الممات صث)

(۴۸) روح کو موت نہیں آتی۔ بلکہ جسم عنصری کو آتی ہے۔ اور بحث حقیقت روح

یاد رکھو موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے۔ روح کو موت نہیں آتی۔ بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری سے منقطع ہو جاتا ہی۔ اب اس کے بعد یہ سمجھو کہ لذات سے منتفع ہونیوالا کون ہے۔ کیا آپ کے نزدیک یہ بدن ہی۔ ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہی کہ روح منتفع و متلذذ ہوتی ہے اور جسم اسکے لئے بمنزلہ آلہ و مرکب کے ہے اور یہ روح موت کے بعد بھی علیٰ حالہ باقی رہتی ہے۔ بلکہ اب اسکی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے تو موت کے بعد وہ اس عالم کے لذات سے متلذذ ہوتی ہے اور اگر تم یہ سمجھو کہ میری حقیقت تو محض جسم ہی ہے۔ تو اسکی ایسی مثال ہوگی۔ جیسے کوئی گدھے پر سوار ہو کر یوں سمجھے کہ میں گدھا ہوں سو اس کا تو کوئی علاج نہیں صاحب آپکی حقیقت وہ ہی جس کو آپ جسم میں نے تعبیر کرتے ہیں کہ میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس "میں" کا مصداق کیا چیز ہے کیا آنکھ۔ ناک۔ یا منہ اور ہاتھ پیر کو "میں" کا مصداق کہہ سکتے ہو۔ ہرگز نہیں ورنہ چاہیے کہ ان اعضا کے جاتے رہنے سے انسان ہی جاتا رہے۔ اور یہ غلط ہے۔ رہے اور اعضا شریفہ اور قوائے شریفہ جیسے قلب اور عقل وغیرہ۔ ممکن ہے کہ آپ ان کو "میں" کا مصداق کہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ بھی اس کا مصداق نہیں ہیں کیونکہ آپ ان کو اپنی طرف مضاف کرتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہو گیا۔ یا میری عقل میں

یوں آتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اضافت علامت مغائرت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ بھی
آپ کی حقیقت نہیں۔ بلکہ حقیقت آپکی روح ہے اور گو وہاں بھی اضافت ہوتی
ہے۔ کہ میری روح۔ مگر چونکہ مستقل دلائل سے ثابت ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ اس لیے
یہ اضافت مجازیہ ہے۔ اور دوسرے اعضاء و قویٰ میں ایسی کوئی دلیل نہیں۔
بلکہ خلاف پر دلیل قائم ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں یعنی بالکل بچپن میں عقل نہیں ہوتی
اور آپ ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں یعنی بعد موت قلب نہ رہیگا۔ اور آپ ہونگے
صاف دلیل ہے کہ آپ کی حقیقت یہ چیزیں نہیں۔ اس لئے یہ اضافت حقیقیہ ہے
بہرحال آپ کی حقیقت روح ہے۔ اور اس پر موت نہیں آتی۔ بلکہ وہ بجنسہ موت کے
بعد اپنے حال پر رہتی ہے۔ اور اب بجائے اس جسم کے جو موت کے بعد فنا اور
شکستہ ہو جاتا ہے۔ روح کا مرکب دوسرا جسم بنتا ہے۔ جس کو جسم مثالی کہتے ہیں
اب روح اس جسم کے ذریعے سے سارے انتفاعات و تلذذات حاصل کرتی ہے
اور یہ جسم مثالی وہ نسمہ ہے۔ جس کو متکلمین اہلِ ظاہر روح کہتے ہیں۔ یعنی موت
کے وقت جو چیز جسم عنصری سے الگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نسمہ ہے
اور یہ بھی مادی چیز ہے۔ مگر اس کا مادہ لطیف ہے۔ اور اس کو اس جسم عنصری
کے ساتھ ایسا حلولی تعلق ہے۔ جیسا جسم تعلیمی کا تعلق جسم طبعی کے ساتھ حکماء نے
بیان کیا ہے۔ یعنی وہ نسمہ مقدار اور ہیئت و شکل میں بالکل جسم عنصری کے برابر
ہے (اور وجہ تشبیہ یہی ہے۔ ورنہ جسم تعلیمی تو عرض ہے۔ اور یہ جوہر) اور یہ
نسمہ اس وقت یعنی زندگی میں اسکے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور موت کے
وقت وہ الگ ہو جاتا ہے۔ یہی جسم مثالی ہے۔ جو موت کے بعد روح حقیقی کا مرکب
بنتا ہے۔ اور یہ جسم مثالی گو مادی ہے۔ مگر اس جسم سے زیادہ لطیف و قوی
ہے۔ اور روح حقیقی جو حقیقت میں انسان ہے وہ مادہ سے بالکل مجرد ہے
وہ نہ اس وقت جسم کے اندر ہے۔ نہ وقت گیبہ تعلق اس سے الگ ہو۔ بلکہ وہ تو
محض جسم کی مدبر ہے۔ جو اب بھی بدن سے الگ ہی ہے۔ اور اس کی تدبیر

کررہی ہے اور گو متکلمین نے روح کے تجرد کا انکار کیا ہے۔ مگر اس بارہ میں فلاسفہ کا قول راجح ہے۔ دلائل سے قوت انہی کے قول کو ہے۔ اور صوفیہ کا کشف بھی اسی کے موافق ہے۔ کہ روح حقیقی مادہ سے مجرد ہے۔ البتہ فلاسفہ کا اس کو قدیم کہنا جیسا قدمار کا قول ہے۔ یا حادث بعد حدوث البدن کہنا جیسا مشائین کا قول ہے۔ یہ بالکل غلط اور خلاف نصوص ہے۔ اور متکلمین نے جس چیز کو روح سمجھ کر مادی کہا ہے۔ وہ در اصل روح حقیقی نہیں بلکہ نسمہ ہے۔ جو مرکب روح ہی غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسان میں جو اصل چیز ہے اور حقیقت میں وہی انسان ہے۔ موت کے بعد وہ اپنے حال پر رہتا ہے۔ اس کی قوت و صفات میں کچھ کمی نہیں آتی۔ بلکہ پہلے سے کچھ ترقی ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ گو روح کو موت نہیں آتی۔ مگر جسم سے تو تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ تو جو انتفاعات روح سے تنہا نہیں ہو سکتے تو وہ اب نہو سکیں گے۔ اس کا جواب بھی معلوم ہوگیا کہ موت کے بعد جسم مثالی مرکب بنتا ہے جو اس جسم عنصری سے لطیف اور قوی تر ہے۔ وہ سب لذات سے منتفع ہوتا ہے۔ جس کے مقابلہ میں یہاں کی لذات ہیچ ہیں۔ اور روح ان سے متلذذ ہے۔ کھانا بھی۔ پینا۔ سیر و تماشا بھی۔ ملاقات احباب بھی۔ مکانات اور باغات بھی وغیرہ وغیرہ۔ اس حقیقت کا مراقبہ کر کے موت کا دھیان کرو تو انشاء اللہ موت سے وحشت نہو گی۔ بلکہ اس کا شوق پیدا ہو گا۔ اور یوں کہو گے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم	راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(خیر الحیات و خیر الممات ص ۳۲)

(۸۵) کفار کیلئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم آخرت میں رحمت کیسے ہونگے کیونکہ وہ تو ابدی جہنمی ہیں۔ اس کا جواب

ایک رحمت عامہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے

سخت سخت عذاب ٹل گئے۔ جو پہلی امتوں پہ آئے تھے۔ کہ بعض قومیں سور بندر بنادی گئیں۔ کسی کا تختہ اُلٹ گیا۔ کسی پر آسمان سے پتھر برسے۔ یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے۔ کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آئے۔ اور اس رحمت کو عام اس لئے کہا گیا۔ کہ کفار کو بھی شامل ہے۔ جو کہ امت اجابت میں داخل ہیں اب یہاں یہ ایک سوال ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمت عام ہونا ثابت ہو گیا۔ مگر آخرت میں کفار کیلئے آپ کی رحمت کیا ہوگی۔ کیونکہ کفار تو ابدالآباد کیلئے جہنم میں رہیں گے اُن کے حق میں آپکی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا۔ اسی طرح جن مومنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی۔ اُن کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی۔ اسکے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہو جائیگا۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جرم کرے جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو۔ اور اس میں سے کچھ تخفیف کردی جاوے۔ تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہو۔ اور اس میں سے کچھ تخفیف کردی جاوے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت میں داخل ہیں۔ اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلے اللہ علیہ وسلم جن گنہگار مسلمانوں کیلئے جو کہ جہنم میں جائیں گے۔ سفارش فرمائیں گے۔ اگر یہ شفاعت نہ ہوئی تو ان کی میعاد اور زیادہ ہوتی۔ تو میعاد کی کمی یہ رحمت سے ہوئی۔ کوئی ہزار برس کے عتاب کا مستحق تھا۔ اور حضور کی سفارش سے اسمیں کمی کردی جاوے۔ مثلاً پانچ سو برس کے بعد وہ جہنم سے نکال دیا جاوے۔ تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے۔ اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کہ میعاد میں کمی کردی جاوے۔ عذاب تو ان کو ابدالآباد تک ہوگا۔ مگر بقول شیخ عبد الحق محدث رحمۃ اللہ جو عنقریب آتا ہے۔ عذاب میں تخفیف کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے۔ چنانچہ بعض کفار کیلئے حضور کی

برکت سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے ۔ کہ ایک صحابی نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ ابو طالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع بھی ہو گا حضور نے ارشاد فرمایا۔ کہ اگر میں نہ ہوتا۔ تو ابو طالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے۔ مگر میری وجہ سے یہ ہوا۔ کہ ان کو صرف دو جوتیاں آگ کی پہنائی جائیں گی جس سے اُن کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکّے گا۔ اور اس پر بھی وہ یہ سمجھیں گے۔ کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں ابولہب کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ اُنہوں نے حضور کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانیوالی باندی کو آزاد کر دیا تھا۔ ہر پیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پینے کو مل جاتا ہے۔ باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی حدیث سے تو معلوم نہیں ہوئی۔ مگر شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمت اللہ علیہ نے اپنی ایک کتاب اشعتہ اللمعات میں لکھا ہے۔ کہ قیامت کے دن حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اس طرح ہو گی۔ ان میں ایک شفاعت ایسی ہو گی کہ حضور عام کفار کیلئے شفاعت فرمائیں گے۔ کہ یہ لوگ جس سخت عذاب کے مستحق ہیں۔ اس میں کچھ کمی کر دیجاوے چنانچہ آپ کی برکت سے اُن کے عذاب میں کمی کر دی جاویگی۔ گو کم ہونیکے بعد بھی وہ اس قدر سخت عذاب ہو گا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے۔ خدا محفوظ رکھے۔ وہاں کا تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہو گا کہ ہر شخص یہی سمجھیگا۔ کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ چنانچہ ابو طالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہو گا۔ مگر وہ یہی سمجھیں گے۔ کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں۔ تو کفار کو اس کمی کا احساس نہ ہو۔ مگر حضور کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا۔ آپ کی رحمت تو اُن کے ساتھ بھی پائی گئی۔ اور چونکہ شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی۔ گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی۔ مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہی۔ اس لئے ان کا یہ قول قابل تسلیم ہے۔ اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے قرآن میں تو کفار کے بارہ میں ارشاد ہے لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم

بنظر فرق ہو کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جاویگا۔ اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہی کہ حضور کفار کے حق میں بھی تخفیف عذاب کی شفاعت فرماویں گے۔ دونوں میں تعارض ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب آخر میں اُن کیلیئے طے ہوگا۔ پھر اس سے کمی نہ کی جائیگی۔ اور یہ اس لیئے ارشاد فرمایا گیا۔ تاکہ کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے۔ کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلے پہل بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے۔ پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔ ایسی ہی جہنم کی آگ بھی ہوگی۔ کہ رفتہ رفتہ ہزار دو ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہوجائیگی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں۔ جیسی اوّل دن میں تیز ہوگی۔ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہونگے اُس میں کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہوگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر اُن کیلیئے عذاب طے ہوکر قرار پائے گا۔ وہ ہمیشہ ایک حال پر رہیگا۔ زمانہ دراز گذر جانے سے اس میں کمی واقع نہ ہوگی۔ واللہ اعلم (شکر النعمۃ بذکر رحمۃ الرحمہ صفحہ ۲۵ تا صفحہ ۳۰ ملخصاً)

(۸۶) مطیع اور غیر مطیع پر مصائب آنے میں بہت فرق ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ باتیں بیماری مقدمہ وغیرہ نمازیوں کو پیش نہیں آتیں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ نہ بیماری میں کوئی تخصیص نمازی اور غیر نمازی کی ہے۔ نہ مقدمہ میں۔ نہ اور کسی مصیبت میں۔ میں کہتا ہوں کہ مصائب بیشک پیش آتے ہیں۔ ان کو بھی اور اُن کو بھی۔ مگر فرق ہے۔ دونوں میں اُن کے واسطے مصائب سزا ہیں۔ اور انکے لیئے اور اُن کے لئے باعث رفعت مراتب اور موجب قرب ہیں۔ اس پر شاید کہا جائے کہ یہ تو دل کو سمجھانے کی بات ہے۔ اور من گھڑت ہی۔ اس کا عکس بھی تو ممکن ہے جب صورۃً دونوں جگہ یکساں ہیں۔ تو وہ بھی اپنا دل اس طرح خوش کر سکتے ہیں۔ کہ مصیبت جو آئی ہے تو کچھ بُرا نہیں۔ ہمارے درجے بلند ہوں گے۔ جیسے نمازیوں نے

اسی طرح دل کو سمجھا لیا تھا۔ میں کہتا ہوں واقعیت کسی چیز کی من سمجھوتا کرنے سے
نہیں بدلتی۔ دعویٰ دونوں فریق اس کا کر سکتے ہیں۔ کہ مصیبت ہمارے لئے رحمت
ہے۔ لیکن کسی علامت سے امر واقعی کا پتہ چل جائے۔ تو بات طے ہو سکتی ہے کہ حق کس کی
طرف ہے۔ وہ علامت یہ ہے کہ خاصہ ہے کہ مطیع پر جب مصیبت آتی ہے۔ تو اس کو
پریشانی نہیں ہوتی۔ اور رحمت کی حقیقت یہی ہے۔ اور مصیبت کی حقیقت پریشانی
ہے۔ اس کو کان میں رکھو۔ اور دونوں منظر دیکھ لو۔ ایک ہی واقعہ جس کو مصیبت کہا
جاوے نمازی پر یعنی مطیع پر آوے۔ تو اس کا اس کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے اور
وہی واقعہ عاصی پر آوے تو کیا ہوتا ہے۔ زمین آسمان کا فرق ملیگا۔ دونوں میں
اور ذرا سے غور سے نزاع رفع ہو جاویگا۔ عاصی کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ مصیبت میں۔
اور مطیع کو ڈھارس رہتی ہے۔ کیونکہ اس کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے۔ اور عاصی کے
دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق حاصل نہیں۔ تعلق خدا مقوی قلب ہے۔ اور خدا سے تعلق
میں یہ اثر کیوں نہ ہو۔ ایک کلکٹر سے جس کو تعلق ہوتا ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا
پھر جس کو تعلق خدا سے ہو۔ وہ کیسے ڈریگا۔ اور اس کا دل کیوں ٹوٹے گا۔ اور عاصی
کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ اس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ ڈرتا ڈرتا رہتا ہے۔ یہی تو
فرق ہے۔ پولیس میں اور ڈاکوؤں میں۔ مقابلہ کے وقت میدان میں دونوں موجود ہیں
اور مارنے میں دونوں شریک ہیں۔ ظاہری نظر سے دیکھنے والا کہہ سکتا ہے۔ کہ
دونوں فریق ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔ یہ بھی مر رہے ہیں اور وہ بھی مر رہے ہیں
تو کسی کو حق پر اور کسی کو ناحق پر کیسے کہیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا
ہے۔ پولیس مر ضرور رہی ہے۔ مگر دل اُن کے مضبوط ہیں اور اُن کی ڈھارس بندھی
ہوئی ہے۔ اور ڈاکو ہمت پولیس سے بھی زیادہ کر رہے ہیں۔ مگر دل اندر سے ٹوٹے
ہوئے ہیں۔ اور پاؤں نہیں جمتے۔ اور موقع دیکھتے ہیں۔ کہ آنکھ بچے تو بھاگ جاویں
یہ اثر اسی کا ہے کہ پولیس مطیع ہے۔ اور اس کو حاکم سے تعلق ہے۔ اور ڈاکو عاصی
ہے اس کے دل کو کسی کا سہارا نہیں۔ اس مثال سے عاصی اور مطیع کی حالتوں کا

فرق بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ نمازی اور مطیع پر جب مصیبت آتی ہے۔ تو وہ صبر و سکون کے ساتھ رہتا ہے۔ اور کوئی بیہودہ کلمہ تک اس کے منہ سے نہیں نکلتا۔ اور عاصی پر جب مصیبت آتی ہے۔ تو پوری قیامت ہوتی ہے۔ چیخ پکار اور رونا پیٹنا مچ جاتا ہے۔ زبان سے بیہودہ کلمات بکتا ہے۔ اور دل میں شکایت ہوتی ہے۔ یہ ہے مصیبت جس کو مصیبت کہنا چاہیئے۔ یہ کھلی ہوئی علامت ہی اس بات کی کہ تعلق مع اللہ باقی نہیں۔ اور مطیع کا تعلق باقی ہے۔ گو جسمانی تکلیف ہے اور باقتضائے طبعی اس کا احساس کرتا ہے۔ اور رنج پاتا ہے۔ مگر دل اندر سے تازہ ہے۔ ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلم اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہیں۔ اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں۔ عاصی اور مطیع کی حالت میں فرق ضرور ہوتا ہی۔ بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اُس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے۔ جس کو بالکل تعلق نہیں یعنی کافر آپ کو نسبت حق تعالیٰ سے ضرور حاصل ہے۔ گو آپ کو خبر نہیں ؎

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر تا بزانو غرق ہستی اندر آب	تو ہمی جوئی لب ناں در بدر وز عطش و ز جوع گشتی خراب

ہماری وہ حالت ہے کہ ساری دولتیں حاصل ہیں۔ مگر عادت ہوگئی ہے بھیک مانگنے کی۔ ان کی طرف توجہ نہیں اور ادھر اُدھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ غیروں کی تقلید کرتے ہیں۔ عقائد میں خیالات میں۔ معاشرت میں۔ صاحبو! تمہارے پاس تو اتنی دولتیں ہیں کہ دوسرے نہیں سے لیگئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم ان سے متمتع نہیں ہوتے۔ اور ان سب دولتوں کی اصل تعلق مع اللہ ہے۔ اگر ہم اس سے کام لیں تو کبھی پریشانی نہ ہو۔ اللہ والا کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ دیکھئے سب سے بڑھ کر حادثہ موت کا ہے۔ اور دیگر مصائب جو مخوف عنہ ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ مقدمۂ موت ہیں۔ مگر

اہل اللہ کی حالت خود موت کے متعلق یہ ہے کہ بجائے پریشانی کے اُلٹی راحت ہوتی ہے
اُنہوں نے اس کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے۔ جس کے نام سے دنیا بھاگتی پھرتی ہے
ایک صاحب موت کی آرزو میں کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم	راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تا درِ میکدہ شاداں و غزلخواں بردم

(الظاہر ص۲۲)

(۸۷) قرآن کریم بے ترتیب اور غیر مرتبط کلام نہیں ہے

قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے۔ قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے۔ کہ حکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو بعض ضابطہ کے پابند ہیں۔ ضابطہ کی رو سے جو کام اُن پر واجب ہی وہ کر دیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیئے۔ ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا اُن کے سہل و یا آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے۔ اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اسکے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں۔ اور اس تجویز میں اُن پر تعب ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ شفقت پر مبنی ہے۔ اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔ اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے۔ کہ نصیحت کرنیوالا ایک تو اُستاد ہوتا ہے۔ اور ایک باپ ہوتا ہی۔ باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ اُستاذ تو ضابطہ پوری کر دیتا ہے۔ مگر باپ ضابطہ پوری نہیں کرسکتا وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اُس کے دل میں گھر کرلے کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہی۔ کہ بیٹے کی

اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جاوے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی تبلاتا ہے تو اس طریقہ
کو وہ اختیار کرتا ہے۔ جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جاوے۔ اور ان سب رعایتوں کا
منشاء وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جا سکتی
ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کیوقت کبھی بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو
جاتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے۔ کہ بری صحبت میں
نہیں بیٹھا کرتے۔ اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو۔ اسی درمیان میں اُس
نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے۔ تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع
کر کے کہیگا۔ کہ یہ کیا حرکت ہے۔ لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد پھر پہلی بات پر
گفتگو شروع کر دیگا۔ اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو۔ وہ کہیگا کہ یہ کیسا بے ترتیب
کلام ہے۔ بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر۔ مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا
ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے شفقت کا
مقتضا یہی ہے۔ کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا
لحاظ نہ کرے۔ دوسری بات کو بیچ میں رکھکر پھر پہلی بات کو پورا کرے۔ یہی راز ہے
اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری بے
ربطی کا منشا شفقت ہی ہے۔ کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے۔ کہ
ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے۔ بلکہ
وہ ایک نیا مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت
دیکھتے ہیں۔ تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں۔
اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر
لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ سورۂ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت
کا حال بیان فرمایا ہے۔ کہ انسان اُس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقعہ
ڈھونڈیگا۔ اپنے اعمال پر اُسے اطلاع ہوگی۔ اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے
ہوئے کام جتلا دیے جائیں گے۔ پھر فرماتے ہیں۔ بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ

ولو القی معاذیرہ ۵ (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا۔ بلکہ اس دن) انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائیگا) اگرچہ وہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے۔ جیسے کفار کہیں گے۔ واللہ ہم تو مشرک نہ تھے۔ مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا۔ اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کیلئے ہوگا۔ نہ کہ یاددہانی کیلئے۔ یہاں تک تو قیامت ہی کیلئے متعلق مضمون ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ و قرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم علینا بیانہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کو ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے۔ آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا۔ اور زبان سے پڑھوادینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں۔ اس وقت فرشتے کی قرأت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اسکے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔ کلا بل تحبون العاجلۃ و تذرون الاخرۃ کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ پھر فرماتے ہیں۔ وجوہ یومئذٍ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ ۵ بعضوں کے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے الخ تو لا تحرک بہ لسانک سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے۔ اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کیلئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک گئے ہیں۔ اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے۔ کلامیکہ محتاج معنی باشد لا یعنی است۔ تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضورؐ کے ساتھ ہے۔ اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے۔ صاحب اس کا وہی موقع ہے۔ جیسے وہ

باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بُری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے۔ اور اُس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اُٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا یہ کیا حرکت ہے۔ لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر بیں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے۔ لیکن جو باپ ہوا ہو گا۔ وہ جانیگا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا۔ باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔ اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے۔ تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا۔ کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں۔ یہ کام ہم نے اپنے ذمے لیلیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔ قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جاے گا۔ تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہی اور اس کا مقتضا یہ تھا۔ کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا۔ تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی۔ مگر پھر بھی باوجود اسکے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے۔ کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔ (سبیل النجاح ص۳۶)

(۸۸) جواب اس شبہ کا کہ مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے ان ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں

اس کا جواب یہی کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنیکے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں۔ اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہی کہ ترتیب نزول آیات اور ہے۔ اور ترتیب تلاوت و مصحف اور ہے یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا۔ کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک

آیت نازل ہوگئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا۔ تو دوسری آیت نازل ہوگئی۔ وعلیٰ ہذا
تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے۔ اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی۔ تو
واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ
عزاسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کمتعلق
نازل ہوتی تو جبریل علیہ السّلام بحکم خداوندی حضور سے یہ کہتے۔ کہ آیت کو مثلاً سورہ
بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے۔ اور اس کو فلاں آیت کے بعد۔ اور
اس کو فلاں سورت کے ساتھ وعلیٰ ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر
نہیں۔ بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا۔ کہ جس
آیت کو بھی کسی آیت کیساتھ ملایا گیا ہے۔ دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت
اور تعلق ضرور ہے۔ کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوا۔ تو ترتیب نزول
کا بدلنا مفید نہ ہوگا (سبیل النجاح ص۹)

(۸۹) تفسیر بالرائے تحریف معنوی ہے

آجکل ایک شخص نے سورۂ بقر کی تفسیر لکھی ہے۔ وہ مفسر اس قابل ہے۔ کہ
بقرہ کی طرح ہی ذبح کر دیا جائے۔ ظالم نے تمام عبادات کو سیاسیات پر محمول کیا ہے
کہ نماز روزہ سب سیاسیات کیواسطے ہے۔ نماز میں پریڈ کی تعلیم ہے۔ تاکہ افسر کی اطاعت
کرنا آجائے۔ اگر وہ اُٹھنے کو کہے اُٹھو۔ بیٹھنے کو کہے بیٹھو۔ جھکنے کو کہے جھک جاؤ۔ اسی
واسطے نماز میں امام مقرر کیا جاتا ہے۔ تاکہ سب اسکے افعال کی اطاعت واتباع کریں۔
جس سے پریڈ کے وقت افسر کی اطاعت سہل ہوگی۔ روزہ اس واسطے مشروع ہے
تاکہ جنگ میں فاقہ کا تحمل ہو سکے۔ کیونکہ جنگ میں بعض دفعہ کھانے کو نہیں ملتا۔ حج
بھی اسی واسطے ہے تاکہ مسلمان سفر کے عادی ہوں۔ اور گھر بار چھوڑنا ان پر گراں
نہ رہے۔ اور احرام بھی اسی واسطے ہے۔ تاکہ ترک زینت کی عادت ہو۔ ایک لنگی
ایک چادر میں سردی گرمی کے تحمل کے عادی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ گویا کوئی عبادت

خدا کی یاد اور عبادت و بندگی کیلئے مشروع نہیں ہوئی۔ بس ساری شریعت میں ملک گیری و سیاست ہی کی تعلیم ہے۔ یہ ہے اس مقولہ کا مصداق۔ کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایعنی است۔ کیونکہ نماز روزہ اور حج سے آجتک بلاخصوص کسی نے نہ سمجھا تھا۔ یہ باتیں فرصت میں بیٹھکر اس شخص نے گڑھی ہیں۔ اور کھینچ تان کر نصوص کو ان پر منطبق کیا ہے۔ جیسے بعض شعرار نے قرآن کی بعض آیتوں کو کھینچ تان کر اوزان شعر پر منطبق کیا ہے۔ اور اس شخص نے یہ تفسیر لکھ کر گویا مخالفین اسلام کو یہ سبق پڑھایا ہی کہ وہ مسلمانوں کی نماز روزہ اور حج زکوٰۃ کو بھی خطرہ کی نظر سے دیکھیں۔ کیونکہ ان سب میں مقابلۂ اعدار کا طریقہ سکھلایا جاتا ہے۔ اور یہ نماز نہیں بلکہ چاندماری ہے۔ مگر مسلمان ہیں کہ اس تفسیر پر لٹو ہیں۔ کیونکہ وہ چکنے کاغذ پر چھپی ہوئی ہے۔ اور جلد بھی خوبصورت ہے۔ اور آجکل کتاب کی خوبی اسی میں رہ گئی ہے۔ کہ عمدہ چھپی ہوئی ہو۔ ٹائیٹل خوبصورت ہو۔ اس لئے بہت لوگ اس کو خریدتے ہیں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ اسکے اندر کیا بھرا ہے۔ اسکی بالکل ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک صندوق نقش و نگار سے مزین ہو۔ اور اس کے اندر سانپ بند ہو۔ خریدنے والا اوپر کے نقش و نگار سے فریفتہ ہو کر اُسے خریدتا ہے۔ مگر جب کھولیگا اُس وقت حقیقت منکشف ہوگی۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس مصنف کا دل بھی خود جانتا ہے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ کے جو مقاصد اس تفسیر میں لکھے ہیں۔ وہ قرآن کا مفہوم ہرگز نہیں۔ یہ محض ایجاد بندہ ہے۔ جس سے محض یہ مقصود ہے کہ اس تحریک کی تائید قرآن سے کی جائے۔ جس میں یہ شخص اور اسکی جماعت ایک زمانہ میں پیش پیش تھے۔ قرآن کی تفسیر ہرگز مقصود نہیں تھی۔ مگر مخلوق کو دھوکہ دینے کیلئے اس کو قرآن کی تفسیر میں ٹھونسا گیا ہے۔ سو یاد رہے ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام کارہا با خلق آری جملہ است	در غلط اندازی تا ہر خاص و عام با خدا تزویر و حیلہ کے رواست

یہ ممکن ہے کہ تم ان تاویلوں سے مخلوق کو دھوکہ میں ڈالدو۔ مگر خدا کے

سامنے یہ تاویلیں نہ چلیں گی۔ اسلئے ؎

کار با او راست باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن

تاویل وہ کرو جو خدا کے سامنے بھی بیان کر سکو (ارضاء الحق حصہ دوم صفحہ ۳)

(۹۰) قرآن کریم کے متعلق شبہات دور کرنے کا طریق

شبہات کا یہ علاج نہیں کہ تم اپنی رائے سے ہر شبہ کو دفع کرو۔ بلکہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ شبہات کے منشار کا علاج کرو۔ ہر شبہ کو الگ الگ دفع کرنے میں دردسری بھی ہے۔ اور اس سے سلسلہ شبہات کا ختم نہیں ہو سکتا۔ تم منشار کا علاج کرو۔ انشاء اللہ سب ایک دم سے زائل ہو جائیں گے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے رات کو اندھیرے میں گھر کے اندر چوہے چھچوندر کودتے پھرتے تھے۔ گھروالا ایک ایک کو پکڑ کر باہر نکالتا تھا۔ مگر وہ پھر سب کے سب اندر آجاتے تھے۔ ایک عاقل نے کہا کہ میاں یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کودتے پھرتے ہیں۔ تم لیمپ روشن کردو۔ یہ سب خود ہی بھاگ جائیں گے۔ پھر کوئی پاس نہ پھٹکے گا چنانچہ لیمپ روشن کیا گیا۔ اور سب کے سب ادھر ادھر اپنے اپنے بل میں گھس گئے۔ اسی طرح یہاں سمجھ لو۔ کہ یہ وساوس و شبہات جو وحی اور قرآن میں آپ کو پیش آتے ہیں ان کا منشار ظلمت قلب ہے۔ جس کا علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کرلو۔ پھر ایک شبہ بھی پاس نہ آئیگا۔ اور وہ نور کیا ہے۔ نور محبت ہے۔ حضرت محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول و فعل میں کوئی شبہ اور وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایک پروفیسر فلسفی کسی طوائف پر عاشق ہو جاوے۔ اور وہ اس سے یوں کہے۔ کہ سر بازار کپڑے اُتار کر ننگے آؤ۔ تو میں تم سے بات کرونگی ورنہ نہیں تو فلسفی صاحب اس کے لئے فوراً تیار ہو جائیں گے اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ بی ؟ اس میں تیری کیا مصلحت ہے۔ اب کوئی اس سے پوچھے۔ کہ آپ کی وہ عقل و فلسفیت اس طوائف کے سامنے کہاں چلی گئی افسوس

قرآن وحدیث کے مقابلہ میں توساری فلسفیت وعقل ختم کی جاتی ہے اور ایک ادنیٰ مردار کے احکام میں چون وچرا اور لم وکیف سب رخصت ہوگیا۔ آخر اس کی کیا وجہ ؟ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ اسکی وجہ محبت وعشق ہے بس معلوم ہوگیا۔ کہ خدا اور رسول کے احکام میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ عدم محبت یا قلت محبت ہی۔ اگر آپکے دل میں نور محبت روشن ہوتا۔ تو یہ سارے چوہے اور چھچھوندر خود بھاگ جاتے۔ شیخ سعدیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

تراعشق ہمچو خودے زآب وگل	وباید ہمہ صبر وآرام دل

اور جب ایک مخلوق کے عشق کا یہ اثر ہے توخالق کے عشق کا اثر کیا کچھ ہونا چاہیے،

عجب داری ازسالکان طریق دمادم شراب الم درکشند	کہ باشند در بحر معنی غریق وگر تلخ بینند دم درکشند

مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود	گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

اور میں علماء کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علماء کے عرفی اخلاقی ہی نے عوام کو خراب کیا ہی۔ کہ جہاں اُن کے سامنے کسی نے شبہات بیان کئے اور یہ ہر شبہ کے مفصل جواب کو تیار ہوگئے۔ ارے اصلی جواب یہ ہے کہ مرض کو تشخیص کرو اور جڑ کو اُکھاڑو۔ توشاخوں کو چھانٹتے ہو اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب جڑ موجود ہے۔ توچند روز میں ہزاروں نئے نئے پتے اور نکل آئیں گے محقق تشخیص کرکے اصل مرض کا علاج کرتا ہے۔ اور غیر محقق آثار کا علاج کرتا ہے میں نہایت پختگی سے دعوے کیساتھ کہتا ہوں۔ کہ جن مسلمانوں کو آجکل مذہب میں شکوک واوہام پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے اس مرض کا منشا قلت محبت مع اللہ ہے۔ ان کو اللہ ورسول کے ساتھ محبت نہیں ہے یتعلق نہیں ہی۔ اور محض برائے نام تعلق کو تعلق کہا جاتا ہے۔ اور تعلق مع اللہ کے حاصل ہونیکا واحد طریق صرف یہ ہی کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل کی جائے۔ اہل محبت کی صحبت میں یہ خاصیت ہی کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا

ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اہل غفلت کی صحبت سے غفلت جلدی پیدا ہوتی ہے۔ پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو جائیگا۔ یہ لم و کیف باطل اور وساوس و شبہات سب جاتے رہیں گے۔ میں علماء سے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم ان شبہات کے جواب میں کیوں اپنا دماغ تھکاتے ہو۔ بس تم صرف ایک کام کرو کہ ان لوگوں کو اہل اللہ کی صحبت و محبت کا پتہ دیدو (غایۃ النجاح ص۵)

(۹۱) وجود صانع کی فلسفی دلیل

فلسفی طریقہ پر وجود صانع کی دلیل یہ ہے۔ کہ تمام عالم حادث ہے۔ کیونکہ بہت سی چیزوں کا حدوث تو ہمکو مشاہد ہوتا ہے۔ اور جن کا حدوث مشاہد نہیں ہوا۔ اُن کے احوال کا تغیر و انقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ حادث ہیں۔ کیونکہ محل حادث کا حادث ہوتا ہے۔ ابھی میں نے اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر کا یعنی ماہر سائینس کا قول پڑھا ہے۔ کہ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت کمی آگئی ہے۔ اور عنقریب اس کی روشنی زائل ہو کر یہ چراغ گل ہو جائیگا۔ اور اس وقت دنیا میں اسقدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال ہے۔ تمام عالم فنا ہو جائیگا (ہمنو اس خبر سے خوش ہوئے۔ کہ اہلِ سائینس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہوا تھا۔ تو اب آلات رصد سے یقین آنے لگا) غرض اشیاء عالم کا تغیر و انقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب حادث ہیں۔ قدیم نہیں یعنی ان کا وجود دائمی اور ضروری نہیں۔ اور حادث کیلئے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کے لئے کسی مرجح کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ممکن وہ ہے جس کا وجود و عدم مساوی ہو۔ یعنی نہ اُسکے لئے موجود ہونا ضروری ہے۔ نہ معدوم ہونا ضروری ہے۔ اور جس کا وجود عدم و وجود برابر ہو تو اس کے وجود کیلئے کوئی مرجح ہونا چاہیئے۔ ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور ترجح بلا مرجح باطل ہے۔ پھر اس مرجح میں گفتگو کی جائیگی کہ وہ ممکن ہے۔ یا کچھ اور ہے۔ اور اگر مرجح ممکن ہو۔ تو اس کیلئے دوسرے مرجح کی ضرورت ہوگی۔ اور چونکہ تسلسل محال ہے اس لئے کہیں نہ کہیں

سلسلہ ختم کرنا پڑیگا۔ اور یہ ماننا پڑیگا کہ مرجح ایسی ذات ہی۔ جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے۔ اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خلاق عالم کہتے ہیں۔ اس پر ایک سوال یہ ہوگا۔ کہ صانع کے ماننے کے بعد بھی تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے۔ کیونکہ صانع نے تمام مخلوقات کو ایک دم سے پیدا نہیں کیا۔ اور ایک حال میں پیدا نہیں کیا۔ بلکہ کسی کو آج پیدا کیا۔ کسی کو آج سے ہزار برس سو برس پہلے پیدا کیا۔ اور کسی کو بعد میں پیدا کریگا۔ اور کسی کو حسین بنایا۔ کسی کو بدشکل۔ کسی کو مرد کسی کو عورت۔ کسی کو امیر کسی کو غریب۔ کسی کو عاقل۔ کسی کو احمق تو یہاں مرجح کون ہے زید کو آج کیوں پیدا کیا۔ کل کیوں نہیں کیا تھا۔ اور اس کو امیر کیوں بنایا۔ عمرو کی طرح غریب کیوں نہ بنایا۔ زید کو عمرو پر کیا ترجیح تھی۔ مثلاً اس سوال کا جواب حکمائے اسلام کے سوا کوئی نہیں دے سکا۔ فلاسفہ کی عقلیں یہاں آکر چکر کھانے لگیں حکمائے اسلام نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ان امور میں ارادۂ واجب مرجح ہے۔ اور ارادہ کی خاصیت یہ ہے۔ کہ وہ اپنی ذات سے مرجح ہے۔ اس کیلئے کسی دوسرے مرجح کی ضرورت نہیں۔ (اس پر حکمائے یونان کی طرف سے اُن کے معتقدوں نے یہ اشکال وارد کیا ہو کہ بیشک یہ تو ہمنے مان لیا۔ کہ ارادہ کیلئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنی ذات سے مرجح ہے مگر یقیناً خدا تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے۔ پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم اور مراد حادث ہو۔ اس صورت میں تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے۔ اور یہ محال ہی۔ اس کا جواب حکمائے اسلام نے ایسا دیا ہے۔ کہ حکمائے یونان کے دانت کھٹے ہوگئے۔ فرمایا کہ صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں۔ مگر ان کا تعلق ممکنات کیساتھ حادث ہی اور تخلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد محال ہے۔ اس سے پہلے محال نہیں۔ پس ہم یہ کہیں گے۔ کہ ارادہ کا تعلق مختلف طور سے ہوتا ہی۔ اس لئے مراد کا وجود بھی مختلف ازمنہ اور مختلف حالات کے ساتھ ہوتا ہے) یہ عقلی دلیل ہے وجود صانع کی۔

(غایۃ النجاح صفحہ ۲)

(۹۲) عہد میثاق پر اس شبہ کا جواب کہ ہمکو تو یاد نہیں کہ یہہ عہد کب اور کس طرح لیا گیا تھا جب یاد نہیں تو پھر اس سے فائدہ ہی کیا ہوا

اس کا جواب یہ ہی کہ آپ کو اس عہد کی کیفیت بیشک یاد نہیں رہی۔ لیکن اس کا مقصود سب کو یاد رہے۔ اور مطلوب مقصود ہی کا یاد ہونا ہے۔ کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا مقصود نہیں۔ دیکھو جن لوگوں نے کبھی فارسی پڑھی ہی۔ اُن کو یہہ محفوظ ہے۔ کہ آمدن کے معنی آنا ہیں۔ کیونکہ آمدنی کا سبق آجکل ہر شخص کو یاد ہی لیکن آپ اُن سے یہ پوچھیں کہ آمدن کے معنے آپ کو کس دن اور کس جگہ پڑھائے گئے۔ اور آمد نامہ آپ نے کون سے اُستاد سے پڑھا ہے۔ تو ان سوالات کا جواب شاید ہزار میں ایک ہی آدمی دے سکیگا۔ کیونکہ یہ باتیں کسی کو محفوظ نہیں رہتیں۔ تو کیا اُن کے یاد نہ رہنے سے یہ کہا جائیگا کہ آمدن نامہ پڑھنا فضول اور بیکار کیا۔ ہر گز نہیں۔ بلکہ ہر شخص یہ کہے گا۔ کہ آمد نامہ پڑھنے سے مقصود صرف یہ تھا۔ کہ اس کا مضمون یاد رہے۔ کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا مقصود نہ تھا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ میثاق الست سے مقصود یہ تھا۔ کہ وجود صانع اور توحید صانع کا مضمون طبائع میں مرکوز ہو جائے۔ کیفیت تعلیم کا محفوظ ہونا مقصود نہ تھا۔ سو بحمد اللہ وجود اور توحید صانع فطرۃً ہر شخص کے دلمیں مرکوز ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ مصنوعات کو دیکھکر ایک جاہل بدوی بھی صانع کے وجود میں استدلال کرتا ہے۔ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آمد نامہ کی جو تمنے مثال دی ہی۔ تو وہاں ہزار میں ایک آدمی تو ایسا نکلتا ہے جسکو کیفیت تعلیم بھی یاد ہوتی ہے۔ چنانچہ بعضے قوی الحافظہ اب بھی تبلا سکتے ہیں کہ ہم نے آمد نامہ کس سے پڑھا تھا۔ اور کس مکان میں پڑھا تھا۔ مگر میثاق الست کی کیفیت یاد رکھنے والا تو کوئی ہزار میں بھی ایک نہیں ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے

کہ آپ سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ یہاں بھی بعضے قوی الحافظہ ایسے موجود ہیں۔ جنکو اس عہد کی کیفیت ابتک یاد ہے۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ اس طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں ؎

الست از ازل ہمچناں شاں بگوش	بفریاد قالوا بلیٰ در خروش

اس میں تو اجمالاً بتلایا گیا ہے۔ کہ اُس عہد کے یاد رکھنے والے اب بھی موجود ہیں۔ اور بعض بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ کہ ہمکو یاد ہے کہ اُس وقت ہماری دائیں طرف فلاں اور بائیں طرف فلاں تھا۔ اور انہیں بزرگ کے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ اُس وقت ارواح صف بستہ نہ تھیں بلکہ یوں ہی گڈ مڈ جمع تھیں۔ جیسے میلہ میں اجتماع ہوا کرتا ہے پھر اس وقت جو لوگ باہم رو در رو ہو گئے۔ ان میں تو طرفین سے محبت ہوتی ہے اور جو لوگ رو در پشت ہوئے۔ کہ ایک کا منہ دوسرے کی پشت کی طرف تھا۔ ان میں ایک طرف سے محبت اور ایک طرف سے اعراض ہوتا ہے۔ اور جو پشت در پشت ہوئے ان میں طرفین سے انقباض و اعراض ہوتا ہے۔ اور ان بزرگ کے مذاق پر اس حدیث کا یہی محمل ہے۔ الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف۔ ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے۔ کہ جس وقت ازل میں میثاق لیا گیا۔ تو سب ارواح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا منہ تکنے لگیں کہ جو آپ کہیں گے وہی سب کہیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضور اقدس (سردار دو عالم فداہ آبائنا و امہاتنا) کی زبان مبارک سے بلیٰ نکلا۔ تو آپ کے بعد سب نے بلیٰ کہا (صلے اللہ تعالیٰ علیہ و علےٰ آلہ و اصحابہ کما یحب و یرضی) تو حضرت آپ سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو جنت اور دوزخ کی پیمایش تک کر آئے ہیں۔ کہ جنت کتنی بڑی ہے۔ اس کے کتنے درجے ہیں۔ اسی طرح دوزخ کی تفصیلی سیر کی۔ اور اسکی پیمایش بھی کر لی۔ اور یہ سیر روحانی طریقہ پر تھی۔

(غایۃ النجاح ص۱)

(۹۳) مال تدبیر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تقدیر سے حاصل ہوتا ہے

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوا ہے۔ جیسا کہ قارون نے کہا تھا۔ قال انما اوتیتہ علی علم عندی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کس نے کیا۔ کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں۔ مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا۔ دو طالب علم بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلبہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ان دونوں میں سے زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوگا۔ مگر نتیجہ امتحان میں اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیل ہو جاتا۔ اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہو جاتا ہے۔ بتلایئے عمرو کی تدبیر کو کس نے راست کیا۔ اور زید کو کس نے ناکام کیا۔ اگر تدبیر پر ہی مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیئے تھا۔ مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے۔ اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے۔ دوسرا بیوقوف جاہل ہے۔ تدبیر کا مقتضا یہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف سے زیادہ چلتی۔ مگر مشاہدہ بارہا اس کیخلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی۔ اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ غور کرینگے تو زراعت اور ملازمت وغیرہ تمام اُمور میں ایسی صدہا نظائر دیکھیں گے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر کافی نہیں۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوائے خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں۔ ورنہ اپنی تدابیر کا راست ہونا۔ کون نہیں چاہتا پھر سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہوا کرتے۔ ناکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں بیس تیس کامیاب ہوتے ہیں۔ اور زیادہ ناکام ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں۔ تو یہ محض انکی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا چاہیئے کہ تدبیر تو وہ لوگ بھی کر رہے تھے جو ناکام ہوئے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے۔ اور ہم کامیاب ہو گئے۔ یہ سب گفتگو ان لوگوں

کیواسطے ہے۔ جو سائنس کے معتقد ہیں۔ ورنہ مسلمان تو سب کے سب یہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ محض تدبیر مؤثر نہیں۔ بلکہ تدبیر کے راست ہونیکے لئے تقدیر کی موافقت بھی شرط ہے۔ اور تقدیر مشیت الٰہیہ ہی کا نام ہے۔ اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہمنے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں۔ جن کی پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ۔ کہ جس ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے۔ اس میں ایک سال کیوں لگا۔ اگر تمہارے قبضہ میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں یہ ایجاد کرلی ہوتی۔ اور یہی ایک کیا۔ بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو۔ ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک منٹ میں ایجاد کرلیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے قبضہ میں ہیں۔ پھر دیر کی کیا وجہ۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضہ میں نہیں۔ کہ جب چاہے جو کچھ چاہے۔ ایجاد کرلے۔ مگر زمانہ دراز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے۔ اب تبلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آئی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آئی ہے۔ یا بلا اختیار خود بخود دل میں آگئی اگر کہو اختیار سے سمجھ میں آئی۔ تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا۔ اسوقت کیوں نہ سمجھ لیا۔ یقیناً کہوگے کہ دفعتہً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے۔ بس یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے۔ کیونکہ انکی عادت ہی۔ کہ جب انسان کسی کام کیلئے کوشش کرتا ہے۔ اور اپنی سی کوشش صرف کردیتا ہے تو وہ امداد فرماتے ہیں۔ بہرحال یہ کسی کا منہ نہیں۔ کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمرہ سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و لاچار ہوکر ماننا پڑے گا۔ کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے دوسرے کا دیا ہوا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کا اب فرمائیے۔ اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں تھوڑا سا صرف کردیں۔ اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں۔ یقیناً مفت ملی۔

(مظاہر الاموال صـ۱۴)

(۹۴) اسلام نے سادگی سکھلائی ہے

غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تمکو کچھ ضرورت نہیں۔ بلکہ اُسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہمکو سکھلایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی۔ کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا۔ اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھ لیں۔ اگر اُن کا وہی حلیہ ہوا جو اس کتاب میں ہے۔ تو ہم بدون لڑائی کے قلعہ کھولدیں گے۔ ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین یہاں تشریف لے آئیں۔ شاید یہ قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہوجائے۔ امیر المؤمنینؓ نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا۔ اب غور فرمایئے کہ یہ ایک شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسریٰ و ہرقل بھی تھراتے تھے مگر حالت یہ تھی کہ جس قمیص میں آپنے سفر کیا ہے۔ اس میں چندر چند پیوند تھے۔ اور سواری کیلئے صرف ایک اونٹ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام۔ آجکل ادنی سے ادنی ڈپٹی کے دورے پر بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفۂ اعظم کے دورے میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آجکل ادنیٰ حاکم کے دورے میں رعایا پریشان ہوجاتی ہے۔ کیونکہ رعایا کو اُن کے دورہ کیلئے رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں ستو اور ایک تھیلے میں چھوارے بندھے ہوئے تھے۔ منزل پر اُتر کر ستو گھول کر پی لیا اور چھوارے کھالئے۔ نہ رعایا سے مرغ لئے نہ انڈے۔ نہ دودھ لیا نہ گھی۔ جب اس شان سے کبھی سوار اور کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ آپنے ممانعت کردی۔ خاص خاص حضرات نے آپکا استقبال کیا۔ اُس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں۔ اور وہ لوگ آپ کو دیکھینگے

اسلئے مناسب ہے۔ کہ آپ اپنا یہ قمیص اُتار کر دوسرا قمیص عمدہ سا پہن لیجئے۔ اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ تاکہ اُن کی نظر میں عزت ہو۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے۔ ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے۔ مگر صحابہ کے اصرار سے اُن کا دل خوش کرنے کیلئے درخواست منظور کرلی۔ چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ دو چار ہی قدم چلے تھے۔ کہ فوراً گھوڑے سے اُتر پڑے۔ اور فرمایا۔ میرے دوستو تم نے اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا۔ واللہ میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے۔ تم میرا وہی پیوند لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ۔ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا۔ اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑتا ہے۔ تو کیا ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑے گا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں اور ہمکو کس چیز نے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس مضر نہیں۔ اور یہ جو حضرت عمر نے فرمایا تھا نحن قوم الخ۔ واقعی بات یہی ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں۔ ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی ہے

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است		بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئی زیبا را

خوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی حاجت نہیں۔ وہ تو ہر لباس میں حسین ہے۔ بناوٹ کی احتیاج اس کو ہے۔ جس کو قدرتی حسن نصیب نہو۔ چنانچہ حضرت عمر اپنا وہی لباس پہنکر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی لباس اور اسی سواری پر آپ کو دیکھ کر نصاری نے قلعہ کا دروازہ کھولدیا۔ کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے۔ اور نصاری کو اطلاع ہوئی کہ خلیفۂ اسلام تشریف لے آئے تو اُن کا بڑا پادری فصیل پر آیا۔ اور کتاب کھول کر حضرت عمر کے حلیہ کو ان اوصاف سے ملانے لگا۔ جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ کہ حضرت عمر ایسے لباس

اور ایسی سواری پر تشریف لائینگے۔ اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی۔

ع کہ آب چشمۂ حیوان درون تاریکی ست

اگر آپ قیمتی لباس میں آتے تو پیشین گوئی پوری نہوتی۔ چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کیموافق دیکھ لئے۔ تو وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ اور کہا جلدی سے قلعہ کھولدو (بخدا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب توراۃ میں حدید ہے) یہی فاتح بیت المقدس ہے۔ تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدون جنگ وجدال کے بیت المقدس کو فتح کردیا۔ تو صاحبو! ہمیں تکلف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ ہماری عزت تو سادگی ہی میں ہے۔ حضرت مولٰنا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی اسی زمانہ میں ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ سے لفٹنٹ گورنر نے ملنے کی اجازت چاہی یہاں سے اجازت ہوگئی۔ اُس وقت تو آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لفٹنٹ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اسکی حاجت نہیں۔ وہ چوبی کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چونکہ لفٹنٹ گورنر اس وقت مہمان ہو کر آرہے تھے اور مہمان کی مدارات اس کے مذاق کیموافق ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خیال ہوا۔ مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے۔ وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا۔ بلکہ آپ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ لفٹنٹ گورنر کس دن آئیں گے۔ چنانچہ جب دن آیا اور لفٹنٹ گورنر حضرت کی خانقاہ میں پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا ظلم کبھی نہ کرنا۔ پھر اُس نے درخواست کی کہ ہمکو کچھ تبرک عطا فرمایا جاوے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے۔ پھر خادم سے فرمایا کہ ارے دیکھنا مٹھائی کی ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دیدو۔ یہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ ہنڈیا میں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دیدیا گیا۔ جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا۔ اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔ تو دیکھئے مولٰنا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہوا بھی تھا۔ مگر آخر میں یہ سب منصوبے

مٹ گئے ۔ اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی ۔ اور اُسی میں اُن کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی

۷	نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی	بگڑنے میں بھی زلف اُنکی بنا کی	

غرض ہمکو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیئے ۔ اگر کسی مہمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے ۔ مبالغہ نہ کیا جائے اسی میں ہماری عزت ہے ۔ مگر آجکل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں ان کا لباس اور ان کا طرز معاشرت اُن کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی عزت نہیں ایک بار میں بریلی میں تھا ۔ بھائی سے ایجینٹ نے کہا ۔ کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا چاہتے ہیں ۔ بھائی نے مجھ سے پوچھا ۔ میں نے کہا ۔ ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے ۔ لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں ۔ تو اعراض کرنا بُرا ہے ۔ آخر وہ حاکم ہیں ۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے ۔ میں چلوں گا ۔ بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا ۔ میں نے کہا ہرگز نہیں ۔ جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں ۔ اسی میں جاؤنگا چنانچہ میں اچکن اور کرتہ میں اُن سے ملنے گیا ۔ وہ شاید غسل کر رہے تھے ۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے ۔ عصر کی نماز کا وقت آگیا ۔ اور میں نے اور بھائی نے اُن کے بنگلہ ہی میں نماز پڑھی ۔ پھر وہ آکر ملے ۔ اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بٹھلایا ۔ اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے ۔ میں نے اصرار بھی کیا ۔ مگر نہیں مانے ۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں اور تھوڑی دیر میں رخصت ہو کر آگئے ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انگریزی لباس میں ملتا ۔ تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی ۔ جو اسلامی لباس میں ہوئی کلکتہ میں مولوی عبدالجبار صاحب وائسرائے سے عبا اور چوغہ پہنکر اور عمامہ باندھ کر ملے ۔ دوسرے رؤسا انگریزی لباس میں گئے تھے ۔ تو وائسرائے نے اُن سے کہا ۔ کہ مولوی صاحب آپ اس لباس میں شاہزادے معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ لباس بڑی راحت کا ہے اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے ۔ مگر ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں ۔ ہمکو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے ۔ غرض ہمکو شریعت نے

جو تعلیم دی ہی۔ اس پر چلنا چاہیے۔ (مظاہر الاموال ص۲۲)

(۹۵) علماء پر اس اعتراض کا جواب کہ یہ مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے سے روکتے ہیں اور مسلمانوں کی ترقی سے مانع ہیں۔

مجھے اس وقت اس سے تو بحث نہیں۔ کہ مسلمانوں کی ترقی انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے یا نہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اس پر موقوف ہی۔ اور بدون اس کے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے۔ یا غلط۔ سو پوچھتا ہوں۔ کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں۔ یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ اب تلائیے کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں۔ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنے سے۔ غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے سے۔ مسلمان انگریزی علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھتے۔ تو اُن کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا۔ صرف اسی ایک بات میں کیوں اثر ہوا۔ اصل بات یہ ہی۔ کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں۔ کہ اُن سے محنت نہیں ہوتی یا افلاس کی وجہ سے کہ اُن کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کیلئے رقم نہیں۔ علماء کے منع کرنے سے کوئی نہیں رُکتا (الا ماشاء اللہ وھو نادر والنادر کالمعدوم) مگر آجکل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے۔ جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہی۔ گو حکایت تو فحش ہے۔ مگر مولانا نے اس سے بھی زیادہ فحش حکایتیں مثنوی میں لکھی ہیں اور اُن سے علوم نکالے ہیں۔ اسلئے بیان کرتا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں ٹھیرا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے کیلئے جنس دی۔ بھٹیاریاں اکثر جنس چرایا کرتی ہیں۔ اس لئے سپاہی اُسکے پاس مسلط ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بچا کر کچھ چراؤں۔ مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا۔ اب اُس نے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو سامنے

اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا۔ کہ تو بھی کھالے۔ شریف آدمی کو دستر خوان پر سے کسی کو اُٹھانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے سپاہی خاموش ہوگیا۔ اتفاق سے بھٹیاری کی ریح زور سے صادر ہوئی۔ اُس نے خفت اُتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھپ لگایا۔ کہ دور موئے کھانا کھاتے ہوئے یہ کیا کرتا ہے۔ سپاہی کو انتقام کا موقع ملا۔ اُس نے قصداً ریح صادر کی۔ اور زور سے ایک چپت لڑکے کو رسید کیا۔ اور کہا یاد رکھ کریگا کوئی۔ مگر پیٹے گا تو ہی۔ اس سے بھٹیاری کو بھی بتلا دیا۔ کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں۔ بس یہی حال آجکل کے مسلمانوں نے علمار کا کر رکھا ہے۔ کہ کرے کوئی مگر الزام ان ہی پر ہوگا۔ انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر اور مسلمانوں کے تنزل وافلاس کا الزام بھی علمار پر اور جاہلوں اور مرتد ہونیکا الزام بھی ان ہی پر۔ مسلمانوں کی نا اتفاقی کا الزام بھی اُن ہی پر (اصلاح ذات البین ص۱۶)

(۹۶) اس اعتراض کا جواب کہ شریعت قید محض ہے

ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں۔ ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ مقید ہیں۔ اور ہم آزاد ہیں۔ ایک صاحب کانپور میں کوٹ پتلون۔ بوٹ سوٹ سے کسے کسائے میرے پاس آئے وہ بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی پر وہ سہولت سے بیٹھ جاتے۔ لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں۔ ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فخر ہے۔ اب وہ کھڑے ہیں۔ لیکن کھڑے کھڑے بات کیسے کریں ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی۔ چھڑی پر سہارا دیکر اور ٹانگ لگا کر بھد سے گر پڑے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بتلایئے۔ کہ تہذیب ہے۔ یا تعذیب یہ آزادی ہے۔ یا قید ہے۔ بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی۔ اور اُٹھنا اور بھی زیادہ مصیبت ہوا۔ اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے۔ اور لیجئے اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجاوے تو ہم تو دانے بھی چبا سکتے ہیں۔ اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ اور اُن کے لئے میز کرسی ہو۔ کانٹا ہو۔ چھُری ہو۔ جب یہ کھانا تناول فرمائیں

کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہی کہ پاجامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے۔ اچکن نہ ہو کرتہ کافی ہے۔ عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی۔ پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو۔ پھر حدود شرعیہ کی کوئی قید نہیں۔ اگر وہ بھی نہ ہو تو ننگے سر رہیں گے۔ اور پھر اچکن اگر بانات کا ہو تو اس کی قید نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو۔ لٹھ کا ہو۔ گاڑھے کا ہو گزی کا ہو۔ کسی شے کا ہو۔ نہ ہو۔ لنگی بھی کفایت کرتی ہے۔ ان کو یہ مصیبت ہے۔ کہ اگر پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو۔ تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو۔ قمیص بھی اُس کے مناسب ہو۔ ورنہ فیشن کے خلاف ہے۔ کیوں صاحبو! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے۔ میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول سے آزاد ہیں۔ باقی نہ کھانے میں آزاد نہ پینے میں آزاد۔ نہ پہننے میں آزاد ہر بات میں مقید ہیں۔ اگر آزاد ہیں۔ تو خدا اور رسول سے آزاد ہیں تو خاک پڑے ایسی آزادی پر۔ اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی۔ اور مبارک رہے ہمکو یہ قید۔ اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو یہ حالت ہی ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند		شکارش نجوید خلاص از کمند	

اور یہ وہ قید ہے

گر دو صد زنجیر آری بگلم		غیر زلف آن نگار مقبلم	

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد محبوب کسی کو ملا ہو اور وہ اپنے لطف وکرم سے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھلائے اور اس کو نچھوڑے۔ تو اس عاشق کی اُس وقت کیا حالت ہوگی اس کی تو غیبت میں یہ حالت تھی۔ کہ کہا کرتا تھا ؎

اگرچہ دور اُفتادم بدیں اُمید خرسندم		کہ شاید دوست من بار دگر جاناں گیرد	

بھلا اب کیا حال ہوگا۔ بلکہ اگر وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں۔ تو وہ عاشق یہ کہیگا۔ کہ میرا ہاتھ کیا۔ جان بھی نہ چھوڑو۔ اور کہیگا ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت		سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

بس جنکو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہی کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھیں گے۔ ہر گز نہیں جس کو کسی سے محبت ہوئی ہوگی وہی اس کا لطف جانتا ہے۔ ہاں جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے۔ نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے۔ ورنہ اگر مذاق ہے۔ تو خدا جانتا ہے۔ کہ ساری قیدیں آسان ہیں۔ وہ چولھے میں ڈالیگا۔ ان قیدوں سے آزاد ہونیکو۔ اور بھاڑ میں ڈالیگا۔ ایسی عقل کو اور سر پر رکھ لیگا۔ دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

	ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم		مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم	

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو۔ ناداری ہو۔ بیماری ہو۔ افلاس ہو۔ اس کو سب گوارا ہیں۔ اور اوّل تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے۔ سکون ہے اطمینان ہے۔ اسکی زندگی لطف کی زندگی ہے۔ خواہ کسی حالت میں ہو۔ حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔ من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ فلنحیینہ حیوۃ طیبہ۔ یعنی جو شخص نیک عمل کرے۔ مرد ہو یا عورت اسکو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں۔ اُن کی ہر وقت تسلّی کی جاتی ہے۔ اُن کے قلب میں سکون اور چین کا افاضہ ہوتا رہتا ہے۔ اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے ؎

	سوئے نومیدی مرد کامید ہاست		سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست	

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں اور ایسی قید کے مقابلہ میں جو آزادی ہے۔ وہ نری مہمل ہے۔ اور سراسر خسران ہے۔ حرمان ہے۔ اور یہ آزادی، بس خدا اور رسول سے آزادی ہے۔ ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔

(الاتفاق صفحہ ۳۱)

(۹۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی پر شبہات کا جواب

ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں۔ کچھ نقلی۔ عقلی دلائل تو یہ ہیں۔ کہ اس سے افلاک میں خرق و التیام لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق و التیام کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں۔ اور جب وہ دلائل پیش کرینگے اُس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا لغو و باطل ہونا ظاہر کر دینگے۔ چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے۔ کہ آپ اتنی جلدی سیر سمٰوات سے فارغ ہو کر واپس آ گئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی۔ یہ محالات سے ہے۔ کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں۔ اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے۔ ہاں استبعاد ہو سکتا ہے سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے۔ چنانچہ رات دن کا آنا۔ طلوع و غروب کا ہونا۔ یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے۔ اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہو گا۔ وہی رہے گا۔ اگر رات موجود ہوگی رات ہی رہے گی۔ دن موجود ہو گا۔ دن ہی رہیگا۔ تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کیلئے موقوف کر دیا ہو۔ اور اس میں کچھ تعجب نہیں۔ معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنیکے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے۔ کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے۔ تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔ ہم جب حیدرآباد گئے۔ تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں۔ اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور کی عظمت ظاہر کرنے کیلئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اُس رات کچھ دیر کیلئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے

وہیں رہے۔ پس آفتاب جس جگہ تھا۔ اُسی جگہ رہا۔ اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اسمیں کیا استبعاد ہے۔ جب حضور معراج سے فارغ ہو گئے۔ پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی۔ تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی۔ وہیں سے شروع ہو گئی۔ تو آپ کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو۔ مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا۔ کیونکہ حرکت زمانہ اُس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت فلک کا دعویٰ کرے۔ تو وہ اس کے لزوم کو ثابت کرے۔ انشاء اللہ ایک بھی دلیل قائم نہ کر سکیگا۔ دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے

تنِ او کہ صافی تر از جانِ ماست ... اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذراسی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ اُسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائیگا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے۔ وہ مادیات کی طرح کثیف نہیں۔ اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب و مانع نہیں ہوتا۔ تو مولٰنا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذراسی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذراسی دیر میں ہو آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونیکے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو آپ اس میں سے اگر گذر رہے تو زندہ کیسے رہتے۔ مگر اُنھوں نے یہ نہ دیکھا۔ کہ بعد تسلیم اس التزام کے یہ اُس وقت ہے جب متنفس کو اس میں کچھ مکث بھی ہو۔ چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ نہایت سرعت کیساتھ اس خلا میں سے گذر جائیں۔ تو وہ عدم تنفس میں موثر

نہ ہوگا۔ اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا قول ہے۔ واللہ ما فقد جسد محمد صلے اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ الاسراء کہ بخدا شب معراج میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہی۔ کہ حضرت عائشہ اس وقت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھیں (نیز اُس وقت اُن کی عمر بہت ہی کم تھی۔ شاید چار پانچ سال کی ہوں۔ اور اگر معراج ۵ھ نبوی میں ہوئی ہو جیسا کہ زہری کا قول ہے تو وہ اس سال پیدا ہوئی ہونگی) اس لئے اجلہ صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔ مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ نے بے تحقیق ایک بات فرمادی۔ ہم حضرت صدیقہ پر یہ گمان نہیں کرینگے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہوسکتی ہے۔ یہ مانا کہ وہ اس وقت حضور کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کمسن بھی تھیں۔ مگر جو بات وہ فرمارہی ہیں وہ تو عقل وبلوغ کے زمانہ میں اُن سے صادر ہوئی ہے۔ اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں۔ یقیناً تحقیق کے بعد فرمارہی ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرمارہی ہوں۔ کیونکہ معراج میں تعدد ہی۔ تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں۔ میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے۔ وہ بہت لطیف ہی وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں۔ ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہوجانا ہٹ جانا دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ قالوا واقبلوا علیھم ماذا تفقدون یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہوکر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنی طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اتنی دیر گھر سے غائب نہیں رہے۔ کہ آپ کی تلاش کی جاتی۔ یہ مطلب نہیں۔ کہ آپ ساری رات میں اپنے گھر سے جُدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے معراج منامی

یا کشفی پر استدلال کیا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ آپ گھر سے جُدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو۔ اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ (الرفع والوضع صہ ۳۴)

عہ اور اگر فقدان کے وہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم شب معراج میں گم نہیں ہوا۔ تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مطلب نہیں کہ حضور اپنے گھر سے اس رات جُدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم اسکے معنی غیبت و انفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کیلئے اس کا فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا۔ اور یہ روایت درست ہے۔ کیونکہ آپ سب گھر والوں کیساتھ گھر میں سوئے تھے۔ اور معراج ایسے وقت ہوئی۔ جو کہ عادۃً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کیوقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے۔ بلکہ خود آکر گھر والوں کو صبح کی نماز کیلئے جگایا۔ تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور کو گھر میں نہ دیکھا ہو۔ اور اتنی بات مفقود ہونے کیلئے ضروری ہے قلت ولعل هذا هو مراد الشیخ نعیرہ بالتفتیش والا فالفقدان غیرا لتفقد نعم هو لیستدعی فاقدا لما لا یخفی۔ جامع) احقر اشرفعلی کے ذہن میں دوسرا حاشیہ دیکھ کر یہ تاویل آگئی تھی۔ اب اس تاویل کی اس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ فقدان کے معنی تو گم ہی کرنے کے ہیں۔ مگر اس کے دو درجے ہیں۔ ایک مطلق کرنا اور ایک ایسا گم کرنا۔ جس کے بعد اسکی تلاش میں لگ جائے۔ پس پہلا درجہ فقد مطلق ہوا۔ اور دوسرا درجہ فقد مقید۔ پس اس حدیث میں دوسرا درجہ مراد ہے۔ یعنی آپ کا جسد ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آئی ہو۔ کیونکہ زمانہ فقد کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقد کی اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ پس متن میں میری عبارت میں مہٹ جانے کو پہلے درجہ پر اور تلاش کرنے کو دوسرے درجہ پر محمول کیا جاوے۔ تو اب معنی لغوی کے خلاف نہیں ہوا۔ اور بنا بر قواعد تصوف یہ بھی ممکن ہے۔ کہ جسم عنصری ملکوت میں پہنچا ہو۔ اور جسم مثالی ناسوت میں رہا ہو۔ اسکے دیکھتے ہوئے کسی نے اُس کو جسم عنصری سمجھ کر ما فقد کا حکم (بقیہ بر صفحہ آیندہ)

(۹۷) تبلیغ کیلئے چندہ جمع کرنے کا کام علماء کے سپرد نہیں کرنا چاہئے

میں کہتا ہوں کہ علماء۔ یہ کام ہرگز نہ کریں۔ بلکہ رؤسا و عوام خود چندہ کریں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۸) کر دیا ہو اور موٹی بات ہو کہ اگر معراج جسم عنصری سے نہو تی تو اتنا انکار اس پر نہوتا اور اگر غلط فہمی سے ہوتا۔ تو آپ بھی جواب دیدیتے کہ ہیں جسد عنصری سے دعویٰ نہیں کرتا۔ کہ اس پر اس قدر استبعاد کیا جاوے۔ احقر ظفر احمد عرض کرتا ہو۔ کہ بعد میں تفسیر تنویر المقباس میں جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ ماذا تفقدون اور تفقد کی تفسیر ماذا تطلبون اور تطلب کیساتھ میری نظر سے گذری اور یہ تفسیر بالکل اس معنی کے مطابق ہو۔ جو حضرت حکیم الامت نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں۔ کیونکہ طلب کے معنی تلاش کرنیکے اور ڈھونڈنے ہی کے ہیں اور بظاہر ابن عباس کی یہ تفسیر باللازم ہے۔ کیونکہ فقدان اکثر طلب کو مستلزم ہوتا ہے۔ لہذا ملزوم کی تفسیر لازم سے فرمادی۔ لیکن اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ گاہے فقدان سے طلب و تفتیش بھی مراد ہوا کرتی ہو۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں بھی اس معنی کا احتمال ہو۔ جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا ہو واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور ہر چند کہ تفسیر تنویر المقباس اکثر محدثین کے نزدیک معتبر نہیں کیونکہ اس کے راوی کلبی اور انکے شاگرد محمد بن مروان صغیر مجروح ہیں مگر سیوطی نے اتقان میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہو لکن قال ابن عدی فی الکامل للکلبی احادیث صالحة وخاصة عن ابی صالح وھو معروف بالتفسیر ولیس لاحد تفسیر اطول منه ولا اشبع منه۔ ج ۲ جس سے فی الجملہ اسکی تقویت ہوتی ہو دوسرے یہ مسئلہ کوئی احکام کی تقبیل سے نہیں جسمیں راوی کا مجروح ہونا مضر ہو بلکہ ازقبیل نقل لغت ہو جسمیں بہت وسعت ہو۔ فافهم واللہ اعلم وانما اطلنا الکلام فی ھذا المقام لیظھر لك نعمة اللہ علی جماعتنا ولا الحمد انها لا تقبل اقوال اکابرها فی تفسیر معانی القرآن الا بعد ظهور مطابقتها لاقوال السلف وان اکابرها لا یتکلمون لا برادا لاعتراض علیهما اذا کان بالادب لاجل الطلب ولیظهر لك حسن ذوق حضرت حکیم الامة فی التفسیر بحیث لا یخطی عن الصواب ولو قال شیئا بغیر مطالعة کتاب۔

اور مولویوں سے دین کا کام لیں۔ مگر آجکل تو علماء کی مثال ڈوم کے ہاتھی جیسی ہو رہی ہے۔ کہ اکبر نے ایک ڈوم کو انعام میں ہاتھی دیدیا تھا۔ وہ بڑا گھبرایا کہ میں اس کا خرچ کہاں سے لاؤنگا۔ آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے دیکھا کہ شاہی ہاتھی گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے۔ پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ ڈوم کو بلایا گیا کہ تم نے اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول کیوں ڈالا ہے۔ کہا حضور! آپ نے مجھے ہاتھی تو دیدیا اب میں اسے کھلاتا پلاتا کہاں سے۔ میں نے اس سے کہا۔ کہ بھائی میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں۔ تو بھی گلے میں ڈھول ڈال کر گا بجا کر اپنا پیٹ بھر لے۔ اکبر ہنس پڑا۔ اور ڈوم کو اُس کی امداد کیلئے بھی عطا فرمایا۔ یہی حال آجکل مولویوں کا ہے۔ کہ لوگوں نے اُن کے گلے میں ڈھول ڈالدیا ہے۔ کہ جاؤ گاؤ بجاؤ۔ اور روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو۔ یاد رکھو ایک جماعت سے دو کام نہیں ہو سکتے۔ کام کا طریقہ یہی ہے۔ کہ روپیہ تم خود جمع کرو اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو۔ بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو۔ علماء کو روپیہ دو بھی نہیں۔ کیونکہ آجکل بہت لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو واقع میں مولوی نہیں تھے۔ مگر مولویوں میں جا گھسے تھے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانتیں کی ہیں جس سے مولوی بدنام ہو گئے۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ رؤسا چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں مولویوں کو نہ دیں۔ کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے۔ تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں ہرگز نہیں۔ آپکو تو چاہیئے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں۔ تو آپ ان کو خود روکیں کہ یہ کام آپکے مناسب نہیں۔ یہ کام ہم خود کریں گے۔ بلکہ ایک صورت سب سے اچھی یہ ہے۔ کہ ایک ایک رئیس ایک ایک مبلغ کی تنخواہ اپنے ذمہ کرلے۔ اسمیں کسی جھگڑے ہی کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایک آدمی ایک مبلغ کی تنخواہ نہ دے سکے۔ تو دو چار ملکر ایک مبلغ رکھ لیں۔ اور اس کا حساب خود اپنے پاس رکھیں۔ یہ صورت تو روپے کے انتظام کی ہے۔ رہا تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ یہ علماء کی رائے سے ہونا چاہیئے۔ تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو۔ اور مبلغ بھی

اُن کی رائے سے مقرر کرو۔ پھر جس طرح وہ بتلائیں اُس کے موافق کام کرو۔ اس مشورہ کیلئے ایک کمیٹی بناؤ۔ علمار کو اس میں مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا اور میں علمار سے بھی کہتا ہوں۔ کہ وہ اس سے انکار نہ کریں۔ پھر اس طرح اللہ کا نام لیکر کام شروع کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی۔ گو اوّل اوّل معمولی دقتیں بھی پیش آئیں گی مگر دقت سے نہ گھبرائیں۔ پیادہ سفر کرنے کی تو ضرورت نہیں سواری میں سفر کریں۔ جہاں ریل ہو وہاں ریل سے پہنچیں ورنہ گاڑی بہلی سے جائیں۔ بائی فٹن اور موٹر کی ضرورت نہیں۔ نہ لیمینڈ اور برف کی ضرورت ہے مبلغوں کو ان فضولیات میں قوم کا روپیہ برباد نہ کرنا چاہیے آپ کا تو یہ رنگ ہونا چاہیے سے

اے دل آں بہ کہ خراب از مئی گلگوں باشی	بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں	شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

(العلم و الخشیۃ ص۳۱)

(۹۸) نسب نامے نہ تو محض بیکار ہیں اور نہ ہی مدار فخر ہیں

حق تعالیٰ نے مختلف خاندانوں اور قوموں کے بنانے میں یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس سے تعارف اور شناخت ہوجاتا ہے اور ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہوجاتا ہے۔ کہ یہ قریشی ہے یا انصاری ہے۔ یہ صدیقی ہے یہ فاروقی ہے۔ اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو امتیاز سخت دشوار ہوتا۔ کیونکہ ناموں میں اکثر توارد ہوتا ہے ایک ہی نام کے بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کسی قدر تو جائے سکونت سے معلوم ہوجاتا ہے۔ کہ ایک دہلوی ہے ایک لکھنوی ہے پھر ایک شہر میں بھی ایک نام کے بہت سے ہوتے ہیں تو محلوں کے نام سے امتیاز ہوجاتا ہے۔ کہ ایک محلت کا رہنے والا ہے۔ اور ایک محلہ خیل کا۔ پھر وہاں بھی ایک نام کے دو تین ہوتے ہیں تو قبائل کی طرف نسبت سے امتیاز ہوجاتا ہے۔ یہ حکمت ہے اختلاف قبائل کی مگر آجکل ہمارے بھائیوں نے اس کو مدار فخر بنالیا ہے۔ اب یہاں دو قسم کے لوگ ہوگئے۔ بعض نے تو نسب و شرف کی جڑ ہی اکھاڑ دی اُن کو اس سے شبہ ہوا کہ اس آیت میں اختلاف قبائل کی

حکمت شرف تعارف بتلائی گئی ہے اور حکمتوں سے سکوت کیا گیا ہے۔ تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس اسمیں اور کچھ حکمت نہیں ہے لان السکوت فی موضع البیان اس پر نظر کرکے بعض نے تو شرافت نسب کا انکار ہی کر دیا کہ اس سے شرف کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ جس طرح لکھنوی لکھنوی۔ ہندوستانی۔ بنگالی۔ یہ سب نسبتیں تعارف کے لئے ہیں اور ان سے کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح قریشی۔ انصاری۔ سید اور فاروقی۔ عثمانی وغیرہ یہ نسبتیں بھی شناخت کیلئے ہیں۔ ان سے بھی کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس شرف عرفی سے محروم ہیں ان میں سے بعض نے تو اپنے کو شریف ثابت کرنا چاہا ہے۔ چنانچہ ایک قوم نے اپنا عرب ہونا ثابت کیا ہے اور کہا کہ ہماری اصل راعی ہے چونکہ یہ لوگ جانور پالتے ہیں۔ اسلئے ان کو راعی کہا گیا۔ پھر غلط عوام سے لفظی تغیر ہو گیا اسی طرح بعضوں نے اپنے کو حضرت خالد بن ولید کی اولاد میں داخل کرنیکی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح وہ عرب بننا چاہتے ہیں۔ مگر اس ترکیب میں تکلف تھا۔ کیونکہ تاریخ سے تو اسکا کچھ ثبوت نہیں ملتا محض قیاسات بعیدہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے بعض نے اپنے نقص کو یوں دور کرنا چاہا۔ کہ اہل شرف ہی سے اس شرف کی نفی کر دی۔ کہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں۔ بعض نے اس نفی میں حضرت علی کے اس قول سے استدلال کیا ہے ؎

الناس من جهة التمثال اکفاء	ابوهم آدم والام حواء
ما الفخر الا لاهل العلم انهم	علی الهدی لمن استهدی ادلاء

ترجمہ۔ آدمی صورت کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں حوا علیہما السلام ہیں پس اہل علم کے سوا کسی کیلئے فخر نہیں ہے کیونکہ وہی ہدایت پر بھی ہیں اور طالب ہدایت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اس سے بعض وہ حضرات جو نسبی شرف نہیں رکھتے اور علم حاصل کر چکے ہیں اسپر استدلال کرتے ہیں۔ کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں۔ بس شرف اگر ہے تو علم سے ہے۔ کہ اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ حضرت علی کا قول ہے یا نہیں۔ پھر جس کا بھی قول ہو مطلب نفی

فخر ہے۔ کہ نسب پر فخر نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ امر غیر اختیاری ہی۔ اور اس پر فخر نہ کرنا چاہیئے۔ .... مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ حسن صورت اور سوانکھا ہونا نعمت بھی نہیں یقیناً اعلےٰ درجہ کی نعمت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ گو شرف نسب بوجہ امر غیر اختیاری ہونیکے سبب فخر نہیں۔ مگر اس کے نعمت ہونے میں شبہ نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ایک حدیث میں ہی الناس معادن کمعادن الذھب والفضة خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا۔ کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں اسی طرح آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں۔ جن میں بعض سونے کے مشابہ ہیں بعض چاندی کے بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے تھے وہی اسلام کے بعد بھی اچھے ہیں۔ جبکہ علم حاصل کریں بعض نے یہ سمجھا ہے کہ اسمیں قید اذا فقھوا اہل الشاب کو مضر ہے کہ اسمیں مدار افضل فقہ کو فرمایا۔ مگر کچھ بھی مضر نہیں کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد خیار فی الجاہلیة کو خیار فی الاسلام فرما رہے ہیں۔ تو فقہ کے بعد مساوات نہ رہی۔ بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیہ غیر صاحب نسب صاحب النسب کے برابر نہیں۔ بلکہ فقیہ صاحب نسب افضل ہوگا۔ تو کوئی تو بات ہی جس سے وہ خیار ہوئے۔ ہاں یہ ضرور ہی کہ صاحب نسب جاہل سے غیر صاحب نسب عالم افضل ہی۔ اس کا ہمکو انکار نہیں۔ مگر حدیث سے اتنی بات معلوم ہوگئی کہ شرف نسب بھی کوئی چیز ضرور ہے جس کے ساتھ علم وفقہ مل جائے تو صاحب نسب غیر صاحب نسب سے بہتر ہوگا۔ نیز حدیث میں ہی الائمة من قریش کوئی تو وجہ ہے کہ حضور نے امامت کو قریش کیساتھ مخصوص فرمایا۔ معلوم ہوا کہ اہل انساب میں شان متبوعیت دوسروں سے زیادہ ہے۔ انا النبی لا کذب + انا ابن عبد المطلب۔ جب جنگ حنین میں حضرات صحابہ کے پیر اکھڑ گئے۔ اور وہ پیچھے ہٹنے لگے۔ تو آپ نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا

اور یہ ارشاد فرمایا۔ کہ میں نبی ہوں یہ جھوٹ بات نہیں (اسلئے میرا غلبہ یقینی ہی) اور میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں یعنی میں خاندانی اور صاحب نسبہ ہوں میں ہرگز پسپا نہونگا۔ تو اس میں حضور نے اپنے صاحب نسب ہونے پر فخر کیا ہی اور دشمن کو ڈرایا ہے کہ تو اپنے مقابل کو کم نہ سمجھنا۔ وہ بڑا خاندانی ہے جس کی بہادری سب کو معلوم ہے۔ اگر شرف نسب کوئی چیز نہیں تو آپ نے انا ابن عبد المطلب کیوں فرمایا۔ نیز ایک حدیث میں ہے۔ ان اللہ اصطفےٰ من ولد ابراھیم اسمٰعیل واصطفےٰ من ولد اسمعیل بنی کنانۃ واصطفےٰ قریشاً من کنانۃ واصطفےٰ من قریش بنی ھاشم واصطفانی من بنی ھاشم رواہ مسلم والترمذی۔ یعنی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السّلام کی اولاد میں سے اسمٰعیل علیہ السّلام کو انتخاب فرمایا (اس سے عرب کی فضیلت عجم پر ثابت ہوئی۔ کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام ابو العرب ہیں اور ایک روایت میں اسکی تصریح بھی ہی۔ اختار اللہ العرب من بین الاقوام) اور اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو منتخب کیا۔ اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھکو منتخب کیا اور ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیرھم (ای الانس) ثم جعلھم فرقتین فجعلنی فی خیرھم فرقۃ (ای العرب) ثم جعلنی قبائل فجعلنی فی خیرھم قبیلۃ (ای قریش) ثم جعلھم بیوتا فجعلنی فی خیرھم بیتاً (ای بنی ہاشم) فانا خیرھم نفسا وخیرھم بیتا۔ رواہ الترمذی۔ اس نص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسب مطلق کرم سے خالی نہیں۔ گو اکرم ہونیکو مستلزم نہو۔ کیونکہ اکرمیت کا مدار تو تقویٰ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ مگر اس کرم بالنسب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے کرم کو نسب ہی میں منحصر کردیا جائے۔ جیسا کہ اہل قصبات کی عادت ہی۔ یہ دوسری جماعت ہی جس نے نسب کے بارہ میں افراط و غلو کیا ہی جیسا کہ پہلی جماعت نے تفریط کی تھی۔ اہل قصبات نے فخر بالانساب ہی پر قناعت کرلی ہے۔ (الکرمیت بالاعملیت والاعملیت ص۵ تا ۹ ملخصاً)

(۱۰۰) نماز کی برکتیں۔ اور اس کے نہ پڑھنے پر ترہیب۔

اسوقت واقعی طور پر ان کو حی علی الفلاح کا ادراک ہوتا ہی۔ کہ نماز عجیب راحت کی چیز ہے۔ یہ تو نماز میں فلاح عاجل باطنی ہی اور اس کے علاوہ نماز میں ظاہری فلاح عاجل بھی بہت کچھ ہے۔ چنانچہ نماز میں ایک نفع یہ ہی۔ کہ اگر کوئی آپکو فضول مخالطت فضول مظالمت سے ایذا دینا چاہے۔ تو نماز شروع کردو جب تک نماز پڑھتے رہوگے کوئی تمہیں کچھ نہ کہیگا۔ دوسرے اگر تم کسی آنے والے کی تعظیم نہ کرنا چاہو اور تعظیم نہ کرنے میں خطرہ کا اندیشہ ہو۔ تو اس کو آتا ہوا دیکھ کر نماز شروع کردو۔ اس طرح تعظیم سے بھی بچے رہوگے۔ اور دوسرے کو اپنی بے تعظیمی کا بھی خیال نہ آئیگا۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ نماز میں انسان دوسری طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ تیسرے اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس طرح خلوت اختیار کروں کہ گوشہ نشین بھی مشہور نہوں۔ کیونکہ اس شہرت کے بعد پھر خلوت نہیں رہ سکتی۔ لوگ تنگ کرتے اور ہجوم کرنے لگتے ہیں تو اسکی سہل صورت یہ ہی کہ ہر وقت نفل نماز پڑھا کرے ہمارے ایک عزیز بزرگ نے جو مشرب سماع رکھتے تھے اسی طرح خلوت اختیار کی تھی کہ بیٹھک ہی میں عام منظر پر رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے تھے۔ جب کوئی ملنے آیا تو سلام کے بعد دو چار باتیں خیر و عافیت کی پوچھ لیتے اور پھر نماز شروع کردیتے تھے۔ مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ کہ نہ وہ بداخلاق مشہور ہوئے۔ کیونکہ جو کوئی بھی آتا تھا اُس سے ضرورت کی قدر مل بھی لیا کرتے تھے۔ اور نہ عزلت گزینی میں خلل آیا۔ اور نہ خلوت نشین مشہور ہوئے جو عوام کا ہجوم ہوتا۔ ایک برکت نماز کی یہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے سلاطین اور روسا کی برابری ہوجاتی ہے ایک انگریز علی گڈھ کالج میں گیا۔ تو وہاں دیکھا کہ رئیسوں کے لڑکے پڑھتے ہیں جن کے ساتھ نوکر اور ملازم بھی ہوتے ہیں۔ مگر خدمت کیوقت تو وہ نوکر دور کھڑے رہتے ہیں۔ آقا کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتے۔ اور نماز کیوقت آقا کے برابر پاس مل کر

کھڑے ہوتے ہیں۔ اُس نے ان رئیس زادوں سے دریافت کیا کہ نماز میں برابر کھڑے ہونے سے یہ ملازم گستاخ نہیں ہوجاتے۔ اُنہوں نے کہا کیا مجال ہی جو نماز کے بعد ہماری ذرا بھی برابری کرسکیں۔ اسوقت کا یہی حق ہی کہ سب برابر ہوں۔ اور دوسرے وقت کا دوسرا حکم ہی۔ اس کو اس سے بڑی حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہی کہ جو نوکر نماز پڑھتا ہی۔ حالانکہ وہ نماز میں آقا کے برابر بھی ہوجاتا ہے۔ مگر پھر بھی اسمیں انقیاد کی صفت بڑھجاتی ہی۔ یعنی وہ آقا کی خدمت اور اُس کے حقوق کی بجاآوری بے نمازی نوکر سے زیادہ کرتا ہی۔ واقعی یہ بات مشاہد ہے کہ دیندار آدمی جیسے خدا تعالیٰ کے حقوق ادا کرتا ہے۔ بندوں کے حقوق بھی خوب ادا کرتا ہے۔ نماز کی ایک برکت یہ ہی کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ اطبا بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اخلاق حمیدہ وافعال حسنہ کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑتا ہی۔ اور افعال بد سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تجربہ کرکے دیکھ لیا جاوے کہ ایک آدمی نمازی ہو اور ایک بے نمازی تو نمازی کی صحت بے نمازی سے ضرور اچھی ہوگی (مگر دونوں یکساں قوی اور قریب قریب بدن کے لینے چاہئیں) بلکہ ایک حدیث سے جو ابن ماجہ میں ہی۔ تو معلوم ہوتا ہی کہ محدثین نے اسکو ضعیف کہا ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ذریعہ سے بعض امراض کا علاج کیا ہی۔ ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ کے پیٹ میں درد تھا۔ وہ آہ آہ کررہے تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اُن کی عیادت کو تشریف لیگئے۔ اور فارسی میں فرمایا۔ اشکمت درد قال نعم قال قم فصل فزال وجع بطنہ۔ کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے۔ کہا ہاں۔ فرمایا کھڑے ہوکر نماز پڑھو۔ چنانچہ نماز پڑھتے ہی درد زائل ہوگیا۔ چونکہ یہ مسئلہ احکام میں سے نہیں۔ اس لئے ضعف حدیث اس میں مضر نہیں۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتا کہ نماز پڑھنے سے ہمیشہ درد زائل ہوجایا کریگا۔ ممکن ہی کسی عارض سے اس نفع کا ظہور نہ ہو۔ مگر یہ تو ضرور ہے کہ نماز سے ایک خاص سرور و نشاط اور قلب کو راحت حاصل ہوتی ہے جس کا اثر صحت پر بھی ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ہمکو اس کی وجہ بتلانے کی ضرورت

نہیں۔ کہ نماز سے راحت وسرور کیوں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر اثر کیلئے کسی علت کا معلوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بعض چیزیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں۔ دیکھئے مقناطیس میں جو جذب حدید کی خاصیت ہے۔ اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے۔ جس کی علت بتلانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ افسوس اتنی بڑی عبادت جس میں فلاح اُخروی بھی ہے اور فلاح دنیوی بھی ہے۔ اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں۔ کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہم کو پکارتا ہے۔ اور ہم جماعت میں نہیں آتے۔ حالانکہ حدیث میں ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ولقد هممت ان آمر بالصلوٰة الی ان قال فاحرق بیوتهم بالنار کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایک شخص کو امام بناؤں پھر چند آدمیوں کو ساتھ لیکر دیکھوں کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اُن کے گھر پھونک دوں۔ اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو پھونکا نہیں مگر چاہا تو تھا۔ اور حضور کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں انی اریٰ ربک یسارع فی ھواک کہ میں خدا تعالیٰ کو دیکھتی ہوں کہ آپ کی خواہش کو بہت جلد پورا کر دیتے ہیں اور بھلا حضور کی یہ شان کیوں نہ ہو۔ جب ادنیٰ ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے۔ کہ ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنین	مید ہد یزداں مراد متقین

تو معلوم ہوا کہ جب حضور نے ایسا چاہا ہے۔ تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے۔ .... اب بتاؤ جس کے گھر کو خدا اور رسول پھونکنا چاہیں وہ کیونکر بچ سکتا ہے۔ تو جو لوگ جماعت میں نہیں آتے اُن کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے۔ شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں جلا۔ وہ تو اچھا خاصا موجود ہے تو اس کے متعلق مولانا رومی کا جواب سن لو فرماتے ہیں ؎

آتشے گر نامدست ایں دود چیست	جاں سیہ گشت و رواں کردود چیست

یہ تھوڑی آگ لگی ہوئی ہے جس کے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا اور چہرہ پر وحشت و ظلمت برس رہی ہے۔ اس ظلمت قلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک

اثر ہوتا ہے جس سے اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ نمازی کے چہرہ پر جو نور ہوتا ہے۔ اس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے۔ اس کا اثر چہرہ کی بد رونقی سے ظاہر ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ آگ ضرور لگی ہے۔ اسی کا یہ دھواں ہے۔ جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے (الاکرمیت صہ ۱۹ تا ۲۲ ملخصًا)

(۱۰۱) آجکل اتحاد و اتفاق باہمی تو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر حدود اتفاق کی رعایت نہیں کرتے

اتحاد مطلوب کے دو درجے ہیں۔ ایک اس کا حدوث دوسرے بقاء میں ان دونوں درجوں کے اسباب بیان کروں گا۔ کہ حدوث اتحاد کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اور اس کے بقاء کا کیا طریقہ ہے اور وہ اسباب ایسے ہیں جو شرعی پہلو سے بھی ظاہر ہیں اور عقلی پہلو سے بھی۔ اور اسباب بقاء کی تحقیق زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ آجکل ہم لوگوں میں اتحاد و اتفاق پیدا تو ہوتا ہے۔ مگر باقی نہیں رہتا۔ میں اس کا سبب شرعی پہلو سے بتلاؤں گا۔ جو عقل کے بھی مطابق ہے۔ گو مجھے عقل کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کیونکہ عقل باندی ہے۔ اور شریعت سلطان ہے۔ پس عقل کی تائید کر شریعت کی بات کو ماننا ایسا ہے۔ جیسے غلام کی جی ہاں جی ہاں کو سُن کر بادشاہ کی بات کو مانا جاوے۔ اور اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے۔ بادشاہ کی بات خود حجت ہے غلام کی تصدیق سے اس کو حجت سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ آجکل عقل پرستی کا غلبہ ہے۔ لوگوں کی سمجھ میں وہی بات آتی ہے۔ جو عقل کے مطابق ہو۔ اس لئے تبرعًا میں عقلی پہلو سے بھی ان اسباب کو بیان کرونگا کہ میرا اصلی مذاق اس کے خلاف ہے۔ پس سُنئے کہ آجکل دیکھا جاتا ہے۔ کہ ہم لوگوں میں اتحاد باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک اتحاد ہی کیا۔ مجھے تو ایسی بدگمانی ہے۔ کہ جب یہ سنتا ہوں۔ کہ مسلمانوں نے کوئی کام شروع کیا ہے۔ تو سب سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ دیکھئے استقلال کے

ساتھ چلے گا بھی یا نہیں کیونکہ میں راتدن دیکھتا ہوں کہ نہ ہمارے کارخانے چلتے ہیں نہ انجمنیں۔ نہ مدرسے نہ اتحاد و اتفاق۔ ہاں ایک چیز ہمیشہ چلتی ہے۔ وہ کیا جوتا اور لٹھ یہ ایک بار جہاں چلا پھر عمر بھر چلتا رہتا ہے چاہے اس کی بنیاد کیسے ہی کمزور ہو مگر شاخیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ جیسے عرب میں جاہلیت کے زمانہ میں ایک گھوڑ دوڑ ہوئی تھی جس میں ایک فریق کا گھوڑا آگے نکل گیا۔ تو اسی بات پر صدیوں تک لڑائی رہی ہماری حالت آجکل اہل جاہلیت کی حالت کے مشابہ ہے۔ کہ جہاں ذراسی بات پر جوتا چلا پھر وہ برسوں تک چلتا رہتا ہے۔ باقی اتحاد و اتفاق اس کی عمر ہمارے ہاں بہت تھوڑی ہے۔ گو بکثرت حدوث اتحاد کی بہت کوشش کرتے رہتے ہیں اور اسپر تقریریں بہت ہی ہوتی ہیں۔ مگر آجتک کسی نے بقار اتحاد کے اسباب بیان نہیں کئے نہ عدم بقار کے اسباب کو مرتفع کیا۔ حالانکہ سب سے پہلے یہ مسئلہ قابل غور تھا۔ اس لئے اس وقت میں اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی کے ضمن میں اسباب صحیحہ حدوث کے بھی مذکور ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس (اگر کبھی ان میں نزاع ہو تو) اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادیا کرو۔ یہاں فاصلحوا بین اخویکم میں اس پر تنبیہ ہے۔ کہ بیچوں کو کسی ایک فریق کی اعانت نہ کرنا چاہئے بلکہ دونوں کو اپنا بھائی سمجھ کر اس طرح صلح کرانا چاہئے۔ جیسے حقیقی دو بھائیوں میں صلح کرائی جاتی ہے۔ کہ ان میں سے کسی کا اضرار بھی گوارا نہیں ہوتا۔ اور صلح کرانے کا طریقہ یہ نہیں۔ جو آجکل رائج ہے۔ کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ دبایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جس کا حق ہوتا ہے اسکو بھی دبایا جاتا ہے۔ بلکہ صلح کرانیکا طریقہ یہ ہے کہ جو حق پر ہو اس کو غلبہ دیا جائے اور جو ناحق پر ہو اس کو دبایا جائے۔ کیونکہ صاحب حق کو دبانا اضرار ہے۔ اور غیر صاحب حق کو دبانا اضرار نہیں اس میں تو اسے اضرار سے روکنا ہے۔ مگر آجکل عجیب دستور ہے۔ کہ صاحب حق و غیر صاحب حق دونوں کو دباتے ہیں۔ سو یہاں اصلاح سے یہ مراد نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے ارشاد ہے وان طائفتان من المومنین

اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احداھما علی الاخری ففاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل و اقسطوا ان اللہ یحب المقسطین ۵ یعنی اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑنے لگیں تو دونوں میں (اول) صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو جو زیادتی اور ظلم کرے تو اس سے سب ملکر قتال کرو۔ یہاں تک کہ وہ حکم آلہی کی طرف واپس آجائے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حکم آلہی کے موافق فیصلہ کیا جاوے۔ اور یقیناً صاحب حق کو دبانا حکم آلہی کے خلاف ہے۔ پس اگر فریقین حکم آلہی کے مطابق فیصلہ پر راضی ہو جائیں تو فبہا۔ ورنہ جو ظلم پر کمر بستہ ہو اور دوسرے کا حق مارنا چاہتا ہو۔ سب کو اس سے لڑنے کا حکم ہے۔ یہ حکم نہیں ہے کہ بس جس طرح ہو صاحب حق کا گلا گھونٹ گھانٹ کر لڑائی موقوف کردو۔ آج کل لوگوں نے اصلاح اسی کو سمجھ رکھا ہے۔ کہ بس لڑائی موقوف ہو جائے۔ چاہے صاحب حق کو ہی دبایا جائے۔ مگر شریعت نے اسکو اصلاح ہی نہیں سمجھا۔ بلکہ شرعاً اصلاح یہ ہے کہ حق بحقدار رسد۔ اور جو دوسرا فریق حق دار کے حق دینے میں پس و پیش کرے۔ تو پھر یہ حکم ہے کہ سب ملکر اس کو دباؤ۔ اور لڑائی کی ضرورت ہو تو اس سے لڑو اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح میں بعض دفعہ سختی کرنا اور قتال کرنا بھی مستحسن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نااتفاقی کی غرض سے اتفاق کرنا تو برا ہے۔ اور اتفاق کی غرض سے نااتفاقی کرنا جائز بلکہ واجب ہے۔ مثلاً چار آدمی اس غرض سے اتفاق کریں کہ پانچویں سے نااتفاقی کریں گے۔ یہ مذموم ہے اور یہیں سے معلوم ہوگیا۔ کہ اگر خدا تعالیٰ سے نااتفاقی کرنے پر اتفاق ہو۔ یعنی معاصی پر اجماع ہو۔ تو وہ کیوں بُرا نہ ہوگا۔ یقیناً یہ اتحاد سب سے بدتر ہے مگر آجکل لوگوں نے اتفاق کا نام یاد کر لیا ہے۔ اور اس کو مطلقاً محمود سمجھتے ہیں۔ حدود کی رعایت نہیں کرتے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ شریعت میں نماز تک کے لئے حدود ہیں۔ کہ طلوع و غروب اور دوپہر کے وقت ہے۔ اور بغیر استقبال قبلہ کے نماز حرام ہے۔ اسی طرح ذکر اللہ کے لئے حدود ہیں کہ ذکر میں نیند آجاوے تو سو رہنا

حکم ہے۔ اسوقت ذکر ممنوع ہے۔ شریعت کا مقصود ان حدود سے یہ ہے۔ کہ بندہ کو غلام ہونا چاہیئے۔ جس وقت جو حکم ہو اُس کا امتثال کرے۔ چاہے عبادت کا حکم ہو۔ یا ترک عبادت کا۔ بس وہ شان ہے ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین　　نیستم درصف طاعت بین بین

قلم کی خوبی یہ ہے کہ جب چلائیں تو چلے اور جب روکیں رُک جائے۔ کیونکہ قلم اگر روکے سے بھی نہ رُکے تو حروف بگڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح عبادات حدود شرعیہ کیخلاف معاصی ہیں۔ اس لیئے حکم ہے کہ نیند کے وقت ذکر موقوف کر کے سو رہو تو اتنی بڑی چیز جس کے غیر مستحسن ہونیکا شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی ایک وقت میں ترک حدود کی وجہ سے مذموم ہو جاتی ہے۔ تو اتحاد کیلیئے حدود کیوں نہ ہونگی۔ اور ان حدود کے خلاف جو اتحاد ہو۔ وہ مذموم کیوں نہ ہوگا۔ پس اتحاد کی بھی ہر فرد مستحسن نہیں۔ اسکو علے الاطلاق محمود کہنا اتحاد کا ہیضہ ہے۔ افسوس آجکل اتحاد کے فضائل تو بہت بیان کیئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے حدود و اصول بیان نہیں کیئے جاتے۔ پس خوب سمجھ لو کہ خدا سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق کرنا مذموم اور نہایت مذموم ہے۔ پس اس سے اس اتحاد کا حکم سمجھ لیا جاوے۔ جس میں اتحاد کیلیئے شریعت کے احکام کو چھوڑا جاتا ہے۔ صاحبو! جیسے اتفاق مستحسن ہے۔ ایسے ہی کبھی نا اتفاقی بھی مستحسن ہے۔ پس جو لوگ خدا تعالیٰ کے احکام چھوڑنے پر اتفاق کریں اُن کے ساتھ نا اتفاقی کرنا اور مقابلہ کرنا محمود ہے۔ دیکھو جیسے عمارت بنانا محمود ہے۔ ایسے ہی بعض عمارت کا گرانا بھی محمود ہے۔ اگر آپ اپنی رعایا سے کوئی مکان خریدیں اور اس میں بجائے کچے کوٹھڑوں کے عمدہ کوٹھی بنانا چاہیں تو پہلی عمارت کو گرائیں گے یا نہیں۔ یقیناً گرائیں گے۔ اب بتلایئے یہ افساد محمود ہے یا مذموم۔ اس کے محمود ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں ہوتا۔ پھر کسی موقعہ پر نا اتفاقی کے محمود ہونے میں کیوں شبہ ہے۔ اس لیئے حق تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ کہ جس طرح بھی ہو صلح کرادو۔ بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ صحیح بنیاد پر صلح کراؤ۔ اور اگر لوگ اس پر راضی نہ ہوں تو سب ملکر غلط بنیاد کو ڈھادو پھر قتال کے بعد اگر طائفہ باغیہ حق کی طرف رجوع ہو جائے تو حکم یہ ہے۔ فان فاءت

فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا۔ یعنی اب پھر اُن کے معاملہ کی انصاف کے ساتھ صلاح کرو۔ یہ نہیں کہ بس لڑائی موقوف ہوتے ہی ان کا مصافحہ کرادو۔ اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں۔ بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں۔ کہ جہاں دو آدمیوں میں نزاع ہو فوراً دونوں کا مصافحہ کرادیا جائے۔ چاہے فریقین کے دلمیں کچھ ہی بھرا ہو۔ میں کبھی ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلے معاملہ کی اصلاح کرو۔ پھر مصافحہ کرو۔ ورنہ بدون اصلاح معاملہ کے زا مصافحہ محض بیکار ہی سا اس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا۔ تو مصافحہ کے بعد پھر مکافحہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی مقاتلہ تو حق تعالیٰ نے فارت کے بعد یہ نہیں فرمایا فکفوا ید یکم کہ زیادتی کرنے والا حق کی طرف رجوع ہو۔ پس تم ہاتھ روک لینے پر اکتفا کرلو۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ جب دوسرا فریق زیادتی چھوڑدے۔ تو اب پھر اصلاح معاملہ کی عدل کے ساتھ کوشش کرو۔ یہ قید یہاں ایسی بڑھائی گئی ہو۔ جس پر ساری عقول قربان ہیں کیونکہ نزاع بدون اسکے ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس نکتہ پر کسی کی عقل نہیں پہنچتی۔ بہرحال اصلاح کے نہ یہ معنی ہیں کہ صاحب حق کو دیا جائے نہ یہ معنی ہیں کہ محض مصافحہ کرادیا جائے۔ بلکہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کیا جائے (یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو آجکل علمائے دیوبند اور جماعۃ رضائیہ میں اتفاق کرانا چاہتے ہیں اور دونوں جماعتوں پر باہمی نا اتفاقی کا الزام دھرتے ہیں۔ کہ اسلام کو ضرر پہنچ رہا ہی سبحان اللہ اسکے تو یہ معنے ہوئے کہ ایک شخص کے گھر پر چور ڈاکہ ڈالیں اور وہ ان پر دعویٰ کردے۔ تو دونوں فریق کو نا اتفاقی کا مجرم قرار دیکر دونوں کو اتفاق پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اس صورت میں ہر عاقل چوروں کو مجبور کرتا ہی۔ کہ وہ مالک کا مال واپس کرکے اس سے اتحاد کریں۔ مالک کو اتحاد پر کوئی مجبور نہیں کرتا۔ نہ اس کو دعویٰ دائر کرنے سے مجرم قرار دیتا ہے۔ اس طرح اس صورت میں علمار دیوبند کو جس جماعت سے اختلاف ہی وہ اس وجہ سے ہی کہ وہ لوگ اس پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اور احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ ان دونوں میں اتفاق کرانیکی صورت یہی ہی کہ اول حق و ناحق کو معلوم کیا جائے۔ پھر جو ناحق پر ہو اسکو دبایا جائے۔ یہ طریقہ نہایت غلط ہی

کہ حق و باطل کے تعیین سے پہلے ہی دونوں فریق کو اتفاق پر مجبور کیا جاتا ہے اور ہر ایک کو دبایا جاتا ہے یہ اتفاق ہر گز قائم نہیں رہ سکتا۔جامع) اسپر فریقین اتفاق کر لیں تو خیر ورنہ اس اتفاق کی طرف لانے کیلئے فریق مبطل سے نا اتفاقی اور قتال کا حکم ہے۔پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ انما المؤمنون اخوۃ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔اس میں حق تعالیٰ نے حکم اخوت کو صفت مومن پر مرتب فرمایا ہے۔اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی صفت پر حکم مرتب ہوتا ہے۔وہاں وہ وصف حکم کی علت ہوتا ہے۔تو معلوم ہوا کہ ہم میں جو اخوت کا تعلق ہے۔اسکی علت ایمان ہے اور وہی اخوت مطلوب ہے۔جس کی بنیاد ایمان پر ہو۔صاحبو! آجکل جو اتحاد و اتفاق کو بقا نہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔کہ اس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی۔بلکہ ہوائے نفسانی یا معاصی پر ہوتی ہے۔اس لئے وہ بہت جلد ہوا ہو جاتا ہے (یعنی فنا) اس لئے اگر اتفاق کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ایمان پر قائم کرو۔مگر آجکل تو ایمان کو ایسی بقدر چیز سمجھ رکھا ہے۔کہ اسکی کچھ وقعت ہی نہیں ہے۔جس کام کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے اُس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ملانوں کا کام ہے۔چنانچہ آجکل زبانوں پر یہ بات بہت کثرت سے ہے کہ یہ وقت نماز روزہ کا نہیں ہے۔اتحاد کا وقت ہے اور جب کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کرتا ہے کہ اتحاد کی وجہ سے احکام شرعیہ کا فوت کرنا جائز نہیں۔تو نہایت بیباکی سے جواب دیا جاتا ہے۔کہ یہ وقت جائز و ناجائز کا نہیں ہے۔کام کا وقت ہے۔اور غضب یہ ہے کہ اس متن پر بعض اہل علم نے یہ حاشیہ بھی چڑھا دیا کہ اتفاق و اتحاد وہ چیز ہے۔کہ اس کے قائم کرنیکے لئے نمازیں قضا کر دی گئیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب میں نمازیں قضا کر دی تھیں سبحان اللہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔اوّل تو یہی بتلایئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم وہاں کس سے اتحاد کر رہے تھے جو اتحاد کی وجہ سے نمازیں قضا ہوئیں۔بلکہ وہاں تو عدم اتحاد اس کا سبب ہوا تھا۔کفار سے مقابلہ اور لڑائی تھی۔نہ کہ اتحاد کی گفتگو اور اگر کوئی شخص اپنے اس اتحاد کو بھی مقابلہ میں داخل کرنا چاہے۔تو پھر وہ ثابت کرے

کہ گیا حضور نے باوجود فرصت کے نمازیں قضا کردی تھیں یا کفار نے آپ کو نماز پڑھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔ احادیث و واقعات میں صاف مذکور ہے کہ وہاں قضا نماز کا سبب یہ تھا کہ کفار نے آپ کو نماز کی مہلت نہیں دی تھی۔ کیونکہ مقابلہ کے وقت مہلت اپنے قبضہ میں نہیں رہتی۔ بلکہ دونوں پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک فریق مہلت لینا چاہے تو دوسرا مقابلہ سے باز نہ آئے تو اس مہلت کا لینا بیکار ہے پھر ایسی حالت میں نماز کیسے پڑھی جائے۔ بہر حال اُسوقت حضور کو قتال درپیش تھا اور ایسی حالت تھی کہ صلوٰۃ الخوف بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ اس لئے آپنے نماز قضا کی مگر آجکل جو اتحادی جلسوں اور ترقی قوموں کے مشوروں میں نمازیں قضا کی جاتی ہیں ان پر کونسا حملہ ہوتا ہے جس سے ان کو نماز کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ افسوس ایاپیں بنانے اور دور دراز کا ریزولیشنوں کے پاس کرنے میں تو نمازیں قضا ہوتی ہیں۔ اور ان کو حضور کے واقعات پر قیاس کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو کچھ تو شرم کرنا چاہیے۔ پس خوب سمجھ لو کہ یہ مسائل اور یہ دلائل سب غلط تھے اور تماشا یہ کیا گیا۔ کہ ان لوگونکو اتحاد کا ایسا ہیضہ ہوا کہ کفار کو بھی بھائی بنایا اور اُن کی رعایت میں احکام شرعیہ کو چھوڑ اگیا۔ اور اسکی یہ مصلحت بیان کی جاتی تھی کہ اس سے اسلام کو کفار کی طرف انجذاب ہوگا۔ اور اگر ان کو بھائی نہ بنایا گیا تو اسلام سے بعید اور اجنبی رہیں گے۔ صاحبو! یہ خیال محض لغو تھا۔ اسلام تو ایسی حسین چیز ہے کہ کسی کی آنکھ میں کجی نہ ہو تو اس کا حسن ضرور اپنی طرف کھینچے گا چاہے تم اس کو بھائی بھی نہ کہو بلکہ دشمن ہی کہو ابوجہل کی آنکھ میں کجی تھی۔ اس لئے اسکو ہدایت نہوئی اور جن کی نگاہ کجی نہ تھی۔ وہ کسی نہ کسی وقت اسلام کی طرف آئے اور پھر آئے حالانکہ عمر بھر اسلام سے عداوت ہی ظاہر کرتے رہے تھے۔ اور مسلمان بھی ہر موقع پر اُن سے مقابلہ کرتے رہے تھے۔ پس اسلام کو اپنی طرف منجذب کرنے کیلئے کسی کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں وہ دشمن کو دشمن کہکر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی پوری رعایت کی ہے۔ وہی حقوق اور وہی رعایت سب کے جذب کیلئے کافی ہے۔ پس ایسا

یہ کبھی نہ کہونگا۔ کہ کفار ہمارے بھائی ہیں۔ ہاں یہ کہونگا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اور وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ اور اسلام میں ہمسایہ کے بھی حقوق ہیں۔ گو وہ کافر ہی ہو۔ اور اگر ان کو بھائی کہا جاوے تو یہ بات چل نہیں سکتی۔ نہ ان کو اس بیجا خوشامد کا یقین آسکتا ہے اور یہ قرآن کے بھی بالکل خلاف ہے۔ پس کفار سے ایسا اتحاد شرعاً جائز نہیں ہے۔ جس میں احکام الٰہیہ کی کچھ بھی مخالفت کی جاوے۔ بھلا اگر ایسا اتحاد محمود ہوتا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ آپ کی عقل کامل پر تمام عالم کا اتفاق ہے لا اِلٰہ اِلا اللہ کی تعلیم کیوں دی ہوتی۔ جس سے تمام عالم میں تہلکہ مچ گیا اور کفار کہنے لگے اجعل الالٰھۃ الٰھا واحدا ان ھذا لشئ عجاب وانطلق الملاء منھم ان امشوا واصبروا علی آلھتکم ط ان ھذا لشئ یراد۔ اس تعلیم سے پہلے سب کفار آپکے ساتھ متحد تھے۔ مگر حضور نے اس اتفاق کی بنیاد کو اُکھاڑ ڈالا کیونکہ کفار کے اس موافقت کی بنیاد کفر پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ ہمارے کفر سے ہمکو نہیں روکا گیا۔ اس لئے خوش تھے۔ اور ظاہر ہے یہ بنیاد نہایت کمزور اور لچر بنیاد تھی۔ آپ نے اس کی نیویں نکالیں۔ پھر نئی بنیاد ڈال کر اسپر عالی شان عمارت لے گئے۔ مگر ہماری حالت اس وقت یہ ہو رہی ہے۔ کہ ترقی و اتحاد بھی کرتے ہیں تو اس طریقہ پر جس پر کفار نے ترقی کی ہے۔ حضور کے طریقہ پر نہ ہماری ترقی ہے نہ اتحاد ہے۔ حالانکہ ہمکو کفار کی چیزوں کی طرف تو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ حق تعالیٰ حضور کو فرماتے ہیں ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم زھرۃ الحیوۃ الدنیا لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیر وابقی (اور اپنی نگاہوں کو اُس چیز کی طرف دراز نہ کیجئے۔ جس کے ساتھ ہمنے کفار کی بعض جماعتوں کو تمتع دیا ہے۔ جس کی زندگی دنیا کی رونق ہے تاکہ اس میں ہم اُن کی آزمایش کریں اور آپکے رب کی عطا بہتر ہے۔ اور پائیدار ہے) اسمیں تو کفار کے طریقۂ ترقی کی طرف نگاہ اُٹھانے کی ممانعت کی گئی۔ آگے اپنی طرف سے ترقی کا طریقہ بتلاتے ہیں وأمر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیھا لانسئلک رزقا نحن نرزقک والعاقبۃ للتقوی ہ (اور اپنی اہل کو نماز کا حکم کیجئے (اور خود بھی اسپر جمے رہیے ہم آپ سے رزق نہیں مانگتے۔ رزق تو ہم خود ہی آپ کو دیں گے۔ اور (اچھا)

انجام تقویٰ ہی کا ہے) اس میں پابندی نماز اور تقویٰ کا حکم ہے۔ اس کو کفار کی ترقی کے مقابلہ میں بیان کرنا اس کی دلیل ہے کہ اسلامی ترقی کا طریقہ یہ ہے۔ لیجئے اللہ میاں نے بھی ملانوں ہی کے مذاق کی رعایت کی ہے۔ اب بتلاؤ کیا اس قرآن کو مٹا دوگے میرا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ دو اور نماز روزہ ہی کے ہو رہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود نہ سمجھو۔ باقی بضرورت دین دنیا میں مشغول ہونیکا مضائقہ نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسی کھانیکی ضرورت سے کنڈے جمع کیئے جاتے ہیں۔ اور جب کوئی پوچھتا ہے کہ یہ کھانا کتنے میں تیار ہوا ہے تو اس کی فہرست میں کنڈے اور لکڑیاں بھی شمار ہوتی ہیں۔ (ماخوذ ص۱۵ تا ۲۳)

(۱۰۲) ترقی متعارف کا رد

ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے۔ اس لئے یہ عنوان ظاہر میں بھی بہت عمدہ ہے۔ اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر قرآن میں اسکو خیرات کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ کہ باہم خیرات میں ترقی کرو۔ اب فیصلہ اس پر ہے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو۔ وہ خیر ہے یا نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال و حکومت کی تعلیم دے رہے ہو۔ اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت نہیں کر سکتے۔ شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے وانہ لحب الخیر لشدید اور کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین الایہ۔ یہاں خیر سے مراد مال ہے۔ لہذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فاستبقوا الخیرات میں خیر مطلق مراد ہے۔ کہ خیر مطلق میں باہم سبقت کرو۔ اور مال خیر مطلق نہیں۔ بلکہ خیر مقید ہے۔ جس کی خیریت کیلئے بہت سی شرطیں ہیں۔ جن کی تم رعایت نہیں کرتے۔ لہذا تم اپنی ترقی مالی کو ترقیٔ خیر نہیں کہہ سکتے۔ اور جس درجہ میں مال خیر ہے۔ اُس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ۔ مگر تم ہی بتلاؤ کہ جیسی ترقی

آجکل (یعنی زمانہ تحریکات میں) ہو رہی تھی۔ کیا وہ خیر تھی۔ کیا اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا۔ کہ مسلمانوں کو پنڈت کا لقب دیا گیا۔ ہندوؤں کو مولانا کہا گیا۔ قشقے لگائے گئے۔ گائے کے گوشت کو ممنوع کہا گیا مسلمانوں سے قربانی کی گائیں چھینی گئیں۔ اور ایک ہندو کی نسبت کہا گیا کہ نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی۔ تو وہ نبی ہوتا (پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں۔ اُن سے قطع تعلق نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کو بدستور لیڈر مانا گیا) وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر کا مصداق تھی۔ تو فرعون سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہیے اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی یہ کہتا کہ یہ کام شریعت کیخلاف ہے تو اس کو یہ جواب دیا جاتا۔ کہ تم تو محض ملانے ہو۔ تمکو سیاسیات کی کچھ خبر نہیں یہ وقت جائز و ناجائز کے سوال کا نہیں۔ اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونا چاہیے افسوس ان لوگوں کو یہ خبر نہیں۔ کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں۔ بلکہ ملاناپن ہی مطلوب ہے۔ اور سلطنت سے مقصود بھی ملاناپن ہی کا پھیلانا ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ مگر لوگ اس کو مٹا رہے تھے۔ تو اس صورۃ میں اس کو ترقی خیر کون کہہ سکتا ہے۔ پس حرص کا عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مگر ان لوگوں نے تو اس عنوان سے اسکے عیب چھپانا چاہا ہے۔ جب اس کا نام ترقی رکھ لیا۔ تو اب وہ اُن کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا۔ پھر وہ اس کا علاج کیا خاک کریں گے (علاج الحرص ص۳۱)

(۱۰۳) توجہ الی اللہ کے معنی

اب سمجھئے کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے۔ بعض نے تو یہ سمجھا ہے۔ کہ توجہ الی اللہ یہ ہی کہ نماز پڑھے روزہ رکھے۔ اور احکام شرعیہ بجالائے۔ ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفا کیا۔ یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے

مگر پھر وہ سوچتے ہیں۔ کہ باوجودیکہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی تقاضائے معصیت مضمحل کیوں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے۔ اور بعض نے کہا کہ توجہ الی اللہ کے معنے صرف یہ ہیں۔ کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے۔ انہوں نے نماز روزہ اور تلاوت قرآن اور نظر بد کا بچانا وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ مگر ان کو بھی برکت اور نورانیت حاصل نہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دل میں گناہوں کا تقاضائے شدید پاتے ہیں۔ تو سنو! کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو۔ مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے۔ جو شریعت نے بتلائی ہے۔ بس دونوں کو جمع کرنا چاہیئے۔ کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو۔ اور ظاہر سے اعمال شرعیہ کے پابند رہو۔ طاعات کو بجالاؤ۔ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو۔ نگاہ کو روکو اور نامحرموں کی باتیں بھی نہ سنو۔ اسکے بعد بھی اگر نورانیت حاصل نہو تو ہم پر ہنسنا۔ اس وقت میں وہی کہتا ہوں۔ جو ایک صاحب طریق نے کہا ہے ؎

چشم بند و لب ببند و گوش بند	گر نہ بینی نور حق بر ما بخند

اس وقت یہ غلطی ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہرہ کے تارک ہیں اور بعض اعمال باطنہ کے تارک ہیں اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی۔ دونوں کو جمع کرنا چاہیئے (علاج الحرص صفحہ ۳۰)

(۱۰۴۳) پردہ کا عقلی ثبوت

آجکل بعض ناعاقبت اندیش پردہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ پردہ کے توڑنے میں قطع نظر خلاف شرع اور گناہ ہونے کے اتنی خرابیاں ہیں۔ کہ آج جو عقلاء پردہ کی مخالفت کرتے اور پردہ اٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں خود ہی یہ تجویز کرینگے۔ کہ پردہ ضرور ہونا چاہیئے۔ مگر اسوقت

بات قابو سے نکل چکی ہوگی۔ اب تو بنی بنائی بات ہے۔ اس کو نہیں بگاڑنا چاہیئے۔ پھر پچھتاؤ گے۔ اور کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ آجکل ایسا مذاق بگڑ گیا ہے۔ کہ کوئی پردہ کو خلاف فطرت کہتا ہے۔ کوئی قید اور حبس بیجا کہتا ہے۔ ایک مسلمان انجنیر تھے۔ اُن سے ایک پادری انجنیر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے اسمیں سب خوبیاں ہیں کہ عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے مسلمان انجنیر نے کہا۔ کہاں؟ ہمنے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا۔ کیا وہی قید جس کا نام ہم نے پردہ رکھا ہے۔ تو ان مسلمان انجنیر صاحب نے پادری سے کہا کہ پہلے آپ یہ بتلائیے کہ قید کس کو کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ قید حبس خلاف طبع کو کہتے ہیں۔ اور جو حبس خلاف طبع نہو اس کو قید ہرگز نہ کہیں گے ورنہ پاخانہ میں جو آدمی پردہ کر کے بیٹھتا ہے۔ اس کو بھی قید کہنا چاہیئے۔ کیونکہ پاخانہ میں آدمی تمام آدمیوں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے۔ سب سے الگ ہو جاتا ہے۔ مگر اسکو کوئی قید نہیں کہتا۔ کہ آج ہم بھی اتنی دیر قید میں رہے۔ ورنہ فرض کرو۔ اگر اس پاخانہ میں کسی کو بلا ضرورت بند کر دیا جاوے کہ باہر سے زنجیر لگا دیں اور ایک پہرہ دار کھڑا کر دیا جاوے اور اس سے کہدیا جاوے کہ خبردار یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پاوے تو اس صورت میں بیشک یہ حبس خلاف طبع ہوگا۔ اور اس کو ضرور قید کہینگے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر حبس بیجا کا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ بتلائیے ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی صورت میں حبس خلاف طبع نہیں۔ اور دوسری میں خلاف طبع ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مطلق حبس کو قید نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ حبس خلاف طبع کو قید کہتے ہیں۔ پس آپ کو پہلے یہ تحقیق کرنیکی ضرورت ہے۔ کہ مسلمان عورتیں جو پردہ میں رہتی ہیں۔ وہ ان کی طبیعت کیموافق ہے یا خلاف اس کے بعد یہ کہنے کا حق تھا۔ کہ پردہ قید ہے یا نہیں۔ میں آپکو مطلع کرتا ہوں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے خلاف طبع نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمان عورت کیلیئے حیا امر طبعی ہے۔ لہذا پردہ حبس موافق طبع ہوا۔ اور اسکو قید کہنا غلط ہے ان کی حیا کا مقتضا یہی ہے کہ پردہ میں مستور رہیں۔ بلکہ اگر ان کو باہر پھرنے پر مجبور

کیا جائے۔ یہ خلاف طبع ہوگا۔ اور اس کو قید کہنا چاہیے۔ (کسار النساء مٹ ۵)

(۱۰۵) کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں رغبت نہیں ہوتی

اعمال میں کوتاہی اور بے رغبتی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اعمال میں اور اُنکے جزاء میں کچھ تعلق اور ارتباط نہیں سمجھتے۔ یوں سمجھتے ہیں کہ ان اعمال پر جو جزائیں ملتی ہیں۔ ان میں اور اعمال میں باہم کوئی علاقہ نہیں۔ ایسا تعلق نہیں سمجھتے۔ جیسے اس دنیا کے اسباب اور مسببات میں علاقہ ہے۔ مثلاً سہارنپور سے ریل میں سوار ہوکر نینی تال چلے تو اس بین میں نینی تال میں یہ علاقہ ہے کہ پہلے بریلی پہنچے۔ پھر بریلی سے چلکر کاٹھ گودام کا اسٹیشن ملتا ہو۔ وہاں کچھ دیر کے بعد اور سواری ملتی ہے۔ بہر حال نینی تال اور ان اسباب میں ایک قوی علاقہ ہے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ کی وجہ سے کشش ہوتی ہے اور یہاں علاقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور سمجھ میں اس لیئے نہیں آتا۔ کہ نظر نہیں آتا۔ اس لیئے دل کی کشش نہیں ہوتی۔ یعنی اُبھرتی نہیں۔ طبیعت جیسی مقصود کیلیے اُبھرنی چاہیے۔ بعنوان دیگر۔ میری مراد یہ ہے۔ کہ اس مقصود کیلیے طبیعت اسی واسطے نہیں اُبھرتی کہ خود اس مقصود کو اپنے اختیار میں نہیں سمجھتے۔ اور اختیار میں اس واسطے نہیں سمجھتے کہ اسباب میں اور مقصود میں یعنی اعمال میں اور جزاؤں میں کچھ علاقہ نہیں سمجھتے۔ ورنہ اگر علاقہ سمجھتے۔ تو چونکہ اسباب اختیاری ہیں۔ اس لیئے اس حیثیت سے مقصود کو بھی اختیاری سمجھتے۔ جب اختیاری نہیں سمجھتے۔ تو طبیعت اُبھرتی بھی نہیں۔ کیونکہ طبیعت اُسی کام میں اُبھرتی ہے۔ جس کو انسان اپنے اختیار میں سمجھتا ہے۔ چنانچہ یہی بات ہو کہ عامی کو کبھی سلطنت کی ہوس بھی نہیں ہوتی۔ اسکو کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں آتا کہ میں بادشاہ ہو جاؤں۔ وہ کبھی اسپر غور ہی نہیں کرتا کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرو۔ بادشاہ بنو۔ محل میں رہو۔ مثلاً ایک رئیس سے سُنا کہ بادشاہ یوں محلوں میں رہا کرتے ہیں۔ یوں اُن کے سازوسامان ہوتے ہیں یوں حشم و خدم ہوتے ہیں۔ خیر ان عجائب امور کو سُنکر چاہیے اُس کا جی خوش ہوتے

لگے۔ لیکن یہ ہرگز نہ ہوگا۔ کہ اس کی طبیعت میں گدگدی اور دھڑ دھڑی پیدا ہو کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرنی چاہیئے۔ لاؤ سلطنت حاصل کرنیکا طریق معلوم کریں۔ یہ بھی سمجھتا ہے۔ کہ اگر کسی سے پوچھوں گا بھی تو وہ ڈانٹ دیگا۔ کہ ابے تو پاگل ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوتیاں کھاویگا۔ سبحان اللہ! رہیں جھونپڑیوں میں خواب دیکھیں محلوں کا۔ غرض بادشاہوں کے قصے سنکر وہ سلطنت حاصل کرنیکے طریق معلوم نہ کرے گا۔ اور اگر معلوم بھی کرلئے تو کیا ہے۔ وہ اتنے بعید ہیں۔ کہ بیچارہ کا طائر وہم بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اب سر پر ٹوکرا رکھنے والا اور گوہ اُٹھانے والا بھی بادشاہوں کے قصے سنتا ہے۔ لیکن کیا کبھی اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آتا ہے کہ لاؤ میں بھی بادشاہ بننے کی کوشش کروں۔ کس سے پوچھوں۔ کہ سلطنت کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ اگر معلوم ہوا کہ لڑنے سے حاصل ہوتی ہے تو کیا مشکل ہے۔ ہم بھی فوج اکٹھی کریں گے۔ ہم بھی لڑیں گے۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیا اس کے بھی ذہن میں کبھی یہ خیالات آتے ہیں۔ کبھی نہیں۔ اس واسطے کہ وہ اسباب ہی اختیار میں نہیں۔ تو پھر کتنا ہی بڑا مقصود کیوں نہ ہو۔ طبیعت اُبھرتی ہی نہیں۔ بخلاف اس کے مینی تال کا حال سنا تو طبیعت میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے فکر ہوتی ہے کہ بس پچاس روپے پاس ہوں تو وہاں پہنچیں اور اگر ہوں بھی پاس بس پھر کیا ہے۔ پھر تو سمجھتا ہے کہ وہاں پہنچنا گویا ہر وقت اپنے اختیار میں ہے اور سوچتا ہے کہ جب اختیار میں ہے۔ تو پھر کیوں نہ حاصل کیا جائے۔ اس مقصود کو چنانچہ نہایت شوق کے ساتھ وہاں پہنچنے کا فوراً اہتمام کرنے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو جس مقصود کے اسباب کو انسان اختیاری نہیں سمجھتا اُس کی طرف حرکت نہیں ہوتی اور دوسرے اگر اسباب کو تو اختیاری سمجھتا ہو۔ لیکن اسباب اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہو تب بھی حرکت نہیں ہوتی۔ اس حالت میں اسباب کی طرف حرکت نہ ہونے کی وجہ اسباب میں اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہونا ہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مقصود کی طرف حرکت نہ ہونے کی کہ

ان اسباب اور مقصود میں چونکہ تعلق معلوم نہیں۔ اس لئے ان اسباب پر اس مقصود کے ترتیب کا معتقد نہیں۔ اور اس معتقد نہ ہونے سے باوجود اسباب کے اختیاری سمجھنے کے بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتا۔ اس واسطے کہ مقصود اگر اختیار میں ہے۔ تو بواسطہ اسباب ہی کے تو اختیار میں ہے۔ تو گو اسباب اختیار میں ہیں لیکن چونکہ اسباب اور مقصود میں تعلق معلوم نہیں۔ اس لئے اسباب کے اختیار کرنے کا خیال طاری نہیں ہوا۔ اس کو جس طرح اسباب کے اختیاری ہونیکا علم ہے اسی طرح اگر یہ بھی معلوم ہوتا۔ کہ اگر اسباب اور مقصود میں یہ تعلق ہے۔ تب طبیعت اُبھرتی۔ اور شوق پیدا ہوتا۔ اب وہ تعلق تو چونکہ ذہن میں حاضر نہیں اس لئے اسباب اختیار کرنے میں جی لگتا نہیں ہے۔ یہ اطمینان نہیں ہے کہ اسباب اختیار کرنے سے مقصود ضرور حاصل ہو ہی جائیگا۔ پھر جب مقصود ہی کو اختیاری نہیں سمجھتا تو اس کے اسباب اختیار کرنے کی طرف بھی حرکت نہیں ہوتی۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی بطور مثال کے تو اب یہ سمجھئے۔ کہ نعمائے آخرت اور جنت کیطرف جو طبیعت نہیں اُبھرتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ کہ اعمال میں اور مقصود میں جو واقعی علاقہ ہے۔ وہ نہیں سمجھتے۔ یعنی ایسا علاقہ جیسا آگ جلانے اور کھانا پکنے میں۔ ایسا علاقہ جیسے پانی پینے اور پیاس کے بجھنے میں۔ ایسا علاقہ جیسے ہمسر خاندان میں پیام دینے اور عورت کے گھر آجانے میں۔ غرض ایسا علاقہ نہیں سمجھتے۔ اعمال صالحہ میں اور جنت کے حاصل ہونے میں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص قریب قریب یہ سمجھتا ہے۔ کہ جنت میں داخل ہونا اختیاری نہیں۔ ہر گز ہر گز ذہن اس طرف نہیں جاتا۔ کہ اعمال صالحہ پر جنت ضرور ہی مل جاوے گی۔ ایسا سمجھتے ہیں جنت کو کہ اعمال صالحہ پر بس محض اتفاقاً ہی مرتب ہو جاتی ہے جیسے کسی کو اتفاق سے سلطنت مل جائے۔ مثلاً کہیں اتفاقاً ہما سر پر بیٹھ گیا۔ اس لئے بادشاہت مل گئی۔ چنانچہ پرانے زمانہ کے ایسے ہی افسانے ہیں۔ کہ کسی جگہ کا بادشاہ مرگیا اُس کے کوئی اولاد تھی نہیں۔ اس لئے اس میں اختلاف ہوا۔ کہ کس کو بادشاہ

بنایا جائے۔ اس کے متعلق پہلے یہ دستور تھا۔ کہ ہما اُڑاتے تھے۔ وہ جس کے سر پر بیٹھ جاتا اُس کو بادشاہ بنا دیتے۔ اگر کوئی فقیر بھی اُس وقت ہوتا۔ اور اُس کے سر پر ہما بیٹھ جاتا۔ اُسی کو بادشاہ بنا دیتے۔ چنانچہ ہما اُڑایا گیا۔ جانور کو کیا عقل اتفاق سے ایک فقیر ہی کے سر پر جا بیٹھا۔ پس اسی کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اب اگر کوئی فقیر بھی حوصلہ کرنے لگے اور وہاں پہنچنے کا اہتمام کرے کہ شاید ہما میرے ہی سر پر بیٹھ جائے۔ اور میں بادشاہ ہو جاؤں۔ تو سب اسکو احمق بنائیں گے۔ کہ یہ کیا لغو حرکت ہی۔ یعنی محض ایک موہوم اُمید پر کہ شاید ہما میرے ہی سر پر آبیٹھے۔ اتنا لمبا سفر کرنا اور جو نہ بیٹھا پھر اتنا لمبا سفر بھی کیا۔ اور وہاں سفر کے بھی بوم ہوئے۔ یعنی ہما تو کیا سر پر بیٹھتا۔ سب اُلّو بناتے۔ کہ بڑا گدھا ہی فلانا فقیر اُس پر قہقہہ لگاویں گے۔ کہ بالکل اُلّو ہی ہے۔ بھلا تیرا ہی تو منتظر ہے ہما کہ کب وہ آوے اور کب میں اُسکے سر پر بیٹھوں اُلّو کہیں کا۔

ارے کسی کا الو سیدھا کرنے کیلئے ہما کیوں ٹیڑھا ہونے لگا۔ کیونکہ یہی ٹیڑھا ہونا ہے اُس کا کہ نااہل کے سر پر بیٹھے۔ پھر جب یہ حال ہے۔ تو بھلا اس پر کوئی کیا سفر کرے۔ تو جیسے ہما کا سر پر بیٹھنا غیر اختیاری سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جنت کا حاصل ہونا بھی لوگ غیر اختیاری سمجھتے ہیں۔ واقعی ٹٹول کر دیکھ لیجیے۔ اپنے وجدان کو اکثر کا یہی عقیدہ ہے۔ کہ جنت کا حاصل کرنا کسی کے اختیار ہی میں نہیں۔ حضرت میں کہتا ہوں۔ اگر جنت اختیار میں نہیں۔ تو حق تعالیٰ یہ کیوں ارشاد فرماتے ہیں سارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ۔ دوڑو مغفرت اور جنت کی طرف۔ تو کیا اللہ میاں اندھی کوٹھڑی میں دوڑا کر سر پھوڑ والتے ہیں۔ پھر حکم بھی دوڑ کر چلنے کا فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ سڑک بالکل صاف ہے۔ جو شخص اعمال صالحہ کریگا۔ بشرطیکہ ایمان بھی ہو۔ واللہ العظیم ثم واللہ العظیم ثم واللہ العظیم وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ تو تعجب ہی کہ یہ شخص گویا تکذیب کرتا ہے نصوص کی۔ اور یہ خرابی کی ہے۔ جاہل واعظوں نے اُنہوں نے بس یہ حدیث بیان کردی۔ کہ ایک شخص تھ

جس نے ساری عمر عبادت میں گذاری اور جنت کے کام کئے۔ لیکن اخیر میں دوزخی ہوگیا۔ حالانکہ اس جاہل واعظ نے حدیث کو سمجھا ہی نہیں۔ حدیث میں جو یہ آیا ہے اس کا سبب بھی کسی عمل اختیاری ہی کا صدور ہے۔ (آثار المربع ص ۹)

(۱۰۶) عالم مثال اور عذاب و ثواب قبر کا اثبات

اوّل عالم مثال کا اثبات کرتا ہوں۔ سو سمجھ لیجئے کہ یہ ثابت ہے۔ اشارات نصوص سے۔ اور اشارات تو میں نے احتیاطاً کہدیا ہے۔ ورنہ وہ اشارات بمنزلہ صداقت کے ہیں۔ تو گویا بالتصریح یہ ثابت ہے کہ علاوہ شہادت یعنی دنیا کے اور عالم غیب یعنی آخرت کے۔ ان دونوں کے درمیان میں ایک اور بھی عالم ہے۔ جس کو عالم مثال کہتے ہیں جو من وجہ مشابہ ہے عالم شہادت کے اور من وجہ مشابہ ہے۔ عالم غیب کے یعنی وہ برزخ ہے درمیان دنیا اور آخرت کے۔ اور اس عالم کے ماننے سے ہزاروں اشکال قرآن وحدیث کے حل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے۔ اور یہ کام کی بات ہے حدیث میں وارد ہے کہ قبر میں اس طرح سے عذاب ہوگا۔ یا ثواب ہوگا۔ مثلاً عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ زمین مل جائیگی اور صاحب قبر کو دبائیگی۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا فصل لاش اور قبر کی دیواروں میں مردہ کو رکھتے وقت ہوتا ہے۔ وہی باقی رہتا ہے۔ لاش دبتی دباتی کچھ بھی نہیں۔ ویسی کی ویسی رکھی رہتی ہے۔ تو یہ صورت عذاب قبر کی جو حدیث میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے متعلق تو ہی نہیں کیونکہ مشاہدہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ اشکال اس وجہ سے اور بھی قوی ہوگیا کہ لوگوں نے اس کو دنیا ہی کے متعلق سمجھ لیا۔ حالانکہ اگر دنیا کے متعلق ہوتا۔ تو اس کے آثار کا نظر آنا بھی ضروری تھا۔ اور اگر آخرت کے متعلق سمجھا جاوے تو اول تو آخرت میں وہ زمین نہیں جو لفظ زمین سے متبادر ہے۔ دوسرے یہ کہ آخرت میں اگر وہ پہنچ جاوے۔ تو پھر وہاں وہی ٹھکانے ہیں۔ جنت یا دوزخ اور داخل ہونیکے بعد جنت سے تو کسی کا نکلنا ممکن نہیں۔ اور دوزخ سے بھی سب کا نکلنا ممکن نہیں اور حشر ہوگا جنت و دوزخ سے

باہر تو معلوم ہوا۔ کہ ابھی جنت یا دوزخ میں گیا ہی نہیں۔ پھر حدیث کے کیا معنے تو اوّل
نظر میں تو کسی کو یہی شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ جو ملاحدہ اور اہلِ سائنس کہتے ہیں وہی
ٹھیک ہے۔ چنانچہ ملاحدہ اور بعض اہلِ سائنس جو ایمان لائے اُن کا بھی مذہب
یہی رہا۔ کہ یہ سب مثالیں ہیں اور تشبیہیں ہیں اور مطلب ان مثالوں کے دینے سے
یہ ہے کہ ایسی حالت ہوتی ہے۔ یعنی مشابہ ان حالتوں کے ہوتی ہے۔ واقع میں یہ حالتیں
پیش نہیں آتیں۔ تو اپنے نزدیک گویا یہ بہت بڑی دوڑ دوڑے۔ حاصل اس تقریر کا
یہ ہوا۔ کہ وہ لوگ محض روحانی عذاب و ثواب کے قائل ہو گئے۔ اور جسمانی کے منکر
ہو گئے۔ اسی طرح حدیث شریف میں جو ہے۔ القبر روضة من ریاض الجنة
او حفرة من حفرات النار۔ یعنی قبر یا تو جنت کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ یا دوزخ
کا گڑھا۔ تو وہ لوگ اس پر کہتے ہیں۔ کہ ہم دیکھتے ہیں قبر میں کہ یہاں نہ پھول ہیں جنت
کے نہ آگ ہے دوزخ کی۔ پھر اپنے ظاہری معنوں پر قبر دوزخ کا گڑھا یا جنت کا ٹکڑا کیونکر
ہو سکتی ہے۔ غرض یہاں قبر کی جنت و دوزخ میں تو یہ اشکال ہے۔ رہی آخرت سو
وہاں کی دوزخ و جنت ہیں وہ اشکال ہے جو میں نے پہلے عرض کیا بہر حال یہ اشکال
حل نہیں ہو سکتا۔ جب تک تیسرے عالم کے قائل نہوں یعنی عالم برزخ کے جس کو عالم
مثال بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ مشابہ اس عالم کے بھی ہے یعنی باعتبار آخرت کے تو
گویا وہ دنیا ہے۔ اور باعتبار دنیا کے گویا کہ وہ آخرت ہے۔ تو وہ ایسا عالم ہے جیسا کہ
باغ کا پھاٹک کہ بہ نسبت اندرونی حصہ باغ کے تو گویا وہ باغ نہیں ہے۔ لیکن بہ نسبت
خارج حصہ باغ کے گویا کہ وہ باغ ہے۔ یا جیسے حوالات کہ بہ نسبت گھر کے تو وہ جیلخانہ
ہے۔ مگر بہ نسبت جیل خانہ کے پھر گھر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عالم مثال کو دنیا کا بھی نمونہ
بنایا ہے۔ تو جس وقت انسان مرتا ہے پہلے اس عالم مثال ہی میں جاتا ہے۔ وہاں
ایک آسمان بھی ہے مشابہ دنیا کے آسمان کے اور ایک زمین بھی ہے مشابہ دنیا کی زمین
کے۔ اور ایک جسم بھی ہے مشابہ اس جسم کے لیکن وہ بھی ہے جسم ہی۔ تو مرنے کے بعد
تو روح کیلئے ایک جسم مثالی ہو گا۔ اور آخرت میں جو جسم ہو گا۔ وہ یہی ہو گا۔ جو دنیا

میں ہے۔ غرض یہ ایمان ہی ہمارا کہ حشر روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی۔ یعنی یہی
جسم جو ہم اب لئے بیٹھے ہیں۔ اور جو گل سڑ کر خاک ہو جائیگا۔ اسی کو حق تعالیٰ
اپنی قدرت کاملہ سے پھر تازہ بنا کر محشور فرمائیں گے۔ لیکن وہاں اس جسم کی خاصیت
بدلجائے گی۔ یعنی ابتو یہ خاصیت ہی۔ کہ جو ہم کھاتے پیتے ہیں۔ اس کا پیشاب پاخانہ
بنتا ہی۔ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن مر کر فنا ہو جاتا ہی۔ وہاں گویا
ابدی اور خالد ہو جائیگا۔ غرض ایک تو جسم یہاں ہی اور ایک جسم ہی عالم مثال میں اور
وہ مشابہ ہے اُس جسم کے یہ جسم بعینہٖ نہیں تو عالم مثال میں بدن بھی مثالی ہے۔ وہاں بھی
دوزخ بھی مثالی ہے۔ بس اس عالم مثال ہی کا نام قبر ہے۔ اب سب اشکال رفع ہو گئے
کیا معنی کہ قبر سے مراد یہ محسوس گڑھا نہیں ہی۔ کیونکہ کسی کو بھیڑیا کھا گیا۔ یا کوئی سمندر
میں غرق ہو گیا۔ تو اس صورت میں چونکہ وہ زمین میں دفن نہیں ہوا اس لئے اس کو چاہیے
کہ قبر کا عذاب ہی نہ ہو۔ لیکن اب اشکال ہی نہ رہا۔ کیونکہ وہ جو عالم مثال ہی۔ وہیں اسکو
عذاب قبر بھی ہو جائیگا۔ اشکال تو جب ہوتا جب قبر سے مراد یہ گڑھا ہوتا جس میں لاش
دفن کی جاتی ہی۔ حالانکہ اصطلاح شریعت میں قبر گڑھے کو کہتے ہی نہیں۔ بلکہ عالم
مثال کو کہتے ہیں قبر۔ اور وہاں پہنچنا کسی حال میں منتفی نہیں۔ خواہ مردہ دفن ہو یا نہو
اور اس عالم مثال کے نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہ بھی کہتے ہیں عوام کہ قبر ذرا بڑی رکھنی
چاہیئے تاکہ مردہ کو بیٹھنے میں تکلیف نہو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اسی
قبر کے اندر مردہ کو بٹھایا جاتا ہوگا۔ تو بس پھر گیا ہے۔ اگر اپنے دشمن کو ستانا ہو۔ تو اسکی قبر
ذرا تنگ بنا دی جاوے۔ تاکہ مر کر بھی اُسے چین نصیب نہو۔ کیونکہ بعض لوگ اپنے
دشمن کیلئے تمنا کرتے ہیں کہ مر کر بھی مصیبت سے نہ بچے تو اچھا ہے۔ حضرت یہ جو وسیع
قبر شریعت نے تجویز کی ہے۔ یہ اس بنا پر تھوڑا ہی ہے۔ کہ اس کے اندر مردہ کو بٹھایا
جائیگا۔ جیسے آپ اس وقت بیٹھے ہیں۔ بلکہ یہ تو محض اکرام اور عزت ہی مومن کی
کہ اس کو مر کر بھی بیکار نہ سمجھا گیا۔ مرنیکے بعد بھی اس کے مرتبے کا لحاظ کیا۔ اور ہر
طرح اس کا اکرام کیا۔ یہ نہیں کہ وبال سمجھا ٹال دیا۔ بلکہ یہ حکم ہوا کہ اس کی اسوقت بھی

خاطر و تواضع کرو۔ قبر ایسی بناؤ کہ اگر وہ زندہ ہوتا۔ تو ویسی ہی جگہ اس کیلئے تجویز کرتے
کپڑا ایسا پہناؤ۔ جیسا کہ وہ زندگی میں پہنتا۔ یعنی ویسا ہی لباس ہو۔ ویسی ہی صفائی
ہو۔ خوشبوئیں بھی لگاؤ۔ نہلاؤ دھلاؤ بھی۔ غرض بنا سنوار کر عزت کے ساتھ
اسکو رخصت کرو۔ اور واقعی جیسا مسلمانوں میں مردہ کا اکرام ہوتا ہے۔ کسی قوم میں
نہیں ہوتا۔ اور عیسائیوں میں بھی گو بہت اکرام ہوتا ہے۔ لیکن ان میں غلو بہت
زیادہ ہے۔ یہانتک کہ پیٹی بھی کستے ہیں۔ بوٹ بھی پٹی بھی۔ غرض پوری وردی
پہناتے ہیں۔ گویا وہاں جاکر بھی صاحب بہادر پہرہ ہی دینگے۔ غرض عیسائیوں
کے یہاں تو اکرام میں غلو ہے۔ اور ہندوؤں کے یہاں بالکل اکرام نہیں۔ بلکہ اور
الٹی بے حرمتی کرتے ہیں۔ یہانتک کہ بیچارہ کا سر بھی پھوڑتے ہیں۔ خیر وہ بیچارہ تو
نہیں ہے۔ ہے تو واقعی سر پھوڑے جانے کا مستحق بہر حال اسلام میں اعتدال ہے
تو وہ عالم۔ عالم مثال ہے۔ جہاں مرنے کے بعد انسان اول پہنچتا ہے اور وہ کچھ مشابہ
اس عالم کے ہے۔ اور کچھ مشابہ عالم آخرت کے ہے۔ وہیں اس کو فرشتے بٹھلاتے ہیں۔
وہیں اس سے سوالات کرتے ہیں۔ وہیں کی زمین اس کو دباتی ہے۔ وہیں اس کو عذاب
و ثواب ہوتا ہے۔ وہ عالم یہی ہے جس کو حدیثوں میں قبر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے
اور لو میں تمہیں کچھ اس کا پتہ بھی بتائے دیتا ہوں۔ جس سے یہی اسکی کچھ حقیقت سمجھ
میں آجائے۔ وہ عالم کچھ کچھ خواب میں منکشف ہوتا ہے۔ لیکن ایک تو خواب ہوتا ہے
سچا۔ اور ایک ہوتا ہے محض خیال۔ تو جو خواب سچا ہوتا ہے اس میں کچھ کچھ انکشاف
اس عالم کا ہوتا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ خواب میں تو حقیقت اس عالم کی مغلوب
ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں آمیزش خیال کی بھی ہوتی ہے۔ اور وہاں بالکل حقیقت
ہی حقیقت ہوگی۔ ہاں وہ حقیقت اصلیہ بھی عالم آخرت کی حقیقت اصلیہ کے اعتبار
سے تو بمنزلہ خواب ہی کے ہے۔ بلکہ خواب میں جو حقیقت عالم مثال منکشف ہوتی ہے
وہ بمقابلہ عالم مثال کی حقیقت اصلیہ کے اتنی ضعیف نہیں ہوتی ہے جتنی عالم مثال
کی حقیقت اصلیہ بمقابلہ عالم آخرت کی حقیقت اصلیہ کے ضعیف ہے وہ اس سے بھی

ضعیف تر ہے تو خواب ہیں اگر کوئی یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹا۔ تو اب وہ خواب ہی میں بھاگتا بھی ہے۔ چلتا بھی ہے۔ چیختا بھی ہے۔ چلاتا بھی ہے۔ اب کوئی اس سے کہے کہ ارے تو تو برابر بستر پر پڑا رہا ہے۔ نہ تجھے کسی سانپ نے کاٹا۔ نہ تو بھاگا۔ نہ چلایا۔ کیوں خواہ مخواہ جھوٹ بولتا ہے۔ تو کہہ سکتا ہے۔ مگر چونکہ یہ امر خواب میں ہر شخص کو واقع ہوتا ہے اور عالم مثال منکشف ہوتا ہے۔ اس لیے اسکی کوئی تکذیب نہیں کرتا۔ اور شارع علیہ السلام اسکی خبر دیں تو وہاں تکذیب کرتا ہے۔ حیرت ہے۔ تو عالم مثال میں ہر چیز کا نمونہ موجود ہے۔ یعنی جتنی چیزیں ہیں موجودات حقیقیہ وہ سب وہاں موجود ہیں۔ ایسی مثال ہے جیسے آئینہ کہ اس میں بھی اپنی شبیہ نظر آتی ہے۔ لیکن جس طرح آئینہ میں بھی ہمیشہ شکل بالکل مشابہ نظر نہیں آتی۔ یعنی آپنے دیکھا ہوگا۔ کہ کسی آئینہ میں تو بڑا لمبا چہرہ نظر آتا ہے کسی میں بہت چوڑا اور ایسا برا۔ کہ خود ہی تھپڑ مارنے کو جی چاہے۔ اسی طرح سیاہ آئینہ میں سیاہ صورت نظر آتی ہے۔ حالانکہ آپ نے چہرہ پر کالک نہیں لگا رکھی۔ اور سرخ آئینہ میں سُرخ صورت نظر آتی ہے۔ حالانکہ آپنے چہرہ پر کوئی سُرخ چیز نہیں مل رکھی۔ تو جس طرح یہاں جو چیزیں آئینہ میں نظر آتی ہیں۔ وہ من کل الوجوہ مشابہت نہیں رکھتیں۔ اصل کے ساتھ بلکہ جو آئینہ سچا ہوتا ہے۔ وہ بالکل سچا نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ کم از کم اتنا فرق تو ضرور ہوگا کہ آپ تو مثلاً بیٹھے ہیں مغرب میں۔ لیکن آئینہ میں آپ نظر آوینگے مشرق میں۔ تو دیکھئے کہاں رہی مشابہت من کل الوجوہ۔ غرض یہ جو آئینہ میں عکس نظر آتا ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے اصل صورت کی۔ یعنی اسکو ایک گونہ مناسبت ہے۔ اصل صورت کے ساتھ تو جیسے آئینہ میں سب چیزیں نظر آتی ہیں۔ گو وہ حقیقتاً مشابہ نہیں ہوتیں۔ مگر صورۃً من وجہ مشابہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح عالم مثال ہے۔ اور اس عالم میں جو صورتیں مشابہ ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو مماثلت ہوتی ہے۔ اور بعض میں مناسبت۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ وہ مناسبت بعض اوقات جلی ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات خفی۔ مثلاً ہمنے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اور بعد میں سُن بھی لیا کہ واقعی

اس شخص کے لڑکا پیدا ہوگیا۔ تو یہاں تو باہم مناسبت قوی ہی اور جلی ہی جسکو مماثلت کہنا چاہیے۔ اور کبھی یہ مناسبت قوی نہیں ہوتی۔ بلکہ ضعیف اور خفی ہوتی ہے۔ جیسے میں نے دیوبند میں خواب دیکھا کہ منشی سراج الحق ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ لیکن وہ دو ہیں۔ یعنی سرہانے بھی وہی بیٹھے ہیں اور پائینتی بھی وہی بیٹھے ہیں۔ غرض یہ دیکھا کہ دو سراج الحق ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے یہ خواب بیان کیا۔ تو مولانا نے فی البدیہ فرمایا۔ کہ انشاء اللہ اُن کے لڑکا پیدا ہوگا کیونکہ اولاد جو ہے۔ وہ باپ کا وجود ثانی ہے۔ چنانچہ اُن کے گھر میں اُمید تھی لڑکا ہی پیدا ہوا۔ یہ مناسبت خفی تھی۔ یعنی بیٹے کو باپ کی شکل میں دیکھا۔ یہ مماثلت تو نہیں کہی جاسکتی۔ ہاں مناسبت ہی۔ اب جس کو اس عالم مثال کی وجوہ مناسبت کا زیادہ علم ہوتا ہے وہی معبر ہوتا ہے۔ اور جس کو جتنا زیادہ اس مناسبت کا علم ہوگا اتنا ہی وہ اعلے درجہ کا معبر ہوگا۔ کیونکہ تعبیر خواب کا حاصل یہ ہی۔ کہ معبر صورت مرئیہ سے صورت مثالیہ کی طرف عبور کرتا ہے۔ تو یہ معبر صورت مناسبہ کو سمجھ لیتا ہی۔ کہ یہ کس حقیقت کی صورت ہی۔ اور کوئی بزرگی کی بات نہیں۔ بلکہ محض فراست ہی۔ چنانچہ بعض کفار بھی نہایت صحیح تعبیر دیتے ہیں۔ یہانتک کہ ابو جہل بھی بڑا معبر تھا۔ تو اب کیا اس کو بھی بزرگ کہیں گے (آثار المربع ص ۳۱ تا ۳۴)

(۱۰۷) اس اعتراض کا جواب کہ عالم آخرت محض خیالی ہی ہے

یہ لوگ عالم مثال کے ایسے قائل ہوئے کہ سرے سے آخرت ہی کو اُڑا دیا۔ یعنی آخرت کی حقیقت ہی یہ بیان کی کہ آخرت بھی تمثلات ہیں۔ وہاں مادیات نہیں یعنی جیسے دنیا عالم مادی ہی۔ عالم آخرت اُن کے نزدیک ایسا نہیں ہی۔ بلکہ وہ غیر مادی ہے۔ حالانکہ اہل حق کے نزدیک آخرت بھی عالم مادی ہے اور وہ غلط کار لوگ کہتے ہیں کہ آخرت عالم مادی نہیں۔ بلکہ محض تخیل ہوگا۔ لیکن ایسا قوی تخیل ہوگا کہ یوں معلوم ہوگا جیسے مادیات ہوں۔ بس ایسا عالم ہوگا جیسے خواب میں ہوتا ہی۔ کہ

سانپ کے کاٹنے کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔ انسان ڈرتا بھی ہے بھاگتا بھی ہے چیختا بھی ہے چلاتا بھی
ہے۔ لیکن واقع میں نہ کوئی سانپ ہوتا ہے نہ وہ کاٹتا ہے نہ کچھ ہوتا ہے وہ عذاب قبر کے بھی اسی طور پر قائل
ہیں کہ مثلاً یہ جو آیا ہے کہ سانپ اور بچھو کاٹینگے انہوں نے کہا ہے کہ اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ سچ مچ سانپ
اور بچھو کاٹیں گے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسی سانپ بچھوؤں کے کاٹنے
کی تکلیف ہوتی ہے۔ ایسی ہی تکلیف روح کو ہوگی۔ اس تکلیف کو تعبیر کردیا۔ جناب
رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان سے۔ کہ سانپ بچھو کاٹیں گے۔ غرض
وہ لوگ اس لئے قائل ہو گئے۔ کہ آخرت میں عذاب اور ثواب اس طور پر ہوگا کہ
جیسے بعض اوقات انسان پر خیال کا غلبہ ہوتا ہے وہاں بھی اعمال کی صورتیں ایسے
طور پر نمایاں ہونگی کہ وہ شخص یوں سمجھیگا۔ کہ میں باغوں میں پھر رہا ہوں۔ حوروں
میں مشغول ہوں۔ اور واقع میں نہ باغ ہوں گے نہ حوریں ہونگی۔ مگر تصرف متخیلہ کا ایسا
ہوگا۔ جیسے یہاں آدمی بیٹھ کر وہم کو اپنے اوپر غالب کر لیتا ہے (اثار المزلع ص۴۴)

اگر کوئی آخرت کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے۔ جیسے بعض فلاسفہ کا عقیدہ ہے تو
یہ سراسر گمراہی ہے اور بالکل غلط عقیدہ۔ سو بعض کا تو یہ عقیدہ ہے۔ جو مذکور ہوا۔ کہ
عالم آخرت میں اعمال ہی بشکل درخت وغیرہ متخیل ہونگے۔ اور ان میں واقعیت کچھ
نہ ہوگی۔ باقی جو نصوص کو مانتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ تو نہیں۔ لیکن ان میں بعض مبتدعین
جیسے معتزلہ۔ جنت و نعمائے جنت کو فی الحال موجود نہیں مانتے۔ ان کو سرسری نظر
سے کچھ تائید مل گئی اس حدیث سے کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے۔ اور اس کے درخت
سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہیں۔ اس حدیث سے
انہیں دھوکا ہوا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ کسی شیخ سے پڑھنا چاہئے۔ وہ یوں سمجھے
کہ جنت بھی خالی ہے اور دوزخ بھی خالی ہے۔ ہم جیسے جیسے عمل کریں گے۔ یہ عمل ہی
اس شکل سے ظہور کریں گے۔ سو خوب سمجھ لیجئے یہ بھی غلطی ہے۔ واقع میں یہ سب چیزیں
پہلے سے موجود ہیں۔ مگر باوجود موجود ہونیکے ہیں تو نہیں اعمال کے ثمرات۔ کیونکہ خدا
تعالی کو تو معلوم ہے کہ کون شخص کیا کیا عمل کریگا۔ اسی کے مناسب جزا سزا کی صورت

پہلے سے بنا کر اُس کے وجود واقعی کی خبر دینے کیلئے یہ فرمادیا اعدت للکافرین
اعدت للمنفقین۔ جیسے میزبان کو پہلے سے معلوم ہو۔ کہ میرے مہمان کا مزاج
علیل ہے اور وہ پہلے سے اسکے مزاج کے مناسب کھانا تیار کرکے رکھ دیوے۔ تو وہ
کھانا رکھا گیا۔ مزاج ہی کی مناسبت سے۔ یعنی سوداء یا صفراء یا بلغم کے لحاظ سے پلاؤ
یا اور کوئی چیز اُسکے لئے تیار کی گئی۔ ہاں یہ اور بات ہی کہ کسی میزبان کو خبر ہی نہ ہو۔
کہ میرے مہمان کا مزاج کیسا ہی۔ وہ کیا پرہیزی کھانا کھاتا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ جو
میزبان ہیں انہیں تو اچھی طرح معلوم ہی کہ میرے مہمانوں کے مزاج کی کیا کیا کیفیت ہی
انہیں تو پہلے ہی سے مفصل علم ہے۔ کہ میرا فلاں فلاں بندہ فلاں فلاں عمل کرے گا
بس ان اعمال کے مناسب ہی جزاؤں کو مہیا فرما رکھا ہے۔ پس قیعان کے معنی یہ
نہیں ہیں کہ واقع میں وہ قیعان ہے۔ کیونکہ جنت کا معہ نعمائے حسنہ بالفعل موجود
ہونا تو منصوص ہی۔ بلکہ مطلب یہ ہی کہ درجۂ حصول فی الحال میں قبل صدور اعمال بمنزلہ
قیعان کے ہی اور درجہ ذات میں قیعان نہیں ہی۔ حاصل یہ ہی کہ فی نفسہ قیعان نہیں۔ بلکہ
جنتیوں کے حق میں قیعان ہے۔ جیسے ایک شخص نے دسہزار روپے اپنے خادموں کے
لئے خزانہ میں جمع کر دیئے۔ اور فی کام دس بیس پچاس روپے علی قدر مراتب نامزد کر دیئے
پھر وہ شخص سب کو خطاب کرکے یوں کہتا ہے کہ اتنا روپیہ خزانہ میں رکھا گیا ہی۔ اگر تم
خدمتیں کروگے تو خزانہ میں سب کچھ ہی۔ ورنہ یوں سمجھو کہ بالکل خالی ہے۔ اسکے معنی
یہ ہیں کہ قبل خدمتیں کرنے کے تمہارے حق میں گویا خزانہ خالی ہی۔ جب خدمتیں کرنا
شروع کردوگے۔ تو اب سمجھو کہ وہ پر ہوگا۔ واقع میں تو وہ اب بھی پُر ہے۔ لیکن تمہارے
حق میں وہ جبھی پُر سمجھا جاویگا جب تم خدمتیں کردوگے۔ تو معنی یہ ہیں کہ حدیث کے۔ کہ
اعمال کے ثمرات تو پہلے سے مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن ابھی وہ کسی کی ملک نہیں
بنائے گئے۔ جیسے جیسے بندے عمل کرتے جاتے ہیں۔ وہ ثمرات اُن کے نامزد ہوتے
جاتے ہیں۔ اب اس تقریر پر سب اشکالات رفع ہوگئے تو عالم مثال میں بھی حق تعالیٰ
نے انہیں اعمال کو پہلے سے متمثل فرمایا ہے۔ اور جنت و دوزخ میں بھی انہیں اعمال کی

شکلیں پہلے سے پیدا فرما دی ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو تو معلوم تھا کہ میرے بندے کیا کیا اعمال کریں گے۔ انہیں اعمال کی صورتوں کو جنت و دوزخ بنا دیا دالیفنا ھٰذہ تاہم

(۱۰۸) حقیقت پُل صراط

حقیقت پل صراط امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے) یہ لکھی ہے۔ کہ شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے۔ اور اعمال فروع ہیں اخلاق کی۔ تو اصل محل اعتدال کا اخلاق ہیں۔ اُن کا بیان یہ ہے کہ اخلاق کے اُصول تین ہیں۔ یعنی اصل ہیں تین قوتیں ہیں۔ جو جڑ ہیں تمام اخلاق کی یعنی جن قوی سے اخلاق پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تین ہیں۔ قوت عقلیہ۔ قوت شہویہ۔ قوت غضبیہ۔ حاصل یہ کہ اپنے منافع کے حصول اور مضار کے رفع کیلئے خواہ وہ دنیویہ ہوں۔ یا اخرویہ دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ قوت کہ جس سے منفعت و مضرت کو سمجھے۔ کہ یہ مضرت یا منفعت ہے۔ وہ قوت مدرکہ قوت عقلیہ ہے۔ اور ایک یہ کہ منفعت کو سمجھ کر اس کو حاصل کرے یہ قوت شہویہ کا کام ہے۔ اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو دفع کرے۔ یہ قوت دافعہ قوت غضبیہ ہے۔ پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں۔ پھر ان اعمال کے تین درجے ہیں۔ افراط و تفریط و اعتدال۔ چنانچہ قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ وحی کو بھی نہ مانے جیسے یونانیوں نے کیا۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل و سفہ تک اُتر آئے۔ اسی طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے۔ کہ حرام و حلال کی بھی خبر نہ رہے۔ بیوی۔ اجنبی سب برابر ہو جائیں۔ اور ایک درجہ ہے تفریط یعنی ایسے پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے۔ یا مال کے ایسے حریص ہوئے کہ اپنا پرایا سب ہضم کرنے لگے۔ یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں۔ اسی طرح قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑیا ہی بن جاویں۔ اور تفریط یہ کہ ایسے نرم ہوئے کہ کوئی جوتے سے بھی مارے۔ دین کو بُرا بھلا بھی کہہ لے تب بھی غصہ نہ آوے۔ یہ تو افراط و تفریط تھا۔ ایک ان تینوں قوتوں کا اعتدال یعنی جہاں شریعت

سے اجازت دی ہو۔ وہاں تو ان قوتوں کو استعمال کرے۔ اور جہاں اجازت نہ دی ہو۔ وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے۔ یہ اعتدال ہے تو ہر قوت میں تین درجے ہوئے افراط۔ تفریط۔ اعتدال۔ ان سب درجوں کے الگ الگ نام ہیں۔ جو قوت عقلیہ کا افراط درجہ ہے اُس کا نام ہے جزبزہ۔ اور جو تفریط کا درجہ ہے۔ اُسکو سفاہت کہتی ہیں۔ جو اعتدال کا درجہ ہے اُس کا لقب حکمت ہی۔ اسی طرح قوت شہویہ کا افراط کا درجہ فجور ہے۔ تفریط کا درجہ خمود ہے۔ اعتدال کا درجہ عفت ہی۔ اور قوت غضبیہ کا بڑھا ہوا درجہ تہور ہے۔ گھٹا ہوا درجہ جبن ہے۔ اعتدال کا درجہ شجاعت ہے تو یہ نو چیزیں ہوئیں۔ جو تمام اخلاق حسنہ و سیئہ کو حاوی ہیں۔ اور مطلوب ان دو درجوں میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں یعنی حکمت۔ عفت۔ شجاعت باقی سب رذائل ہیں۔ تو اُصول اخلاق حسنہ کے یہ تین ہوئے۔ اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہی۔ اس لئے اس امت کا لقب ہی امت وسط۔ یعنی امت عادلہ غرض انسان وہ ہے۔ جس میں اعتدال ہو۔ اب آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں۔ انسان بہت کم ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہی ؎

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند	این جملہ شدی و لیکن انسان نشدی

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ اعتدال حقیقی سب میں زیادہ مشکل ہی کیونکہ اعتدال حقیقی کہتے ہیں وسط حقیقی کو کہ اس میں ذرہ برابر نہ افراط ہو نہ تفریط ہو اور مشاہدہ سے اس کا دشوار ہونا ظاہر ہے۔ اور پل صراط اسی اعتدال کی صورت مثالیہ ہے اور اسکی دشواری تلوار کی تیزی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور اس کا اعتدال حقیقی بال سے زیادہ باریک ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ جب اعتدال وسط حقیقی ہوگا اور وسط حقیقی غیر منقسم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اگر منقسم ہو۔ تو پھر خود اس میں طرفین اور وسط نکلیں گے۔ تو وہ وسط حقیقی نہ رہا۔ بہرحال وسط حقیقی کا غیر منقسم ہونا لازم ہے۔ اور بال منقسم ہے۔ تو وہ بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ بس اس طریق شریعت کا وسط حقیقی ہونا اس شکل سے ظاہر ہوگا۔ کہ وہ پلصراط

بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ اس تشبیہ میں کوئی امر خلاف اصول عقلیہ لازم نہیں آیا۔ اور اس درجہ کے وسط ہونے سے اس کا مشکل ہونا بھی لازم آیا۔ کہ نہ اِدھر جاؤ نہ اُدھر جاؤ۔ بیچوں بیچ میں رہو۔ بس یہ حقیقت پل صراط کی وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے۔ جس کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا ثابت کر دیا گیا۔ تو شریعت پر چلنے والے اب بھی پل صراط پر چل رہے ہیں جب یہ ہی۔ تو جو یہاں پل صراط پر یعنی شریعت پر چل چکا ہے۔ وہ وہاں بھی بآسانی چل سکیگا۔ کیونکہ وہ یہی تو ہے۔ اب بتلایئے پل صراط پر چلنا کیا دشوار ہوا۔ جو یہاں شریعت پر چل رہا ہے۔ اُسے وہاں چلنا بھی آسان ہو جائیگا۔ سو پل صراط پر چلنے کا طریقہ بہت ہی آسان ہے۔ اور وہ سنت کا طریقہ ہی۔ یہی سنت بیچ کا رستہ ہی۔ اسی کو فرماتے ہیں شیخ سعدیؒ ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا		تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ	
دریں راہ جز مرد راعی نرفت		گم آں شد کہ دنبال راعی نرفت	

(آثار المربع صـ ۵۹)

(۱۰۹) عقل کے معنی اور تشریح

عقل کے معنی لغت میں روکنے والا ہیں۔ اسی سے عقال رسی کو کہتے ہیں۔ کہ وہ جانور کو بھاگنے سے روکتی ہے۔ تو عقل کا حاصل یہ ہوا۔ کہ وہ ایک ایسی قوت مدرکہ ہے۔ جو مضرت سے روکتی ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ مضرت کیا چیز ہے۔ اور منفعت کیا چیز ہے۔ سو اصل میں مضرت کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اور منفعت کی بھی کیونکہ ہر منفعت میں کچھ نہ کچھ مضرت بھی ہے۔ اور ہر مضرت میں کچھ نہ کچھ منفعت بھی ہے۔ اب عقل کا یہ کام ہی کہ وہ یہ بتا دیتی ہی۔ کہ کہاں منفعت کا پہلو غالب ہی۔ اور کہاں مضرت کا۔ مثلاً ایک شخص ہی کو بہت شدت کی پیاس لگی ہوئی ہے۔ حلق خشک ہوا جاتا ہی۔ دم نکلا جاتا ہے۔ ایسے وقت اس کے پاس صرف

دودھ ہے۔ مگر ایسا دودھ ہے۔ جس میں سے کچھ سانپ بھی پی گیا ہے۔ جس کی وجہ سے زہریلا ہو گیا ہے۔ اب بعض دوست تو یہ کہتے ہیں کہ میاں دودھ پی بھی لو۔ تمہارا حلق تو تر ہو جائیگا۔ اور پیاس تو بجھ جائیگی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اُسے ہرگز نہ پینا۔ کیونکہ اس میں زہر ہے۔ اُس وقت تو حلق تر ہو جائیگا۔ مگر پھر حیات ہی منقطع ہو جائیگی۔ اُس وقت عقل یہ فیصلہ کریگی کہ گو دودھ پی لینے میں قدرے منفعت بھی ہے۔ مگر یہ منفعت معتد بہا نہیں۔ اس لئے نہیں پینا چاہیئے۔ الغرض منفعت قابل اعتبار وہ ہے۔ جو ضرر پر غالب ہو۔ اسی طرح ضرر قابل اعتبار وہ ہے جو نفع پر غالب ہو۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ اسکے ساتھ اور ملائیے کہ دنیا کی منفعت سے آخرت کی منفعت بڑھی ہوئی ہے۔ اور دنیا کی مضرت سے آخرت کی مضرت بڑھی ہوئی ہے۔ دنیا کی منفعت و مضرت آخرت کی منفعت و مضرت کے آگے کوئی چیز نہیں۔ ان دونوں مقدموں کے ملانے کے بعد عقل یہی فتویٰ دیگی کہ جس کام میں دنیا کی منفعت ہو۔ مگر آخرت کی مضرت ہو۔ ایسی منفعت کو چھوڑ کر آخرت کی مضرت سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اسی طرح کسی کام میں دنیا کی مضرت ہو۔ اور آخرت کی منفعت ہو۔ تو عقل یہ کہے گی۔ کہ اس چھوٹی سی مضرت کو بڑی منفعت کیلئے گوارا کرنا چاہیئے۔ بس یہ ہے اصلی عقل۔ مگر آجکل لوگوں نے دنیا کمانے کا نام عقل رکھ لیا ہے۔ اگر اسی کا نام عقل ہے تو فرعون سب سے بڑا عاقل ہوگا۔ مگر اس کا جاہل اور احمق ہونا تمام مسلمانوں کو مسلم ہے۔ (الامتحان ص۳)

خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ آج بتاریخ ۲۔ ربیع الاوّل ۱۳۵۳ھ بمقام موضع گنج متصل لاہور میں مواعظ کے انتخاب کا سلسلہ متعلقہ جوابات شبہات و اعتراضات اختتام کو پہنچا۔ وللّٰہ الحمد۔

ارواح ثلثہ اگر آپ بزرگوں کا سا صدق و صفا۔ اخلاق و عادات پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بزرگوں کے حالات و حکایات دیکھئے رسالہ ہذا میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور آپکے زمانہ سے لیکر ابتک کے (۶۰) بزرگوں کی حکایات موجود ہیں تقریباً ۲۵۰ صفحہ کی کتاب ہی جس میں بزرگوں کے حالات و ملفوظات اور مسائل شرعیہ مختلف تحقیقات مناظرانہ مفید اور محققانہ مضامین ہیں۔ اصلی قیمت (عہ) رعایتی (عہ)

فیصلہ خصومات از محکمہ دار القضاۃ } تقویۃ الایمان۔ تحذیر الناس۔ حفظ الایمان براہین قاطعہ پر اعتراضات کے جوابات اور علمائے ہندوستان کا اُن عبارات کیمتعلق مفصل بیان، مولوی حشمت صاحب بریلوی کا سفر رنگون اور وہاں فتنہ، مقدمہ اور فیصلہ حاکم کی روئداد وغیرہ کو نہایت مفصل بیان کیا گیا ہی۔ اصلی قیمت ۴ر رعایتی (۲ر)

تعلیم الدین۔ رسالہ ہذا میں عقائد، اعمال، عبادات، معاملات، تہذیب اخلاق، اور سلوک کیمتعلق کافی ذخیرہ مع دلائل قرآن و حدیث موجود ہے۔ اپنے مقبول عام ہونیکی وجہ سے کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے اور بڑے بڑے مدارس کے نصاب میں داخل ہے لیکن موجودہ نسخوں کے حوالجات بالکل مسخ ہو گئے تھے اسمرتبہ تصحیح کا خاص اہتمام اور احادیث کو مع حوالہ ابواب و صفحات کتب لکھا گیا ہے رعایتی قیمت ۶ر نیل المراد فی السفر الی گنج مراد آباد۔ اگر آپکو بزرگوں کے حالات کا شوق ہے تو اس مختصر رسالہ کو ضرور خریدئے حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی چند حکایات مولانا تھانوی مدظلہم کے دو مرتبہ گنج مراد آباد کے سفر کے حالات مفصل درج ہیں اور اسمیں رسالۃ الصدق المتین بھی شامل ہے جسمیں محمد شبیر صاحب میرٹھی کے اعتراضات کے جوابات ہیں ...... رعایتی قیمت ۱ر

آداب التبلیغ۔ یہ وعظ ارتداد کے زمانہ میں مدرسہ عالیہ دار العلوم دیوبند میں ہوا تھا۔ نہایت مفید اور اہم مضامین پر مشتمل ہی تبلیغ کے آداب اور اہمیت و ضرورت کو نہایت واضح بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۳ر

ملنے کا پتہ: ظہور الحسن غفر لہ مالک کتبخانہ امداد الغرباء سہارنپور

طلا استعمال کرنیکا موسم آگیا
ضمیمہ رسالہ ہذا

انمول رتن

ہوتا اثر ضرور دوا اور دعا میں ہے۔ لیکن شفا مریض کی دست خدا میں ہے

حب سبز۔ آجکل بچے خلقۃً اسقدر کمزور ہوتی ہیں کہ جہاں تھوڑا سو یا سردی کہائی فوراً دست آنی لگتے ہیں پیچش ہو جاتی ہے نزلہ زکام اسقدر ہوتا ہی کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہی بخار ہو جاتا ہے یہ گولیاں بلغم کو سینہ سی بہت جلد اکہاڑ کر نکالدیتی ہیں بخار فوراً اُتر جاتا ہی قیمت ایک درجن۔ (۳/)

حب زحیر۔ یہ گولیاں بچوں اور بڑوں کی پیچش کو خواہ کسی وجہ سے ہو روکدیتی ہیں اور ایک ہی گولی اپنا فوری اثر دکہلاتی ہے قیمت ایک درجن۔ (۴/)

حب قابض۔ یہ گولیاں بچوں اور بڑوں کے دستوں کو روکتی ہیں خواہ کسی وجہ سے ہوں ان ہر سہ ادویہ کا ہر گھر میں موسم میں موجود رہنا ضروری ہے قیمت ایک درجن۔ (۵/)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرفعلی صاحب دام ظلہم تحریر فرماتی ہیں کہ مشتہر صاحب کے خاندان سے میرا پرانا تعلق ہی ان کے والد صاحب مرحوم کی حیات تک اُنسے اور اُن کی بعد خود اِن سے اکثر اوقات اپنے اور اپنے اہل وعیال کی شکایات کیوقت رجوع کرتا رہا ہوں اور بفضلہ تعالیٰ اکثر نفع ہوا ہے جس سے مجھکو صاحبان موصوفین کی مناسبت فن وتجربہ وتوجہ وشفقت کا کافی اعتقاد ہے یہ ایک کلی واقعہ ہے۔ جزئی طور پر ادویہ مندرجہ اشتہار ہذا میں سے تین چیزوں کا بارہا تجربہ میں آنا اور نافع ہونا میرے گھر والوں نے مجھسے بیان کیا ہے۔ ۱ حب سبز نافع ڈبہ اطفال ۲ حب زحیر نافع پیچش ۳ حب قابض نافع اسہال ان مجموعی حالات سے ظن غالب یہ ہے کہ بقیہ ادویہ بھی انشاءاللہ تعالیٰ نافع ہوں گی والغیب عند اللہ۔ اشرفعلی ۲۳ ج ۲ ۱۳۵۲ھ

طلائے سعید۔ مقوی اعصاب ہی کجی ولاغری کو دور کرتا ہے آبلہ پیدا نہیں کرتا پسینہ کے ذریعہ فضول کو نکالتا ہے ضعف باہ پیرانہ سالی سے ہو یا جوانی کی بداعتدالی سے دور کرتا ہے قیمت فی شیشی تین ماشہ عصا چاشنی ۴عہ/

تصدیق۔ احقر نے مشہور دوائیں بہت استعمال کیں مگر کچھ نفع نہیں ہوا لیکن اس اشتہار کی دوائیں استعمال کرنیسے بہت نفع ہوا بالخصوص طلا سعید نے عجیب اثر کہایا ڈھیلاپن اور ضعف کو دور کرکے خلقی قوت پیدا کرتا ہے اسکی تعریف تحریر سے باہر ہے۔ راقم شفیع محمد۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر عربی ڈی جی سندھ کالج کراچی۔

بقراطی۔ مقوی باہ و دافع نزلہ دائمی نیز سفید داغ جو بدنکو بدنما کر دیتے ہیں یعنی برص کو بہت جلد زائل کرتا ہے مقوی اعضائے رئیسہ ہے بدن کو فربہ کرتا خون صالح پیدا کرتا ہے جسم کے جوڑوں کی درد کو مفید ہے طلا کیساتھ اس کا استعمال خاص نفع دکھلاتا ہی خوراک تین ماشہ ہونیکی وجہ سے معجون کی شکل میں منتقل کردی گئی قیمت بیس خوراک ۴عہ/

اکسیر جریان۔ جریان بھی اسقدر عام ہوا ہے کہ ہر شخص اسمیں مبتلا ہی جب قوت بالکل جاتی رہتی اور نسل منقطع ہو جاتی ہے تب فکر ہوتی ہے ہمارا اکسیر جریان بارہ یوم استعمال کرنیسے کلی فائدہ ہوتا ہے نیز سیلان الرحم کو بھی فائدہ کرتا ہے اگرچہ فساد معدہ کیوجہ سے ہو۔ قیمت بارہ خوراک۔ .... (۱۲/)

حب آتشک۔ اس مرض کی تکلیف کو وہی جانتا ہے جو اسمیں مبتلا ہو ہماری گولیوں سے اس مرض کلا بہت

قلع قمع ہو جاتا ہے جدید یا قدیم قیمت ۲۴ عدد .... (عـہ)

سیلانی۔ آجکل بچوں اور بڑوں کو کان بہنے کی اکثر شکایت رہتی ہے جسکی وجہ سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور کان سے بو آنے لگتی ہے اور کان میں ورم اور درد بھی ہو جاتا ہے اس کے استعمال سے دو تین یوم میں کلی آرام ہو جاتا ہے اور نیز ڈاکٹروں اور جراحوں کیلئے بہت بہترین چیز ہے ختنہ پر چھڑک کر پٹی باندھنے سے فوراً خون بند ہو جاتا ہے اور ختنہ بہت جلد اچھی ہو جاتی ہیں اور اگر کسی عضو کے کٹنے سے خون بہنے لگے اسپر چھڑکنے سے فوراً خون بند ہو جاتا ہے فی تولہ عـہ

انجن۔ گرمی کے موسم میں اکثر اور سردی میں بہت کم آنکھیں دکھتی ہیں اور روہے ہو جاتے ہیں یعنی پپوٹے کے اندر کیجانب باریک پھنسیاں ہو جاتی ہیں پپوٹوں پر ورم آجاتا ہے ہر وقت پانی جاری رہتا ہے کوئی دوا نفع نہیں کرتی ہماری دوا دو تین دفعہ لگانے سے آرام کر دیتی ہے قیمت ایک تولہ .... (للعہ)

قرص داد۔ داد خواہ کتنا ہی پرانا ہو تر ہو یا خشک تین چار یوم میں صاف کر دیتا ہے اور بالکل نہیں لگتا قیمت ایک تولہ (۸)

سرمہ نور افزا۔ آنکھیں خداوند تعالیٰ کی بڑی نعمت ہیں انکی حفاظت بڑی ضروری ہے یہ سرمہ بینائی کو قوت دیتا ہے دافع نزول الماء و دھند و خارش چشم اور آنکھوں سے پانی بہنے کو مفید قیمت ایک تولہ ... (عصار)

معجون روشن دماغ۔ یہ معجون دماغ کا تنقیہ کرتا ہے اور نافع نزلہ دائمی و زکام و مالیخولیا مراقی و دماغی و دافع قبض دائمی و امراض بلغمی مقوی دماغ و معدہ ہے قیمت ایک پاؤ .... (عـہ)

نمک سلیمانی۔ یہ جسقدر مشتہر ہے شاید ہی اور کوئی دوا مشتہر ہو ہمارا نمک سلیمانی تمام فوائد پر مشتمل ہے جو نمک سلیمانی میں ہونے چاہئیں مزید براں ہمارا نمک سلیمانی مقوی باہ ہے موسم سرما میں اگر بیضہ نیم برشت کیساتھ استعمال کیا جائے ایک سیر کے خریدار کیلئے محصول ڈاک معاف قیمت ایک سیر ...... (للعہ)

کمیشن بذریعہ خط و کتابت متعین کیا جائے۔

نوٹ۔ جو حضرات دوا طلب فرمائیں اپنا نام و پتہ صاف تحریر فرمائیں علاوہ اشتہار کی دواؤں کے ہمارے دواخانہ میں اور مجرب دوائیں بھی تیار رہتی ہیں اور کشتے خاص قاعدے سے پھونکے جاتے ہیں جو بذریعہ خط معلوم ہو سکتے ہیں۔ ایک روپیہ سے کم کی فرمائش تعمیل نہیں کیجائیگی۔

المشتہر

(خادم الاطباء) حکیم سعید احمد ابن حکیم محمد ہاشم صاحب مرحوم

پتہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر دواخانہ سعیدیہ (یوپی)

چند تبلیغی کتابیں

تصفیۃ العقائد ۔ سرسید احمد خاں صاحب اور
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب کا
مجموعہ۔ جس میں عقائد کے متعلق مفصل کلام ہے۔ اصلی ۳ ر رعایتی ۲ ر

آداب التبلیغ ۔ یہ وعظ ارتداد کے زمانہ میں مدرسہ
عالیہ دار العلوم دیوبند میں ہوا تھا۔ نہایت مفید اور اہم
مضامین پر مشتمل ہے۔ تبلیغ کے آداب اور اہمیت و ضرورت
کو نہایت واضح بیان کیا گیا ہے۔ اصلی قیمت ۳ ر رعایتی ۲ ر

محاسن الاسلام ۔ اسلام کی خوبیاں اور مخالفین
اسلام کے اعتراضات و شبہات کا جواب بتانے والا۔
اچھوت اقوام کی تبلیغ کا طریقہ سکھانے والا مسلمانوں کو
فتنۂ ارتداد سے بچانے والا نہایت ہی مفید وعظ ہے۔
قیمت اصلی ۷ ر رعایتی ۳ ر

حقوق البیت ۔ زن و شوہر کے باہمی حقوق پر
نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ بحث کرکے دودھ اور
پانی جدا کر دیا گیا ہے۔ عورتوں کے لئے حسن معاشرت کے
طریقے شرعی زندگی اور خانہ داری کے سلیقے۔ زنانہ سکولوں
کے مفاسد نہایت عمدہ عنوان سے بیان کئے گئے ہیں۔
اصلی قیمت ۳ ر رعایتی ۲ ر

طریق القلندر ۔ شریعت اور طریقت کا فرق۔
اور شعر مشہور ۵ صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی۔ کی مفصل
شرح اپنے موضوع خاص میں نہایت یکتا وعظ ہے رعایتی قیمت ۲ ر

تعلیم الدین ۔ کتاب کا موضوع یہ ہے کہ عام طور
پر تصحیح عقائد پابندی اعمال و عبادات
کو دین سمجھا جاتا ہے۔ معاملات و معاشرت اخلاق و عادات
میں اپنے کو مطلق العنان اور خود مختار سمجھا جاتا ہے اور ان
امور میں دوسری قوموں کی تقلید اور وضع کو برا نہیں
سمجھا جاتا۔ حالانکہ انسان کی ہر رفتار و گفتار معاملہ
و معاشرت اور تہذیب اخلاق کے لئے شریعت میں ایسا
مکمل قانون موجود ہے کہ دوسری اقوام کے منصف مزاج
لوگوں کو اسلام سے ان امور کے اقتباس کا اعتراف ہے،
رسالہ ہذا میں عقائد، اعمال، عبادات، معاملات، تہذیب
اخلاق اور سلوک کے متعلق کافی ذخیرہ مع دلائل قرآن
و حدیث موجود ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے کئی مرتبہ
شائع ہو چکا ہے اور بڑے بڑے مدارس کے نصاب میں
داخل ہے۔ لیکن موجودہ نسخوں کے حوالہ جات بالکل مسخ
ہو گئے تھے۔ اسمرتبہ تصحیح کا خاص اہتمام اور احادیث کو
بقید ابواب و صفحات کتب لکھا گیا ہے۔ اصلی قیمت ۸ ر رعایتی ۶ ر

طریقہ مولد شریف ۔ مولد شریف کی شرعی حیثیت مولد مروجہ
کی ممانعت کا سبب اور آخر میں ایک مکتوب کا جواب ہے اصلی ا ر رعایتی ۶

ملنے کا پتہ

ناظم کتب خانہ امداد الغرباء مظاہر علوم سہارنپور

مُناجاتِ مقبُول

مع اضافات جدیدہ

کتاب کی مقبولیت محتاج تعارف نہیں۔ لیکن عدم اہتمام صحت کی شکایت بہت ہی عام تھی اس مرتبہ کی اشاعت میں اس شکایت کے ازالہ کے لئے چند مستند علماء کو نظر ثانی کی تکلیف دی گئی چنانچہ بعض وہ غلطیاں بھی نکلیں جو ابتداءِ اشاعت سے چلی آتی تھیں اور زبر زیر وغیرہ کی غلطیاں تو بہت ہی عام تھیں۔ اس مرتبہ بحمدہ تعالیٰ نہایت صحت کے ساتھ زیر طبع ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رمضان المبارک میں تیار ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ حسنِ کتابت وطباعت اور زیبائش کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا گیا ہے اور مندرجہ ذیل مفید وضروری مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ (۱) قنوت نازلہ مع ترکیب۔ (۲) اسماء حُسنیٰ (۳) اسماء بدریین وغیرہ۔ اور بعض خاص خاص التزامات بھی کئے گئے ہیں۔ عمدہ کاغذ حنائی اصلی قیمت عہ رعایتی ۱۰ ار۔ سبز کاغذ اصلی ۱۲ ار رعایتی ۸ ر۔ کاغذ نمبر سوم اصلی ۸ ر رعایتی ۶ ر۔

کتب خانہ امداد الغربا سہارنپور

کا مقصد

حضرات اکابر علماء دیوبند خصوصاً حضرت حکیم الامت مرشدی جناب مولانا مولوی قاری شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت فیوضہم کی بالخصوص تبلیغی نایاب اور غیر مطبوعہ تصانیف کو بعینہ یا مناسب اضافات وترتیب اور تسہیل وصحت کے ساتھ شائع کرنا اور ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت پر فروخت کرنا ہے تاکہ ان کا نفع عوام وخواص امیر وغریب سب کے لئے عام ہو سکے۔ ایک مرتبہ کتابیں منگانے کے بعد کتبخانہ کی فیاضی کا امتحان ہو جائے گا۔

المشتہر

ظہور الحسن مالک کتب خانہ امداد الغربا، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور